سیرت

مولانا سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ

بانی ندوۃ العلماء

مولانا سید محمد الحسنیؒ

مجلس صحافت ونشریات
ندوۃ العلماء، لکھنؤ

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

بار چہارم

مئی ۲۰۱۶ء-شعبان المعظم ۱۴۳۷ھ

نام کتاب	:	سیرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ
نام مصنف	:	مولانا سید محمد الحسنیؒ
صفحات	:	۳۴۰
تعداد اشاعت	:	۱۱۰۰
طباعت	:	کاکوری آفسیٹ پریس
قیمت	:	-/220 روپئے

مجلس صحافت ونشریات

ندوۃ العلماء، لکھنؤ

فہرست عناوین

سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ

عناوین	صفحہ
مقدمہ......از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ	۱۹
باب اوّل خاندان، ابتدائی حالات، درس وتدریس، علمی وتحقیقی ذوق	۲۷
سلسلۂ نسب	۳۰
ابتدائی حالات، تعلیم اور اساتذہ	۳۱
اہل حق کی تلاش، اور زیارت مدینہ کا شوق	۳۳
مدرسہ فیض عام کا پہلا طالب علم	۳۴
ذوق علم اور ذہانت	۳۶
سلامت فکر اور طلب حق	۳۶
فلسفہ سے نفرت اور حدیث سے رغبت	۳۷

اہل حق کی تلاش	۳۸
مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کی خدمت میں	۳۹
گنج مرادآباد کی پہلی حاضری اور بیعت	۴۲
حدیث کی تکمیل	۴۳
غنائے قلب	۴۵
اجازت وخلافت	۴۵
تدریسی خدمات	۴۵
انجمن تہذیب کا قیام	۴۷
علمی ذوق اور جذبہ تحقیق	۴۸
فقہ پر گہری نظر	۴۹
مولانا کا کتب خانہ	۵۰
باب دوم ردِ عیسائیت	۵۲
ہندوستان میں تبلیغ عیسائیت کا آغاز	۵۲
عیسائیوں کا طریقۂ کار	۵۴
منشی صفدر علی اور عماد الدین	۵۷
ردِ عیسائیت کے سلسلہ میں مولانا کی جدوجہد کا آغاز	۵۸
منشور محمدیؐ	۶۰
کانپور میں یتیم خانہ کا قیام	۶۱

قرآن مجید پر عیسائیوں کے ایک اعتراض کا جواب	۶۲
مولاناؒ کی تصنیفات ردعیسائیت میں	۶۶
عیسائی تاریخ کا مطالعہ	۶۶
آئینۂ اسلام	۶۷
مولانا کا طرز تصنیف	۶۸
ترانۂ حجازی اور دفع التلبیسات	۶۹
پیغام محمدیؐ	۷۰
باب سوم تحریک ندوۃ العلماء اور اس کا پس منظر	۷۵
مولانا کا عہد	۷۵
قدیم عربی مدارس	۷۵
سرسید کا مکتبِ فکر	۷۸
سید امیر علی اور مولوی چراغ علی	۷۹
روحانی مراکز اور خانقاہیں	۸۱
نظام درس اور مدارس کا عمومی جائزہ	۸۴
فتنۂ تکفیر اور نزاعِ باہمی	۸۷
مقلدین اور غیر مقلدین کی کشمکش	۹۱
فوجداری اور مقدمہ بازیاں	۹۷
قدیم وجدید کا مسئلہ	۹۹

ایک نئی اور جامع شخصیت کی ضرورت	۱۰۰
مولانا کی شخصیت کے تین اہم عوامل	۱۰۱
پہلا سبب	۱۰۲
دوسرا سبب	۱۰۳
تیسرا سبب	۱۰۴
باب چہارم ندوۃ العلماء کا قیام، اور مولانا کا دور نظامت و ترقی	۱۰۷
پہلا بنیادی جلسہ	۱۰۷
ندوۃ العلماء کے تعارف کے لئے پہلا وفد	۱۰۹
غرض اول	۱۱۰
غرض دوم	۱۱۰
علماء کی طرف سے استقبال	۱۱۱۲
مولانا شبلیؒ سے ملاقات اور ندوہ کا تعارف	۱۱۱
حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی تائید	۱۱۱
ندوۃ العلماء کا مقصد مولانا کے قلم سے	۱۱۲
ندوۃ العلماء کا پہلا عام اجلاس	۱۱۴
پہلی نشست	۱۱۶
دوسری نشست	۱۱۷
مولانا حالی کی مرسلہ تقریر	۱۱۹

مولانا محمد علیؒ کی فکری و عملی رہنمائی	۱۱۹
ندوہ کے تعارف کے لئے جدوجہد	۱۲۰
ندوہ کا اجلاس لکھنؤ میں	۱۲۲
دارالافتاء کے قیام پر مولانا کی تجویز	۱۲۴
ندوۃ العلماء کا پہلا ثمرہ	۱۲۶
جدید طبقہ کی طرف سے ندوہ کی پہلی حمایت	۱۲۷
انجمن حمایت اسلام لاہور میں ندوہ کی تائید	۱۲۷
مصر و شام میں تحریک ندوۃ العلماء کا تعارف	۱۲۷
ناقدین ندوہ کو مولاناؒ کا جواب	۱۲۸
دارالافتاء کی ضرورت پر مولاناؒ کی تقریر	۱۲۹
فقہ و اجتہاد اور وسیع النظری کی ضرورت	۱۲۹
دارالعلوم کی تجویز مولاناؒ کا ذہنی خاکہ	۱۳۰
علوم دینیہ، فقہ اور علم کلام میں ملکۂ تام	۱۳۰
دنیا کے حالات سے واقفیت	۱۳۱
ایک اسلامی لباس	۱۳۲
گھوڑسواری اور نشانہ بازی	۱۳۲
تہذیب، اخلاق اور تزکیہ نفس	۱۳۳
عربی زبان کی مشق	۱۳۳
سیاسی اور تاریخی موضوعات پر تقریر	۱۳۴
علماء کی طرف سے ہمت افزا خطوط	۱۳۴

مولانا تھانویؒ کی رائے	۱۳۵
ندوۃ العلماء کا پہلا مجوزہ نصاب تعلیم	۱۳۵
تاریخ کی اہمیت	۱۳۶
اسرار کی احکام	۱۳۶
نصاب پر ایک نظر	۱۳۶
مولانا کی مجبوری	۱۳۷
دوسری دشواری	۱۳۹
انقلاب انگیز نصاب	۱۴۰
استعفیٰ کی کوشش	۱۴۱
اہل تشیع سے ترک موالات	۱۴۲
ندوہ کے تعارف کے لئے علماء کا وفد	۱۴۳
مولاناؒ کی قیادت میں وفدِ ندوہ کی روانگی اور نمایاں کامیابی	۱۴۳
ایک قدیمی نزاع کا خاتمہ	۱۴۴
کام کی رفتار	۱۴۴
حیدر آباد کی طرف سے وظیفہ اور مولاناؒ کا استغنا	۱۴۴
اجلاس بریلی	۱۴۵
مسودۂ دار العلوم کی منظوری	۱۴۶
مولاناؒ کی تقریر	۱۴۶
جلسۂ خاص	۱۴۷
تقرر واعظین	۱۴۸

مخالفت کا طوفان	۱۴۸
بنائے اعتراض	۱۵۰
مخالفین کی بددیانتی	۱۵۱
رسالہ بازی کی مہم	۱۵۱
مولاناؒ کا رویہ	۱۵۳
ندوۃ العلماء مسلمانوں کے لئے لطیفہ غیبی حاجی امداداللہ صاحبؒ کی رائے	۱۵۳
مولاناؒ کا سفر دہلی، اور انجمن "معین الندوہ" کا قیام	۱۵۴
مولانا کا سفر غازی پور، اور ندوۃ العلماء کی شاخ کا قیام	۱۵۵
ایثار کی قابل رشک مثال	۱۵۶
قدیم وجدید طبقہ کا پہلا نمائندہ اجتماع	۱۵۶
ممالک غیر میں اشاعت اسلام کے لئے طلبہ کو وظائف	۱۵۸
اجلاس میرٹھ	۱۵۸
جلسۂ علماء	۱۵۸
طرز نشست کے سلسلے میں مولاناؒ کی اہم رائے	۱۵۹
قحط کے اثرات اور ندوہ کی مشکلات	۱۶۰
کانپور کا جلسۂ خاص	۱۶۱
دارالافتاء کی کارکردگی	۱۶۱
یتیم خانہ کانپور	۱۶۱
ایک ہزار باضابطہ ارکان	۱۶۲
دارالعلوم کے لئے لکھنؤ کی تجویز	۱۶۲

مولانا محمد علیؒ کی رائے	۱۶۲
ابتدائی درجات کی منظوری	۱۶۳
مولاناؒ کی تجویز وفد	۱۶۳
عملی اسپرٹ اور کام کی تیز رفتاری	۱۶۳
انگریزی خواں طلبہ اور دارالعلوم	۱۶۴
انگریزی زبان کے سلسلہ میں مولاناؒ کا اعلان حق	۱۶۴
جدید نظام تعلیم پر مولاناؒ کی تنقید	۱۶۵
زبان کچھ نہیں، اللہ ورسولؐ کی محبت اصل ہے	۱۶۷
عربی وانگریزی کی تحصیل کا طریقہ	۱۶۸
دارالعلوم کے لئے زمین کی تلاش	۱۶۹
لکھنؤ میں دفتر ندوہ کی منتقلی	۱۷۰
ایک ضعیفہ کا گراں قدر عطیہ	۱۷۰
درجہ ابتدائی کا آغاز اور جلسۂ افتتاح	۱۷۰
طلبہ کے لئے نظام الاوقات	۱۷۳
معترضین کی روش	۱۷۳
مزید شاخوں کا قیام	۱۷۳
مولانا شبلیؒ سے اختلاف	۱۷۴
مولانا شبلیؒ کی علمی مصروفیات اور علالت	۱۷۵
سالانہ جلسہ میں شرکت کی دعوت	۱۷۶
سبب اختلاف	۱۷۶

اجلاس شاہجہاں پور	۱۷۷
چندہ کے لئے ازدہام	۱۸۰
عجیب نظارہ	۱۸۰
جلسۂ عام	۱۸۱
جلسۂ خاص	۱۸۱
مدرسہ کی پیشکش	۱۸۲
روپیہ کی بارش	۱۸۲
مزدوروں کا تعلق وایثار	۱۸۳
ایک واعظ کا انقلاب حال	۱۸۳
شہر میں جلسے اور سرگرمیاں	۱۸۳
خواتین کی دریادلی	۱۸۴
بریلی کے لئے ندوہ کا وفد	۱۸۴
ایک رئیس کا جذبۂ اعانت	۱۸۴
مولانا عبدالحیؒ کی خدمات کا اعتراف	۱۸۵
نئے مہتمم	۱۸۵
مولانا شیروانیؒ کی رپورٹ	۱۸۶
انگریزی کا داخلہ	۱۸۷
دارالافتاء بند	۱۸۷
ندوہ کا اجلاس ہفتم منعقدہ عظیم آباد پٹنہ رجب ۱۳۱۸ھ، نومبر ۱۹۰۰ء	۱۸۷
اجلاس کی قلمی تصویر	۱۸۸

پہلا اجلاس	۱۸۹
طلبہ کا امتحان	۱۹۰
دوسرا اجلاس	۱۹۱
ایک نوجوان بیرسٹر کی تقریر	۱۹۴
جدید طبقہ کی طرف سے اظہار عقیدت	۱۹۷
حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی وفات پر تعزیتی تجویز	۱۹۸
دارالعلوم کے متعلق مولاناؒ کا ایک اہم مکتوب	۱۹۹
علم کے ساتھ دینداری اور خوش خلقی کی ضرورت	۲۰۱
صحت جسمانی اور ورزش کی اہمیت	۲۰۲
زندگی کے عناصر خمسہ	۲۰۲
اردو ادب	۲۰۳
توازن و اعتدال	۲۰۳
علوم قرآن اور ادب عربی	۲۰۴
قرآن مجید کے لئے خاص انعام	۲۰۵
مولاناؒ کا پہلا سفر حج	۲۰۶
سامان توکل	۲۰۷
استغراق و بے ہوشی	۲۰۸
چاٹگام میں رجوع عام	۲۰۸
ندوہ کی یاد	۲۱۰
استنبول سے ایک خط	۲۱۲

نائب سلطان کی ارادت وعقیدت	۲۱۳
امیر مکہ کا خط اور اعانت کی درخواست	۲۱۴
لارڈ مکڈانل کی مولانا شبلی سے بدگمانی	۲۱۵
اجلاس ششم منعقدہ کلکتہ شعبان ۱۳۱۹ھ، دسمبر ۱۹۰۱ء	۲۱۶
مخالفین کے ساتھ مولاناؒ کا رویہ	۲۱۸
مولاناؒ کی واپسی، علالت اور کلکتہ حاضری	۲۱۸
طلبہ کا امتحان	۲۱۹
تقسیم انعامات	۲۱۹
لکھنؤ میں طاعون اور دارالعلوم کی منتقلی	۲۲۰
نئے درجوں کا افتتاح	۲۲۰
انگریزی سکنڈ لینگویج	۲۲۱
گورنمنٹ کے رویہ میں تبدیلی کے آثار	۲۲۱
دفتر ندوہ شاہجہاں پور میں	۲۲۱
اجلاس امرتسر اور مولانا شبلیؒ کی آمد	۲۲۱
مجلس نصاب میں مولانا شبلیؒ کا انتخاب	۲۲۲
اجلاس مدراس اور مفاہمت کی آخری کوشش	۲۲۳
مولانا محمد علیؒ کا سفر مدراس	۲۲۳
خواجہ حسن نظامی کی دلچسپ تقریر	۲۲۵
مولاناؒ کے استعفیٰ کی توثیق	۲۲۶
مولانا محمد علیؒ اور مولانا شبلیؒ	۲۲۶

استعفیٰ کی اصل وجہ	۲۳۴
استعفیٰ کی منظوری	۲۳۷
باب پنجم قادیانیت کا مقابلہ	۲۴۰
ایک متوازی نبوت اور متوازی امت	۲۴۱
مسلمانوں کی غیرت اور وفاداری کا امتحان	۲۴۲
قادیانیت کی تبلیغ واشاعت	۲۴۲
بہار پر یورش	۲۴۳
ایک اہم تاریخی مناظرہ	۲۴۵
قادیانیت کے خلاف زبردست مہم	۲۴۶
شہرت ونا موری سے اجتناب	۲۴۷
تہجد کے وقت تصنیف	۲۵۰
مولانا کے خطوط	۲۵۰
فیصلہ آسمانی	۲۵۳
شہادت آسمانی	۲۵۹
مولاناؒ کی دوسری تصنیفات پر ایک نظر	۲۶۱
مکتوب بنام استاد فرمانروائے دکن	۲۶۴
مولاناؒ کی تصنیفات کا اثر	۲۶۶

باب ششم

سلوک وارشاد اور اصلاح عام

تعلق باللہ اور اس کی اہمیت	۲۶۹
مونگیر کے قیام کا انتظام	۲۷۰
مونگیر کا پہلا سفر	۲۷۲
مرشد سے تعلق	۲۷۳
در کفے جام شریعت، در کفے سندان عشق	۲۷۳
استغناء وعالی ظرفی	۲۷۴
امراء کی دعوت سے اجتناب	۲۷۷
مولانا فضل رحمٰن صاحبؒ کے بلند کلمات	۲۷۷
عام وعظ وتقریر سے بے رغبتی	۲۷۹
رجوع عام	۲۸۰
سب سے بڑی کرامت	۲۸۲
تاثیر انقلاب آفرینی	۲۸۳
مریدین کا تعلق وشیفتگی	۲۸۸
مولاناؒ کا دوسرا سفر حج	۲۹۱
ایک ممتاز چینی عالم کی بیعت وارادت	۲۹۳
درویشی وسلطانی	۲۹۵

چار لاکھ مریدین	٢٩٦
تربیت واصول تربیت	٢٩٧
طلب اور ہوس کا فرق	٣٠٠
احکام شرعیہ میں فرق مراتب	٣٠١
انسان کی صفات سے تعلق	٣٠٣
مولاناؒ کے مکاتیب	٣٠٤
وحدت وجود کے متعلق مولاناؒ کا اہم مکتوب	٣٠٦
مشاہدہ ذات وصفات اصل ہے نہ کہ کشف وکرامت	٣٠٩
انوار ومکاشفات کی مثال	٣١٠
ذکر کی بے اثری اور برے خیالات کی بڑی وجہ	٣١١
جو نعمت ناشکری کی وجہ سے چھین لی جاتی ہے پھر ملتی نہیں	٣١٣
ذکر کی لذت سے بڑھ کر دنیا کی کوئی لذت نہیں	٣١٣
ایک اعتراض کا جواب	٣١٤
مقصود لذت وکیفیت نہیں رضائے الٰہی ہے	٣١٥
وظیفہ کی کمیت نہیں، کیفیت درکار ہے	٣١٦
ترک دنیا نہیں، اصلاح دنیا	٣١٧
’’حجاب‘‘ بھی عنایت ہے	٣١٧
ارشاد رحمانی	٣١٨

اذواق وکیفیات	۳۲۲
عشق رسولؐ	۳۲۳
قدرتی سماع	۳۲۴
نماز سے عشق	۳۲۴
ذوق ونفاست	۳۲۵
باب ہفتم آخری ایام زندگی، وفات، اخلاف	۳۲۷
ندوہ کی یاد	۳۲۷
آخری ایام	۳۲۹
وقت آخر	۳۳۱
وفات مریدن وخلفاء	۳۳۲
اولاد	۳۳۳
مریدین وخلفاء	۳۳۵

دردست نہ تیرست کمان است
ایں سادگی اوست کہ بسمل دوجہان است
در مدرسہ از جنبش لعل تو حکایت
درمیکدہ از مستی چشم تو نشان است

مقدمہ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

مولانا سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ بانی وناظم اول ندوۃ العلماء کی سوانح وسیرت ملک کے سامنے پیش کرتے ہوئے ندوۃ العلماء کے ایک حقیر خادم ومنتسب اور حضرت مرحومؒ کے کمالات وخدمات کے ایک ادنیٰ معترف ومعتقد کی حیثیت سے میرا دل جذبات تشکر وامتنان سے معمور اور مسرت وانبساط سے مخمور ہے۔

تیرہویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی پورے عالم اسلام میں سیاسی زوال اور فکری اضمحلال کی صدی ہے، اسی صدی میں عالم اسلام کے نہایت اہم، زرخیز ومردم خیز ملک مغربی اقوام کے غلام بنے، ہر جگہ اسلامی تہذیب اور اسلامی علوم کو موت وزیست کی کشمکش سے سابقہ پڑا، عالم اسلام میں نئے نئے دینی فتنے، گمراہ کن تحریکیں یہاں تک کہ مدعی نبوت تک پیدا ہوئے، عیسائی مبلغین نئے جوش وخروش کے ساتھ میدان میں آئے، نئے نظام تعلیم نے جو خالص مادی بنیادوں پر قائم تھا، سارے اسلامی ممالک پر اپنا سایہ پھیلایا، عالم اسلام کے یہ حالات اِس بات کے لئے بالکل کافی تھے کہ ذہانت وجرأت کے سب سوتے خشک اور اسلامی فکروحیات کا درخت خزاں رسیدہ اور بے برگ وبار ہوجائے، لیکن قدرت الٰہی کی عجب کرشمہ سازی ہے کہ جیسا کہ اس سے پہلے بھی کئی بار ہوا ہے، اسی صدی میں عالمِ اسلام میں متعدد ایسی شخصیتیں پیدا ہوئیں جن کی فکری سطح اور جن کے عزائم اس زمانہ سے کچھ میل نہیں کھاتے اور جو اپنے افکار وخیالات، اپنی خداداد صلاحیتوں، اپنے جوہر واستعداد اور اپنے علمی وذہنی کمالات

کے لحاظ سے کسی طرح اس دورِ انحطاط کے پیداوار نہیں معلوم ہوتے۔

عقلی و مادّی حیثیت سے اور فلسفۂ تاریخ کے اصول سے تو اس کی توجیہ یہ کی جا سکتی ہے کہ ناسازگار حالات، ذہنی کشمکش اور طبعی ردعمل نے اسلامی ذہن کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کیا، اور حالات کی ضرب پیہم نے اس سنگ خارا کو اُس سنگ چقماق میں تبدیل کر دیا جس سے برابر شرارے بلند ہوتے رہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا اس امّت کے ساتھ جو معاملہ رہا ہے اور اس نے جس طرح اس کی حیات و بقا کی ضمانت کی ہے، اس کے پیش نظر اس گتھی کو سلجھانا اور اس ''تضاد'' کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں، بلکہ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر اس بات کا سمجھنا اور زیادہ آسان ہو جاتا ہے کہ دورِ انحطاط میں ایسی بلند شخصیتیں کیوں زیادہ پیدا ہوتی، فاطر کائنات و خالقِ موت و حیات کی زندگی کے حدی خواں کو ہمیشہ سے یہی ہدایت ہے کہ ؎

نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حدی را تیز ترمی خواں چو محمل را گراں بینی

هُو الذي ينزل الغيث من بعد ما قنطوا وينشر رحمته وهو الولي الحميد.

ہندوستان کا حصہ اس عالم گیر سیاسی زوال اور فکری اضمحلال میں دوسرے اسلامی ممالک سے زیادہ ہی ہونا چاہیئے تھا، یہاں سلطنت مغلیہ اور درحقیقت مسلمانوں کے آخری سیاسی اقتدار کا چراغ ابھی گل ہوا تھا اور اس پر براہ راست انگریزی تسلط قائم ہوا تھا، جو مسلمانوں کی آخری قوتِ مقابلہ کا زخم کھا کر مسلمانوں کے لئے ہمدردی و رواداری بلکہ حاکمانہ عدل و انصاف اور مساویانہ سلوک کے جذبات سے بھی خالی اور جذبۂ انتقام سے بھرپور تھا، یہ سخت اضطراب و انتشار، تحیر و سرگشتگی، تذبذب و تردد، اور بیکسی و کسمپرسی کا دور تھا، ایسی حالت میں اگر ہندوستان عظیم و منفرد شخصیتوں سے خالی اور یہاں قحط الرجال کا دور دورہ ہوتا تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی، مگر اس کے برعکس یہ دور اکابر رجال و مردانِ کار کی حیثیت سے بھی، ماہرین فنون، اہل تصنیف و اصحاب فکر کے لحاظ سے بھی، اہل قلوب و اصحاب باطن کے نقطۂ نظر سے بھی، اور تعلیمی و اصلاحی تحریکوں کے اعتبار سے بھی، اور اس حیثیت سے بھی کہ اس دور میں بعض عظیم ترین تعلیمی مرکز اور ادارے (جو صرف درسگاہیں نہیں بلکہ مدارس فکر اور مستقل

دبستان ہیں) قائم ہوئے، سارے عالمِ اسلام میں خصوصی امتیاز رکھتا ہے۔

اس دور کی انہیں یگانہ شخصیتوں میں ایک مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی ذات بھی ہے جو جامعیت وتوازن کا ایک ایسا نادر مرقع ہے جس کی مثال اس دور میں مشکل سے ملے گی۔ للّٰہیت وربانیت، عشق وخدامستی، کمال اتباع سنت وفنائیت فی الرسول اسلام کے لئے دلسوزی اور امت کی فکر، علو ہمت وبلند نظری، تازگیِ فکر وجرأت اندیشہ، نور بصیرت وفراستِ ایمانی، حقیقت پسندی وعملیت، زمانہ کی نبض شناسی اور آنے والے خطرات سے آگاہی، وسعت قلب ووسعتِ نظر، اجتماعی کام کی صلاحیت، مختلف الذوق رفقاء کے ساتھ اشتراکِ عمل وتعاون کے لئے ہمہ وقت آمادگی، یہ مختلف وبظاہر متضاد صفات وکمالات ان کی ذات میں اس طرح جمع اور پہلو بہ پہلو ضوفگن ہیں کہ دیکھنے والے کے لئے اور ان کی سوانح کا مطالعہ کرنے والے کی نگاہ کی ہمہ گیری کے لئے یہ ایک مستقل امتحان بن جاتا ہے، اور وہ پکار اٹھتا ہے کہ ؎

"گلچین بہار تو زداماں گلہ دارد"

انہوں نے جس طرح "جام وسنداں" اور "شیشہ اوآہن" کو جمع کیا، انہوں نے جس محدود ماحول میں رہ کر باہر کی وسیع دنیا دیکھی، جن مبہم ونا تمام اشاروں پر مستقبل کے خطرات کی واضح نشاں دہی اور بلیغ پیش گوئی کی، جس قانع وزاہد ماحول میں رہ کر جس کے در ودیوار سے۔

گوش بند وچشم بند ولب بہ بند کی صدا آرہی تھی، زمانہ کے جدید تقاضوں کو محسوس کیا اور ان کے لئے بےچین ہوئے، جس قلیل اثاثہ پر ایک ایسی عالمگیر اور انقلاب انگیز دینی تعلیمی تحریک کی بنیاد رکھی جس کے آگے مصر وترکی کے مصلحین بھی اس دور میں نہ جا سکے۔ وہ ایک حیرت انگیز واقعہ ہے، اور وہ صرف ان کی فطرت کی ارجمندی اور ان کے جوہر کی تابانی کی دلیل ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کا ضمیر وخمیر تنہا اس ماحول اور تعلیم وتربیت کا نتیجہ نہیں جو انہوں نے پائی تھی، بلکہ اس نسبتِ گرامی کا نتیجہ ہے جو ان کو نسبی وروحانی طریقہ پر حاصل تھی ؎

"تری آگ اس خاکداں سے نہیں"

انیسویں صدی کے آخر میں انہوں نے ندوۃ العلماء کا جو وسیع و رفیع تخیل پیش کیا، جس طرح مقاصد و وسائل کی تنقیح کی۔ جس طرح قدیم نصاب میں علومِ آلیہ[1] کے غلبہ اور کتب معقولات کی بیجا کثرت پر جرأت مندانہ تنقید کی، جس طرح عربیت میں کمال اور علوم اسلامیہ میں مہارت خصوصی پر زور دیا، جس طرح فقہ کی تدوین جدید اور جدید مسائل وضروریات پر نئے سرے سے غور کرنے کی ضرورت بیان کی، جس طرح فتنۂ تکفیر اور نزاع باہمی کے اس پُرآشوب دور میں اتحاد اور مناظرہ ومجادلہ وانتہا پسندی کے اس پُرجوش ماحول میں مسلک اعتدال کی دعوت دی، جس طرح انہوں نے مخالفین اسلام کے اعتراضات کا جواب دینے کے لئے فلسفۂ جدید کے مطالعہ اور علومِ جدیدہ کی تحصیل پر زور دیا، جس طرح انہوں نے ایک ایسے ماحول میں جس میں ہر جدید چیز بے دینی اور ''نیچریت'' کا نشان سمجھی جاتی تھی، مفید علوم اور انگریزی زبان اور تقریر وتحریر کی مشق کی برملا ترغیب دی، جس طرح انہوں نے بیگانگی وبدگمانی کے اس دور میں مدارسِ دینیہ کے وفاق کی دعوت دی، جس طرح انہوں نے مدارس اور انجمنوں کے سالانہ جلسوں میں ملتِ اسلامیہ کی فکر مندی کے لئے جدید تعلیم یافتہ اصحاب کو دعوت دی اور ان کو علماء ومشائخ کے پہلو میں بٹھایا اور ان کی طرف تعاون واعتماد کا ہاتھ بڑھایا، جس طرح انہوں نے حریف ورقیب علماء اور جماعتوں کے ''باہم دگر دست وگریباں'' پیشواؤں کو ایک دوسرے سے ملایا اور گلے لگایا، جس طرح انہوں نے علماء وفضلاء مدارس کو حالاتِ زمانہ سے باخبری اور عملی زندگی میں شرکت اور خیر القرون کی طرح مسلمانوں کی رہنمائی کی ذمہ داری سنبھالنے کی دعوت دی، جس طرح انہوں نے تمدن ومعیشت اور دین کی خدمت کے لئے اسلام کی عطا کی ہوئی آزادی، اور فقہ کی دی ہوئی گنجائش سے فائدہ اٹھانے کو جائز قرار دیا اور باوجود اپنے ذاتی وعملی اعلیٰ معیار ورع وتقویٰ کے اجتماعی کاموں میں اس کو نہ صرف گوارا بلکہ ضروری قرار دیا، یہ اور ایسے بہت سے ''اولیات'' وامتیازات ہیں جن میں اگرچہ آج کوئی ندرت وجدت نظر نہ آتی ہو، مگر ان میں بہت سی چیزیں اپنے زمانہ سے آگے کی تھیں، اور ان کی جرأت وہی کرسکتا تھا جس کا اخلاص، جس کا فہم دین، اور جس کا

---

(۱) صرف ونحو ومنطق وغیرہ۔

ورع وتقویٰ ہر شبہ سے بالاتر ہو، اور جس کو خود رسوخ فی العلم کی دولت اور اپنے فہم وبصیرت پر اعتماد کی قوت حاصل ہو اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ان میں سے بہت سی چیزیں جو آج مانوس وبدیہی نظر آرہی ہیں، اور ان کو عام طور پر قبول کرلیا گیا ہے اس میں بھی ان کے خلوص، سوز ودردمندی اور مسلسل جدوجہد کو دخل ہے۔

اس عظیم وانقلاب انگیز تحریک (ندوۃ العلماء) کے بانی ہونے کے علاوہ، ان کی دوسری حیثیتیں بھی مسلّم وممتاز ہیں۔ وہ ایک جلیل القدر عالم، ایک عظیم المرتبت مبلغ و مصلح بھی ہیں، عیسائیت وقادیانیت کے مقابلے میں ان کا کارنامہ اجتہادی وتجدیدی شان رکھتا ہے۔ پھر اس کے سوا اور اس سب سے بڑھ کر وہ ایک بلند پایہ شیخ طریقت اور ایک عالی مقام عارف وسالک ہیں جن کے حالات وکیفیات ومقامات واثرات اولیائے متقدمین کی یاد تازہ کرتے ہیں، اور جن سے ہزاروں بندگان خدا نے فائدہ اٹھایا اور فائز المرام ہوئے، غرض وہ ایسے گوناگوں کمالات کے جامع ہیں کہ وہ ایک شخصیت نہیں، بلکہ متعدد باکمال شخصیتوں کا مجموعہ نظر آتے ہیں ؎

"وہ اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں"

ان اوصاف وکمالات اور ان کی خدمات اور کارناموں کا تقاضہ تھا کہ ان کی سیرت آج سے بہت پہلے مرتب اور شائع ہوچکی ہوتی۔ اس بناء پر یہ بات اور بھی قرینِ قیاس تھی کہ وہ ایک ایسی تحریک اور انجمن کے بانی ہیں جس نے بیسیوں مصنف واہل قلم پیدا کیے اور انہوں نے سیرت نگاری وتذکرہ نویسی کو اپنا خاص موضوع بنایا، یوں بھی منت پذیری اور فرض شناسی کا تقاضا تھا کہ ندوۃ العلماء کی طرف سے ان کی شایانِ شان سیرت وسوانح جلد سے جلد مرتب وشائع ہوتی، لیکن افسوس ہے کہ جلد ایسا نہ ہوسکا اور جتنا زمانہ گزرتا جارہا تھا، یہ کام زیادہ مشکل نظر آتا تھا، مواد بہت منتشر اور زیادہ تر مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے آخری مرکزِ روحانی خانقاہ رحمانی مونگیر میں تھا۔ مخدوم زادۂ گرامی مولانا سید منت اللہ صاحب امیر شریعت بہار کی خواہش تھی کہ فاضل گرامی مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ اس کو مرتب فرمائیں جن کو مولاناؒ سے خاص مناسبت اور قرابت کا رشتہ بھی تھا اور قرب مکانی بھی

حاصل تھا، مگر افسوس ہے کہ ان کو اس کام کا موقع نہ ملا اور یہ کام رہ گیا ؎

یک حرف کاشکے است کہ صد جا نوشتہ ایم

یہ عاجز اگرچہ مولاناؒ کی زیارت سے محروم رہا تھا اور اپنی بے بضاعتی و نا اہلی کی وجہ سے ان کے کمالات ظاہری و باطنی کے ادراک سے یکسر قاصر تھا، پھر بھی اپنی سعادت اور ندوۃ العلماء کی طرف سے ایک اخلاقی فریضہ سمجھ کر دل سے اس کا متمنی تھا کہ یہ کام اس کے ہاتھ سے انجام پائے اور یہ سعادت اس کے حصے میں آئے، لیکن ذہن نے ترتیب یہ قائم کی تھی کہ پہلے مولاناؒ کے عظیم المرتبت شیخ اور اکثر ارکانِ ندوۃ العلماء کے مُرشد و مُربی، اویس زمانہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ مرتب ہو جائے کہ الاول فالاول، اللہ تعالیٰ نے یہ آرزو پوری کر دی اور ۱۹۵۸ء (۱۳۷۷ھ) میں تذکرہ مرتب ہو کر شائع و مقبول ہوا۔ اب مولاناؒ کی سوانح حیات کی باری تھی اور اس میں تاخیر کی کوئی معقول وجہ نہ تھی، ادھر صاحبزادۂ گرامی قدر مولانا سید منت اللہ صاحب امیر شریعت بہار کی خواہش و اصرار تھا کہ یہ ناچیز ہی اس کام کو انجام دے، متعدد وجوہ سے اس نا کارہ پر اس سوانح کا حق تھا، اور یہ نا کارہ اپنی کم سوادی کے باوجود اس کو اپنی سرخروئی اور سرفرازی کا ذریعہ سمجھتا تھا، لیکن اسی زمانہ میں نزول الماء کی شکایت نے ایسا معذور کر دیا کہ باریک تحریریں دیکھنا اور خود لکھنا مشکل ہو گیا، مولانا کی سوانح کے سلسلہ میں مطبوعہ و غیر مطبوعہ ہزاروں صفحات پڑھنے ضروری تھے، خاندانی نوشتے، بیاضیں، خطوط کا ایک بڑا ذخیرہ (جس میں ایک بڑا مجموعہ ہمارے یہاں محفوظ ہے) ندوۃ العلماء کے جلسوں کی رودادیں، مجلس انتظامی کی کارروائی کے فائل، مولانا کی تصنیفات و مضامین، یہ سب ایک ضخیم دفتر بلکہ ایک اچھا خاصا کتب خانہ تھا، جس کا تفصیلی جائزہ لئے اور اس کا حرف حرف پڑھے بغیر سوانح کی تکمیل نہ ممکن تھی نہ جائز۔ میں نے مولانا سید منت اللہ صاحب سے اجازت لی کہ یہ کام میں اپنی نگرانی اور اہتمام میں کراؤں گا۔ البتہ میرا خود لکھنا مشکل ہوگا، مولانا نے کسی قدر تذبذب اور شبہ کے ساتھ اس کی اجازت دی، اور اپنے یہاں کا سارا قلمی و مطبوعہ ذخیرہ حوالہ فرما دیا۔ کتب خانہ ندوۃ العلماء اور دفتر ندوۃ العلماء سے تمام متعلق کتابیں،

روداد یں اور جلسہ انتظامی کے کاغذات حاصل کر لئے گئے۔ اور دار العلوم کی عمارت کے ایک حصے میں "تالیف سوانح مولانا سید محمد علی مونگیریؒ" کا ایک شعبہ اور دفتر قائم کر دیا گیا۔ میں نے کام کا ایک نقشہ اور کتاب کے ابواب و مضامین کا خاکہ مرتب بھی کر لیا۔ اس کام کی تکمیل کے لئے ملک کے ایک ممتاز صاحب قلم اور فاضل کی خدمات حاصل کرنے کا خیال ہوا، جن کے رواں و شاداب قلم کو بزرگان دین و علماء و مشائخ کے سوانح و ملفوظات مرتب کرنے سے خاص مناسبت ہے، ان سے خط و کتابت بھی ہوئی اور انہوں نے اس دعوت کو (اپنے لئے ایک سعادت سمجھ کر) منظور بھی فرمالیا۔ اور یہ طے ہوا کہ وہ کچھ روز لکھنؤ قیام کریں گے اور میرے مشورے سے کتاب کو مرتب کریں گے۔

اسی دوران میں ایک روز اچانک معلوم ہوا کہ برادر زادۂ عزیز سید محمد الحسنی (جن کا البعث الاسلامی کا دفتر اسی کمرے میں تھا جہاں یہ نیا دفتر قائم کیا گیا تھا) بغیر کسی کو بتلائے اپنے شوق سے یہ کام شروع کر چکے ہیں، اور ان کی بڑی تمنا ہے کہ یہ کام ان کے ہاتھوں انجام پائے، غالباً اس کا محرک یہ ہوگا کہ ان کے دادا (راقم سطور کے والد ماجد) مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کے اولین معتمد اور طویل عرصہ تک ندوۃ العلماء کے کاموں میں ان کے دست و بازو رہ چکے ہیں اور ان کو حضرت مولاناؒ سے متعدد وجوہ سے خصوصی مناسبتیں تھیں، شاید اس قدیم وعمیق روحانی رشتہ نے جس کے اثرات ان کے خون میں آئے ہیں، اثر کیا۔ ان سب عزیزوں میں جو اس ناچیز سے خصوصی و عزیزانہ تعلق رکھتے ہیں۔ عزیز موصوف کو میرے بُرے بھلے طرز نگارش سے سب سے زیادہ مناسبت ہے، اور بعض وقت ان کی تحریر اور اپنی تحریر میں مجھے خود بھی اشتباہ ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نظر بد سے بچائے۔ ان کو اپنے نامور دادا سے قلم کی روانی اور تحریر کی شگفتگی ورثہ میں ملی ہے۔ میں نے ان کا ذوق و شغف دیکھ کر اور اس اُمید پر کہ اُن کی تحریر و تصنیف زیادہ سے زیادہ میری تحریر و تصنیف کی قائم مقامی کر سکے گی، ان کو اجازت دی۔ یہ معلوم کر کے مزید اطمینان و مسرت ہوئی کہ وہ اس کام کو خالص اپنی سعادت سمجھ کر انجام دے رہے ہیں، اور اُن تمام آداب کو ملحوظ رکھتے ہیں جو اہل اللہ

اور برگزیدہ اصحاب کی سوانح وسیرت کی ترتیب وتصنیف میں ملحوظ رکھنے چاہئیں۔

انہوں نے قلیل عرصہ میں سوانح مکمل کرلی۔ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ انہوں نے کتاب کی ترتیب میں پوری محنت سے کام لیا، اور اپنی اہلیت کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے تمام متعلقہ مواد کو غائر نظر سے پڑھا اور بڑی خوبی کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھایا اور کام لیا ہے۔ کتاب جس شکل میں سامنے آئی وہ حقیقت میں میرے تصور وتوقع سے بلند تھی۔ اس حقیقت کے اظہار میں مجھے ذرا تامل نہیں اور اس میں قطعاً کسی تعلق کو دخل نہیں کہ اب مجھے اپنے نہ لکھنے پر ذرا بھی قلق اور افسوس نہیں، بلکہ یہاں تک کہا جاسکتا ہے کہ اس عدیم الفرصتی اور ذہنی تشتت وانتشار میں مجھے بہت مشبہ ہے کہ میں ان کے اتنے اچھے طریقہ پر انجام دے سکتا، اور اس کے حقوق سے عہدہ برآ ہوسکتا تھا۔

تمام انسانی کاموں کی طرح پھر ایک نوعمر مصنف کی تصنیف کی حیثیت سے جو اس اہم اور نازک موضوع پر قلم اٹھاتا ہے، جس کا بہت سی تحریکوں، اداروں اور شخصیتوں سے معاصرانہ تعلق رہا ہے اور قدرتی طور پر سب کے تاثرات وخیالات اس کے بارے میں یکساں نہیں ہوسکتے۔ اس میں نقطۂ نظر کے اختلاف اور تنقید کی بہت گنجائش ہے، اس میں خامیاں بھی ہوں گی اور کوتاہیاں بھی، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ مصنف نے اس میں اپنی عمر وصلاحیت سے زیادہ پختگی کا ثبوت دیا ہے، اور کہیں انصاف کے دامن اور نقطۂ اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔

کتاب جامع بھی ہے، مؤثر بھی ہے، دل آویز بھی، وہ نہ صرف ایک عظیم اور برگزیدہ شخصیت کی سوانح ہے، بلکہ ایک عظیم تحریک کی تاریخ بھی ہے، ایک معاشرے کی تصویر بھی ہے، اور ایک پورے دور کی عکاسی بھی۔ ماضی کی سرگزشت بھی ہے اور مستقبل کا وہ خواب بھی جو خدا کے ایک برگزیدہ وعالی ہمت بندہ نے دیکھا تھا، اور جس کی تعبیر پورے طور پر ابھی ظاہر نہیں ہوئی، اور یہ اس عظیم ادارہ کے فرزندوں اور ذمہ داروں کا فرض ہے کہ اس خواب کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔

ابوالحسن علی
دارالعلوم ندوۃ العلماء

۱۱ رجب ۱۳۸۳ھ
۲۸ نومبر ۱۹۶۳ء

باب اول

خاندان، ابتدائی حالات، درس وتدریس، علمی و تحقیقی ذوق

مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے ندوۃ العلماء جیسی عہد آفریں اور مجتہدانہ تحریک، نیز سلوک وارشاد، تزکیہ وتربیت، قادیانیت اور عیسائیت کے رد واستیصال اور اپنی مختلف دینی اور دعوتی خدمات کے ذریعہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں جو اہم جگہ حاصل کی ہے وہ کسی خاندانی رشتہ اور تاریخ کی مرہون منت نہیں، لیکن مولانا کے اس رتبۂ بلند میں ان کی عالی نسبی نے اور اضافہ کر دیا ہے، وہ اپنے تمام کمالات اور خصوصیات کے ساتھ خاندان نبوت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا سلسلۂ نسب شیخ عبدالقادر جیلانیؒ تک پہنچتا ہے، ان کے آباء کرام میں حضرت شاہ بہاء الحق مخدوم حبیب اللہ ملتانیؒ (۱) اور ان کے نامور فرزند حضرت شاہ ابوبکر چرم پوش (۲) جیسے کبار اولیاء اللہ اور آسمانِ رشد وہدایت کے چمکتے ہوئے ستارے نظر آتے ہیں۔

حضرت شاہ ابوبکر چرم پوشؒ آج سے تین سو برس پہلے ملتان سے جہاں ان کا خاندان آباد تھا، ضلع مظفر نگر تشریف لائے، اور قصبۂ کھتولی (۳) کے قریب قیام فرمایا، وہ جگہ

---

(۱) سید بہاء الحق ملتانی دسویں صدی ہجری کے اکابر اولیاء اللہ میں ہیں، ان کی ذات اس علاقہ میں مرجع خلائق تھی اور فیوض وبرکات کا دائرہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔

(۲) شاہ ابوبکر چرم پوش کا مزار کھتولی اسٹیشن پر ریلوے لائن سے چند قدم کے فاصلہ پر اب بھی موجود ہے اور زیارت گاہ خاص وعام ہے۔

(۳) کھتولی مظفر نگر اور میرٹھ کے درمیان ایک اسٹیشن ہے، اس زمانہ میں بھی اس کی حیثیت ایک قصبہ کی تھی، اور بادشاہ وقت طرف سے وہاں قاضی مقرر تھا۔

جہاں ان کی خانقاہ تھی شیخ پورہ کے نام سے آج بھی مشہور ہے۔ یہ جگہ اس وقت بالکل ویران اور غیر آباد تھی، لیکن ان کے قیام کے بعد اس نے ایک پُر آباد اور بارونق گاؤں کی شکل اختیار کرلی، یہ علاقہ بارہہ کہلاتا تھا اور یہاں جو سادات آباد تھے وہ سادات بارہہ کے نام سے مشہور تھے۔ کئی پشت تک سادات بارہہ (۱) سے کوئی رشتہ قرابت نہیں ہوا، لیکن آخر میں ان سے قرابت داری کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ (۲)

حضرت شاہ ابوبکر چرم پوشؒ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ: ”میری نسل کبھی ولایت سے خالی نہ رہے گی“ اور تاریخ گواہ ہے کہ یہ سلسلۃ الذہب مولانا محمد علی مونگیریؒ تک برابر جاری رہا۔

شاہ ابوبکر چرم پوشؒ کی اولاد میں ایک بزرگ شاہ شرفؒ گزرے ہیں، ان کے حالات وکمالات لکھتے ہوئے بعض مؤرخین (۳) نے حسب ذیل الفاظ لکھتے ہیں:۔

”شاہ شرف صاحب صاحبِ تصرفات عجیبہ وکرامات غریبہ وحالاتِ بلند بودند“

---

(۱) سادات بارہہ جو حضرت زید شہیدؒ سے نسبت رکھتے ہیں۔ کئی سو برس قبل منصور پور اور اس کے نواح میں آباد ہوئے، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ آباد کیے گئے۔ حکومت پر ان کا خاصا اثر ورسوخ تھا اور وہ ذرا ذرا سی بات پر بادشاہ وقت کو معزول کر کے تخت دوسرے کے حوالہ کر دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں ان کو KING (MAKERS) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بارہہ کی وجہ تسمیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ان کی بارہ شاخیں تھیں جن میں گیارہ شاخیں شیعہ اور ایک سنی تھی۔ بادشاہ نے ان بارہ شاخوں کو علیحدہ علیحدہ گاؤں تقسیم کر دیئے تھے تاکہ اس طرح ان کی طاقت تقسیم ہوجائے اور وہ حکومت کے لئے انتشار اور دردسری کا باعث نہ بنیں۔ ان ہی کی ایک شاخ کھتولی میں آباد تھی۔ منصور، خان جہان پور اور تھیڑی کے خاندان جو شیعہ تھے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ہاتھ پر تائب ہوکر اہل سنت والجماعت میں داخل ہوئے۔

(۲) کمالات محمدیہؒ ص:۴۰

(۳) مولانا منت اللہ رحمانی اپنے مقالہ متعلقہ سوانح مولانا محمد علی میں لکھتے ہیں:۔ پرانے کاغذات میں مجھ کو ایک مطبوعہ کتاب کے ۸ صفحات ملے ہیں۔ مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ آج سے ۴۶ برس پہلے طبع ہوا تھا۔ اس رسالہ میں حضرت مخدوم بہاء الحق ملتانیؒ سے لے کر ۱۹۰۶ء تک کے آپ کے خاندان کے لوگوں کا تذکرہ ہے جس سے اولاد ذکور واناث کی تفصیلات معلوم ہوتی ہیں، پھر جس کی جہاں شادی ہوئی اس کا حال معلوم ہوتا ہے۔ خاندان میں جب اور جن لوگوں کو شاہی جاگیریں اور معافیاں ملیں اس کا بھی ذکر ہے۔ افسوس ہے کہ پورا رسالہ میرے پاس موجود نہیں، صرف ۸ صفحے میرے سامنے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ رسالہ حضرت مولانا محمد علیؒ کی نگرانی میں طبع ہوا ہے۔ بہر حال اتفاقاً ان اوراق میں حضرت شاہ شرفؒ کا حال موجود ہے۔ اس کے بعد کے اوراق ضائع ہوگئے ہیں۔

شاہ شرف کے بھی دو صاحبزادے تھے، شاہ سانولے اور شاہ عنایت، شاہ عنایت کا تذکرہ اسی مطبوعہ رسالہ میں جس کا ذکر حاشیہ میں گزرا ہے موجود ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سادات بارہہ کو ان سے کتنا گہرا تعلق تھا۔ دوسری طرف ان کے استغناء اور بے نفسی کا کیا عالم تھا، تذکرہ نگار لکھتا ہے:۔

''شرفائے سادات بارہہ سرِ تسلیم بدر فضل وکمال او رخم کروند و بحلقۂ ارادت در آمدند و طلبہ علوم از در نوال او بہرہ یافتند واز اہل دنیا وامتعہ شان بے نیازی تمام داشتند، یکے از اغنیاء بشکرانہ انجاح حاجت لا نخل خزانہ وافر برائے ندر ایشاں آورد ہر چند اسحاح نمود قبول نہ نمودند، بالآخر چوں آنکس ہم واپس بردن راابا کرد اشارہ نمودند کہ تالاب برائے نفع عام بنا کردہ شود''

اسی خانوادہ کے ایک بزرگ سید شاہ علیؒ تھے، ان کے کمالات کا بادشاہ وقت بھی معترف تھا، اسی رسالہ میں ان کے متعلق درج ہے:۔

''شاہ فرخ سیر چہل وشش بیگہہ پختہ آراضی سر درختی ومزروعہ بہ محی الدین پور بنام ایشاں جاگیر ساخت''

محی الدین پور شیخ پورہ سے صرف سوا میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں ہے۔ اس واقعہ کے بعد خاندان کے لوگ زیادہ تر اسی گاؤں میں منتقل ہوگئے۔ (۱)

سید شاہ حاجی جو مولانا محمد علی کی آٹھویں پشت میں ہیں اپنے وقت کے باکمالوں میں تھے، محمد شاہ ان کا معتقد تھا اور اس نے کچھ جاگیر بھی ان کی خدمت میں پیش کی تھی۔

مولاناؒ کے اس سلسلہ کی دوسری شاخ میں ایک بزرگ شاہ غلام مصطفےٰ گزرے ہیں، یہ شاہ محمد نصیب کے پوتے ہیں، شاہ محمد نصیب محمد عاشق کے (جو مولانا محمد علی مونگیری کی ساتویں پشت کے بزرگ ہیں) صاحبزادے ہیں، شیخ پورہ میں ان کی خاصی جائداد تھی، اور ایک عمدہ محل تھا، لیکن اس سب کو خیر کہہ کر کانپور تشریف لائے، اس وقت کانپور ایک

---

(۱) محی الدین پور منتقل ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ شیخ پورہ میں جائداد اور مکانات وغیرہ خاندان کی اس شاخ کے قبضہ میں آئے جو شیعہ تھی، اور اس کے علاوہ کوئی صورت باقی نہ رہ گئی تھی کہ اس کو خیر باد کہہ کے محی الدین پور میں سکونت اختیار کی جائے۔

معمولی جگہ تھی جہاں کا کیمپ تھا، اور اسی وجہ سے عالم لوگ اس کو کمپو کہتے تھے۔ احاطۂ کمال خاں میں جس جگہ مسجد دلاری (۱) واقع ہے۔ اس جگہ کو آپ نے پسند فرمایا اور قیام کا فیصلہ کیا۔ آس پاس کے غریب لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ ایک بزرگ یہاں آئے ہیں تو انہوں نے آپ کے قیام کو غنیمت جانا، اور ایک مختصر مکان بنوادیا، آپ نے مکان کے قریب ایک خام مسجد بنوائی، یہ اس احاطہ میں پہلی مسجد تھی، اس کے بعد ایک شخص دین محمد طباخ اور اس کی بیوی دلاری نے جو فوج میں روٹی دیا کرتی تھی، اس مسجد کو پختہ بنوادیا۔ اس مسجد پر ۱۲۱۹ھ کندہ ہے۔ (۲) یہ مسجد "دلاری کی مسجد" کے نام سے مشہور ہوئی، "مقامات" کے مصنف نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔ "مسجد میں جو پتھر لگا ہوا ہے اس میں دین محمد کا نام ہے، مگر شہرت اس کی بیوی کے نام سے ہے"۔ (۳)

مولانا محمد علی مونگیریؒ کے جدامجد سید شاہ غوث علیؒ خود صاحب نسبت بزرگ تھے، جن کی ولائت کی تصدیق مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی نے بھی فرمائی ہے۔ سید شاہ غوث علیؒ سو برس سے زائد عرصہ ہوا مظفرنگر سے کانپور تشریف لائے، اور سکونت پذیر ہوئے، اور شاہ غلام مصطفیؒ کے بعد ان کے جانشیں مقرر ہوئے۔

بچپن میں ان کو فنون سپہ گری سے خاص شغف تھا، جوان ہوئے تو ایک بیگم کی فوج میں ملازمت کرلی اور اچھے عہدے پر فائز ہوئے۔ علوم دینیہ سے پہلے ہی فراغت کر چکے تھے۔ آخر میں شاہ غلام مصطفیؒ کے حکم سے ملازمت چھوڑ کر ان کی صحبت اختیار کی۔ اور ان کے جانشیں ہوئے۔

سید شاہ غوث علیؒ کی طبیعت میں بیحد تواضع اور انکساری تھی، نیز اخفاء حال کا بڑا اہتمام تھا، تمام عمر کسی کو مرید نہیں کیا۔

سلسلۂ نسب

سلسلۂ نسب یوں ہے:۔

(۱) اس مسجد میں مولانا مونگیریؒ نے عرصہ تک درس دیا ہے۔ (۲) مقامات محمدیہ میں سن تعمیر ۱۳۱۲ چھپا ہے جو درست نہیں ہے۔ (۳) مقامات محمدیہ۔ ص:۵

سید محمد علیؒ بن سید عبد العلیؒ بن سید غوث علیؒ بن سید راحت علیؒ سید امان علیؒ بن شاہ نور محمدؒ بن شاہ محمد عمرؒ بن شاہ عاشق محمدؒ بن حاجی الحرمین محمد شاہؒ بن بندگی شاہ عتیق اللہؒ بن شاہ قطب الدینؒ بن حضرت مخدوم ابو بکر چرم پوشؒ بن حضرت شاہ بہاء الحق حبیب اللہؒ ملتانی بن حضرت سید حسنؒ بن حضرت سید یوسفؒ بن حضرت سید جمال الحقؒ بن حضرت سید ابراہیمؒ بن حضرت سید راجی حامدؒ بن سید موسیٰ احمد شبلیؒ بن حضرت سید علیؒ بن حضرت سید محمدؒ بن سید حسنؒ بن ابو صالحؒ بن حضرت سید عبد الرزاقؒ بن حضرت شیخ محی الدین عبد القادر جیلانیؒ....

بہر حال تاریخ اور معلومات جہاں تک رہنمائی کرتی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ:۔

ایں سلسلہ از طلائے ناب است
ایں خانہ تمام آفتاب است

یہ پورا خانوادہ شروع سے آخر تک شریعت و طریقت کی صراط مستقیم پر گامزن رہا اور گم گشتہ راہ اس کی ضیا پوشیوں سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ شیخ عبد القادر جیلانیؒ سے لے کر مولانا محمد علی مونگیریؒ تک یہ سلسلۃ الذہب منقطع نظر نہیں آتا، ہر دور اور ہر زمانہ میں خاندان کی کسی نہ کسی شاخ میں یہ چراغ برابر جلتا رہا، آپ کے اولین اجداد بخارا میں تھے، وہاں سے ملتان آئے، اور پھر ملتان کے بعد مظفر نگر کو یہ دولت حاصل ہوئی، اور اس کے بعد نہ صرف یو، پی اور بہار بلکہ پورے ہندوستان میں تقسیم ہوئی۔ اس خانوادہ کی تاریخ کا یہ آخری اور زریں باب مولانا محمد علی مونگیریؒ کی زندگی سے متعلق ہے جس کی تفصیل اور تشریح آئندہ صفحات میں ملے گی۔

ابتدائی حالات تعلیم اور اساتذہ

۳/ شعبان ۱۲۶۲ھ، ۲۸/ جولائی ۱۸۴۶ء کو کانپور میں ولادت ہوئی۔ والد ماجد کے انتقال کے وقت عمر دو سال (۱) تھی، اس لئے ابتدائی زمانہ آپ کے جد امجد سید شاہ غوث علیؒ کے ساتھ گزارا۔

---

(۱) مولانا ظہور الاسلام فتحپوریؒ کے چند معتقد جو ہندوؤں کے طبقہ کائستھ سے رکھتے تھے، مولانا محمد علیؒ سے اکثر ملتے رہتے تھے۔ اس خاندان کے ایک سن رسیدہ شخص سے میری ملاقات فتحپور میں حال میں ہوئی۔ انہوں نے مجھے اپنی ڈائری دکھائی جس میں مولاناؒ سے ملاقات کا ذکر ہے، اس ملاقات میں مولاناؒ نے اپنے والد کے انتقال کے وقت اپنی ڈھائی سال بتائی ہے۔

قرآن مجید اپنے چچا سید ظہور علیؒ سے پڑھا، اور فارسی کی ابتدائی کتابیں مولانا سید عبدالواحد بلگرامیؒ سے۔ قرآن مجید حفظ کرنا شروع کیا لیکن اکثر بیمار رہا کرتے تھے، اس لئے یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔

درسیات کی تکمیل استاذ الاساتذہ مولانا لطف اللہ علی گڑھیؒ (۱) اور مفتی عنایت احمدؒ کاکوری (۲) سے کی۔ بیشتر کتابیں مولانا لطف اللہؒ سے پڑھیں۔

دس بارہ سال کی عمر میں سید شاہ غوث علیؒ اور سید ظہور علیؒ دونوں کا انتقال ہوگیا۔ گھر میں ۵،۶ افراد تھے اور اب سب کی ذمہ داری ان پر تھی، اس وقت قدرتی طور پر ان کو پریشانی اور فکر پیدا ہوئی، لیکن ایک خاص واقعہ پیش آیا جس سے یہ بات بالکل زائل ہوگئی، یہ قصہ خود ان کی زبانی سنئے:۔

''ہم نے عربی شروع کی، ہمارے ساتھ پڑھنے والوں میں ایک شخص حافظ امام علی بڑے صالح اور ہمارے بڑے دوست تھے۔ ہم ان سے بات چیت کیا

---

(۱) مولانا لطف اللہ علی گڑھیؒ ''استاذ الہند اور استاذ الاساتذہ'' کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ مولانا کی ذات سے ہندوستان میں علم کا جو چشمہ جاری ہوا اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ علی گڑھ میں ۱۲۸۵ھ سے ۱۳۱۲ھ تک کامل ۲۷ برس درس کا فیض جاری رہا۔ اس عہد کا مشکل سے کوئی نامور عالم ہوگا جس نے مولانا سے شرف تلمذ حاصل نہ کیا ہو۔ ان کے مایۂ ناز تلامذہ میں مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے علاوہ مولانا عبدالحق حقانی، مولانا شبلی نعمانی، مولانا ظہور الاسلام فتحپوری، اور مولانا نور محمد پنجابی وغیرہ شامل ہیں۔ اس قدر تبحر علمی اور شہرت کے باوجود طبیعت میں بے حد تواضع وانکسار تھا، مزاج میں بڑا اعتدال اور جامعیت تھی۔ کبھی کسی کی تکفیر نہیں کی۔ ۱۳۳۴ھ میں وفات پائی۔

(۲) مفتی عنایت احمد کاکوروی (م ۱۲۷۹ھ) ہندوستان کے مشہور اور نامور علماء میں ہیں۔ علی گڑھ میں منصب قضا پر سرفراز ہوئے اور تدریسی سلسلہ بھی جاری رکھا، اس کے بعد اکبرآباد میں صدر الصدور بنا کر بھیجے گئے، لیکن اس سے پہلے ہی ۵۷ھ کی بغاوت شروع ہوگئی اور مولانا بھی اسی الزام مین جلاوطن کئے گئے۔ ان کی رہائی بھی عجیب طریقہ سے ہوئی۔ حاکم جزیرہ کو کسی ایسے شخص کی تلاش تھی جو جغرافیہ کی مشہور کتاب ''تقویم البلدان للبلاذری'' کا اردو ترجمہ کر سکے، تاکہ اس کے بعد اس کو انگریزی میں منتقل کیا جا سکے، اس خدمت کے معاوضہ میں ان کو رہا کیا گیا۔ اس کے بعد وہ کانپور آئے اور عبدالرحمٰن خاں مالک مطبع نظامی کی دعوت پر مدرسہ فیض عام قائم کیا۔ تین سال تک اس مدرسہ میں درس دیتے رہے، اس کے بعد حج کی غرض سے تشریف لے گئے، جدہ کے قریب جہاز غرق ہوا، اور اسی حادثہ میں وفات پائی۔ (نزہۃ الخواطر باختصار: ۳۴۴، جلد: ۷)

کرتے تھے اور طلبہ سے زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ ان ہی دنوں خیال آیا کہ گزر اوقات کی تمہاری کوئی صورت نہیں ہے، اور تمہارے ذمہ پانچ عورتیں ہیں، کیونکر بسر اوقات ہوگی۔ یہ خیال بڑھنا شروع ہوا، یہاں تک کہ پڑھنا مشکل ہوگیا۔ حافظ صاحب سے اس کا ذکر کیا، حافظ صاحب نے 'سراج السالکین' دی اور کہا کہ رزق کا بیان دیکھو۔ اس میں پہلے آیات واحادیث سے یہ ثابت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کے رزق کا ضامن ہے اور قسمیں کھا کر وہ ضمانت کرتا ہے، اس کے بعد اس میں یہ لکھا ہے کہ اب ذرا غور کرو کہ اگر کوئی ادنیٰ شخص تمہاری دعوت کسی وقت کردے تو تمہیں اس شخص کی بات پر اس قدر اطمینان ہوجاتا ہے کہ اس وقت کھانے کی تلاش کا تو کیا ذکر ہے گھر میں کھانا پکانے کو منع کردیتے ہو، کسی اور کی دعوت قبول نہیں کرتے، اسی کے قول پر اعتماد کیے بیٹھے رہتے ہو اور تمہارے دل میں ذرا بھی دغدغہ نہیں ہوتا۔ یہاں احکم الحاکمین قادر مطلق قسمیں کھا کر ضمانت کرتا ہے اور تمہیں اس پر اعتماد نہیں ہوتا، اور روزی کی فکر میں اس قدر پریشان ہوتے ہو کہ روزی رساں کو بھول جاتے ہو۔ حضرتؒ فرماتے ہیں:۔ جس وقت یہ بیان دیکھا اسی وقت دل مطمئن ہوگیا اور پریشانی بالکل جاتی رہی اور بدستور تحصیل عربی میں مشغول ہوگئے اور کسی قسم کی پریشانی قلب میں باقی نہ رہی''۔(۱)

اہل حق کی تلاش اور زیارتِ مدینہ کا شوق

اس عمر میں جس میں سوائے درس اور تفریح کے طالب علموں کو عموماً کسی اور چیز کی طرف توجہ نہیں ہوتی، مولاناؒ کے اندر اہل حق کی جستجو اور طلب صادق پورے طور پر موجود تھی۔ خود فرماتے ہیں:۔

''حضرت جدامجد کا انتقال میری صغر سنی میں ہوگیا اور میں تنہا رہ گیا، گھر میں ۵، ۶ عورتیں تھیں اور میں اکثر بیمار رہتا تھا مگر ہمیشہ درویش کا متلاشی (۲)۔ اگر معلوم ہوتا کہ کوئی بزرگ کہیں تشریف لائے ہیں تو فوراً ملنے کی کوشش کرتا، اور سب

(۱) کمالات محمد۔ ص:

(۲) مقالہ مولانا رحمانی۔ ص:۶

کام چھوڑ کر سب سے پہلے یہ کام انجام دیتا۔ مدینہ طیبہ کی زیارت کا شوق اتنا غالب تھا کہ تنہائی میں بیٹھ کر رویا کرتا تھا۔ ایک بار ارادہ کیا کہ مکان وغیرہ فروخت کر کے اور سب کو لے کر چلیں، لیکن مشیت الٰہی کو منظور نہ تھا، ایک درویش صفت بزرگ سے ملاقات ہوئی، اور انہوں نے اس ارادہ سے باز رکھا''۔

''صاحب کمالات محمدیہ'' لکھتے ہیں:۔

''ایک مرتبہ ارشاد ہوا کہ ہم بارہ تیرہ برس یا زیادہ سے زیادہ چودہ برس کے ہوں گے کہ زیارت مدینہ طیبہ اور روضۂ منورہ کا شوق نہایت غالب ہوا، یہاں تک کہ تنہا بیٹھ کر رویا کرتا۔ جناب والدہ ماجدہ یہ دیکھ کر سخت متردد ہوئیں کہ کوئی سامان اور زاد سفر نہیں، گھر میں پانچ عورتیں ہیں اور جانا ہو تو سب چلیں، گھر میں اتنا سامان نہیں کہ ایک آدمی جا سکے، مجبور ہو کر یہ قصد کر لیا کہ رہنے کا مکان فروخت کریں اور چلیں، اللہ رے استغناء اور عالی ہمتی، اس کم سنی میں یہ خیال بھی نہ آیا کہ کسی امیر سے حالت کہہ کر اس سے کچھ کہیں۔ اپنے رہنے کا چھوٹا سا مکان تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں ان کے نثار کرنے کا قصد کر لیا، مگر مشیت ایزدی اس کی خواستگار نہ ہوئی، ہندوستان میں تعلیم و تربیت پا کر وہاں جانا تھا، اس لئے غیبی سامان یہ ہوا کہ اسی عرصہ میں ایک درویش کامل عبداللہ شاہؒ ان کا نام تھا، تشریف لائے۔ حضرت قبلہؒ کی عادت تھی کہ جب کسی درویش کو سنا ملاقات کے لئے پہونچ گئے۔ حضرت قبلہ شاہ صاحب کے پاس تشریف لے گئے۔ بیٹھتے ہی انہوں نے دریافت کیا کہ۔ بابا! تم کو مدینہ طیبہ جانے کا شوق ہے؟ حضرت نے جواب دیا کہ:۔ جی ہاں! شاہ صاحب نے فرمایا:۔ ابھی نہ جاؤ۔ حضرت نے کہا کہ:۔ دل قابو میں نہیں ہے؟ جواب دیا کہ:۔ قابو میں ہو جائے گا! یہ کہتے ہی دل کا اضطراب جاتا رہا''۔(۱)

مدرسہ فیض عام کا پہلا طالب علم

حافظ امام الدین صاحبؒ نے جو سید شاہ غوث علیؒ کے عقیدت مندوں میں تھے، سب

(۱) کمالات۔ ص:۲۸۲

سے پہلے آپ عربی تعلیم کی ترغیب دی، دوسری طرف والدہ ماجدہ برابر ہمت افزائی فرماتی رہیں۔

۱۲۷۷ھ میں جو طلبہ سب سے پہلے مدرسۂ فیض عام میں داخل ہوئے، ان میں سرفہرست مولانا محمد علی مونگیری بھی تھے۔ انہوں نے یہاں دو سال درسیات کی تکمیل میں صرف کیے۔ اور کتابوں کے علاوہ مفتی عنایت احمد صاحب کی مشہور کتاب "علم الصیغۃ" انہوں نے خود مفتی صاحب سے پڑھی۔ اس وقت وہ جس ذوق اور دلچسپی اور محنت وجانفشانی کے ساتھ ان کتابوں کا مطالعہ دیکھتے اور اسباق کی تیاری کرتے تھے، اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے ہوسکتا ہے۔

> "ایک روز مفتی صاحب نے فرمایا کہ کل کا سبق مشکل اور پیچیدہ ہے، مطالعہ ذرا اچھی طرح دیکھ کر آنا۔ چنانچہ اس روز مطالعہ میں بڑی محنت کی، اور الحمد للہ کہ مطلب حل کرلیا جس سے بڑی مسرت ہوئی۔ صبح مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر، کتاب کھول کر عبارت پڑھی، ترجمہ کیا۔ خلاف معمول سبق کے اشکال کا لحاظ رکھتے ہوئے مفتی صاحب نے مطلب خود بیان کرنا شروع کردیا، مجھ کو بڑا صدمہ ہوا کہ آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے، مفتی صاحب نے سلسلۂ کلام منقطع فرماکر رونے کی وجہ دریافت فرمائی، میں نے عرض کیا کہ رات بڑی محنت سے میں سبق کا مطالعہ کیا تھا اور مطلب کو حل کرلیا تھا۔ مفتی صاحب نے تسلی دی اور پھر مطلب سنا، اور بہت ہمت افزا الفاظ فرمائے۔" (۱)

دو سال کے بعد مفتی صاحب حج کے لئے تشریف لے گئے۔ اور ان کے جانشین مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھیؒ ہوئے۔ چنانچہ مولانا کا تعلیمی سلسلہ پوری پابندی، انہماک، اور ذوق وشوق سے جاری رہا۔ کافیہ، شرح مصباح، شرح ملا جامی اور منطق کی بعض کتابیں مولانا سید حسین شاہ (۲) سے پڑھیں اور بقیہ کتابیں مولانا لطف اللہؒ سے۔

---

(۱) مقالہ متعلقہ سوانح از مولانا رحمانی۔ ص:۸۔ (۲) مولانا سید حسین شاہ، مفتی عنایت احمد کاکوروی کے شاگرد اور جلیل القدر عالم تھے۔ مولانا لطف اللہ کے بعد جن کا شمار ہندوستان کے مایۂ ناز مدرسین میں ہے، مولانا سید حسین شاہ کا نام آتا ہے۔

ذوق علم اور ذہانت

ایک خط میں مولانا محمد سہول صاحب کو تحریر فرماتے ہیں:۔

''خیال کیجئے میں شرح ملا پڑھتا تھا اور جناب مولانا سید حسین شاہ مرحوم سے بعض بعض سبق میں تین تین دن گفتگو رہی ہے اور سید صاحب غصہ ہو گئے ہیں۔ مولانا لطف اللہ صاحبؒ سے ہدایہ اور توضیح پڑھتا تھا، اس وقت یہ خاکسار بحثیں کرتا تھا۔ مولانا بعض احباب سے فرماتے تھے کہ:۔ الحمد للہ ہمارے بعض طلبہ سبق میں ایسی عمدہ بحثیں کرتے ہیں کہ تعجب ہوتا ہے۔''(۱)

اس وقت وہ نیچے درجے کی کچھ کتابیں پڑھانے بھی لگے تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی اور مفتی عبد اللطیف صاحب نے بھی ان سے متعدد کتابیں پڑھی ہیں۔ (۲)

اسی زمانہ میں ان کی والدہ صاحبہ کو خیال ہوا کہ ان کا نکاح کر دیا جائے۔ اس وقت ان کی عمر ۲۲ سال تھی، چنانچہ مظفر نگر روانہ ہوئے اور کھتولی سے دو میل کے فاصلے پر محی الدین پور میں جہاں آخر میں ان کے اجداد منتقل ہو گئے تھے شادی کی، اور ۲ سال قیام کیا۔ اس عرصہ میں مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھیؒ کانپور سے علی گڑھ منتقل ہو گئے، اور تدریس کا سلسلہ وہاں سے جاری ہوا۔ یہ مدرسہ جامع مسجد علی گڑھ میں تھا، اور اس کو مولانا لطف اللہ کے استاذ الاستاذ مولانا بزرگ علیؒ (۳) نے جو اپنے وقت کے ممتاز اور نامور عالم تھے، قائم کیا تھا۔

مولانا علی مظفر نگر سے سیدھے علی گڑھ گئے اور بقیہ کتابیں ختم کیں، وہاں بھی اکثر طلبہ ان سے پڑھا کرتے تھے، یہاں کے ماحول سے ان کے علمی ذوق کے نشو و نما میں بڑی مدد ملی۔

سلامت فکر اور طلب حق

زمانۂ تعلیم کے حالات کے مطالعہ سے دو باتیں صاف طور پر نظر آتی ہیں، اور یہی دو

(۱) مقالہ۔ص:۱۰ (۲) مقالہ۔ص:۱۰ (۳) مولانا بزرگ علیؒ معقول اور منقول دونوں میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ مولانا حیدر علی رامپوریؒ کے تلمیذ رشید تھے، حدیث کی سند حضرت شاہ عبد العزیز سے لی تھی، ایک عرصہ تک اکبر آباد میں تدریسی خدمات انجام دیں، پھر علی گڑھ میں عہدۂ قضاء پر فائز ہوئے اور اس کے ساتھ تدریسی سلسلہ بھی جاری رکھا۔ نواب وزیر الدولہ کے عہد میں ٹونک کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے اور بقیہ عمر اسی خدمت میں گزار دی۔ ۱۲۶۲ھ میں وفات پائی۔ (نزہۃ الخواطر، جلد ۷: ص۹۹)

چیزیں ان کی زندگی کا عنوان اور ان کے کارناموں اور علمی ودینی خدمات کا جوہر اور روح ہیں۔

جہاں تک سلامت فکر کا تعلق ہے باوجود اس کے کہ انہوں نے دستور اور معمول کے مطابق وہ تمام علوم حاصل کیے جن کا بیشتر حصہ منطق وفلسفہ پر مشتمل تھا، لیکن ان کا ذہن کبھی اس طلسم میں گرفتار نہ ہوا، اور اس میں کوئی الجھاؤ، پیچیدگی یا کجی پیدا نہ ہوئی جو بعض اوقات معقولات کے طالب علموں میں پیدا ہوجایا کرتی ہے، بلکہ ان کا ذہن سلیم اس سے ہمیشہ متوحش رہا۔

فرماتے تھے کہ قطبی تک معقول رغبت سے پڑھی، جب میبذی شروع ہوئی، تو طبیعت کو اس سے نفرت ہوئی۔ مولانا (لطف اللہ علی گڑھی) نہایت فصاحت سے مطلب کی تقریر کرتے، مگر دل کو سننے کی طرف توجہ ہی نہ ہوتی، آخر کو مولانا سے کہا کہ جناب میبذی نہ پڑھوں گا۔ مولانا کو خیال ہوا کہ مشکل کتاب ہے، شاید سمجھ میں نہیں آتی، فرمایا کہ:۔ ہدیہ سعیدیہ پڑھو۔ آپ نے فرمایا کہ:۔ جناب: میبذی مشکل نہیں معلوم ہوتی، جب طبیعت متوجہ ہوتی ہے تو فوراً مطلب سمجھ میں آجاتا ہے، مگر کیا کروں توجہ نہیں ہوتی، انجام کار یہ سبق چھوڑ دیا۔ (۱)

فلسفہ سے نفرت اور حدیث سے رغبت

یہ بھی فرماتے تھے کہ جس قدر فلسفہ سے نفرت تھی اسی قدر حدیث کی طرف رغبت تھی۔ جس وقت قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کان میں گونجتی تھی عجب لطف آتا تھا۔ عرصہ تک معقول کا سبق نہیں پڑھا، مگر مولانا برابر ترغیب دیا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ ہدیہ سعیدیہ میں شرکت اختیار کی، اور قاضی مبارک شوق سے پڑھتا تھا کہ حضرت قبلہ قدس سرہ (مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ) کانپور تشریف لائے، اور ایسی تقریر کی جس سے پھر دل سرد ہوگیا، اور معقول کی کتابیں اگرچہ ختم کیں مگر پوری توجہ اور شوق سے نہیں۔ (۲)

بہرحال معقول کی کتابیں مولانا لطف اللہ صاحب سے ختم کرنے کے بعد ان ہی

---

(۱) مقامات محمدیہؒ۔ ص:۸ (۲) ایضاً

سے صحاح ستہ بہت اہتمام سے سبقاً سبقاً پڑھیں۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

''حدیث پہلے مولانا لطف اللہ صاحب سے اسی طرح ایک دو ورق کر کے پڑھی جس طرح ہدایہ وغیرہ۔''(۱)

درسیات سے مکمل طور پر فراغت نہیں ہوئی تھی کہ ایک بار پھر اس قسم کی فکر اور وہ پریشانی لاحق ہوئی جس طرح عربی شروع کرنے کے وقت ہوئی تھی، لیکن پھر خود بخود ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حالت ختم ہوگئی اور سکون و اطمینان میسر آیا۔ فرماتے ہیں:۔

''ہم علی گڑھ سے کانپور آئے، اور نکاح ہمارا ہو گیا تھا، مگر علوم سے فارغ نہ ہوا تھا، گھر میں معمول حالت تھی جیسی طلبہ کی ہونی چاہئے، والدہ ماجدہ نے فرمایا: میاں کوئی معاش کی سبیل نکالو کہ تمہارا نکاح اللہ تعالیٰ نے کرا دیا، اولاد ہوگی، بغیر فکر کے کیونکر کام چلے گا۔ والدہ ماجدہ کے کہنے سے ایسا اثر ہوا کہ قلب نہایت پریشان ہو گیا، اور چونکہ واقعی کوئی سبیل معاش کی نہ تھی، اور نہ سر دست کوئی معاش کی راہ سمجھ میں آتی تھی، اس لئے ایسی پریشانی ہوئی کہ بیان نہیں ہو سکتا، کانپور میں حافظ عبد اللہ صاحب مرحوم سے بہت ارتباط تھا، وہ اکثر امراء سے ربط رکھتے تھے، ان سے کہا کہ کہیں نوکری کرا دیجئے؟ انہوں نے نواب لوہارو کے ہاں مبلغ ۳۰ روپیہ ماہوار اور کھانا لڑکا پڑھانے کے لئے ٹھہرایا۔ جب یہ بچت ونر ہو گیا اور حافظ صاحب مرحوم نے جانے کو کہا، اس وقت خیال ہوا کہ اب میں پڑھنے سے رہ گیا، اب کتابیں کیونکر ختم ہوں گی۔ اس خیال کو ترقی ہوئی۔ فرماتے ہیں کہ تنہائی میں بیٹھ کر رونے لگا اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ:۔ اے اللہ! مجھے تحصیل علم سے محروم نہ رکھ، میرے دل کو قابو میں کر دے۔ اس کریم کے فضل نے دستگیری کی، وہاں صرف ایک کرشمہ دکھانا تھا، اسی وقت قلب میں اطمینان ہو گیا، اور نوکری کا خیال بالکل جاتا رہا۔''(۲)

اہل حق کی تلاش

مولانا کو ابتدا ہی سے اہل کی تلاش رہا کرتی تھی اور ان کی طبیعت کو اہل اللہ اور مشائخ سے

---

(۱) مقالہ۔ص:۱۱ (۲) کمالات محمدیہؒ۔ص:۴۸

ایک خاص مناسبت تھی۔ یہ طلب صادق اور یہ ''آتش مستور'' ہمیشہ ان کو بے چین رکھتی تھی اور کسی حقیر چیز پر قانع یا کسی ظاہری طلسم میں گرفتار اور ترغیبات دنیاوی کا شکار ہونے سے باز رکھتی تھی۔

سترہ یا اٹھارہ برس کی عمر کوئی ایسی عمر نہیں ہے کہ اس میں آدمی کو اپنی خامیوں کا احساس ہو، اور وہ اس خلا کو سمجھ سکے جو تعلیم و مطالعہ اور ذہانت و ذکاوت کی بڑی سے بڑی مقدار کے باوجود بھی باقی رہتا ہے، اور جس کو یقین کی طاقت، ایمان کی حرارت اور معرفت کی لذت ہی پر کرسکتی ہے، اور اس خسارہ اور اس کوتاہی کو محسوس کر سکے جس کی تلافی دل کی گرمی اور آنکھ کی نمی کے سوا کسی چیز سے نہیں ہو سکتی۔

آغاز جوانی ہی میں ان کی ملاقات ایک صاحب حال بزرگ حافظ محمد صاحبؒ سے ہوئی۔ انہوں نے مولانا کو اسم ذات کی تعلیم دی۔ اس شغل سے مولانا میں استغراقی کیفیت اور قلب میں گرمی پیدا ہو گئی۔ نمازوں میں بیحد لطف آنے لگا، اور دنیا سے طبیعت بالکل سرد اور بیزار ہو گئی۔ بعد میں چند دوستوں کے مشورہ سے انہوں نے یہ شغل جلد ہی ترک کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے مولانا کرامت علی قادری (۱) کا دامن پکڑا، ان سے استفادہ کی مدت دس ماہ ہے، لیکن ان دس مہینوں میں ان کو مولانا سے بڑا فیض حاصل ہوا۔ اپنی کتاب ''ارشاد رحمانی'' میں مولانا خود لکھتے ہیں:۔

> ''دس مہینے تک ملازمت کا شرف حاصل ہوا، اور پھر آپ کو سفر آخرت پیش آیا، اور کالپی میں جا کر انتقال فرمایا۔ آپ کی برکت، توجہ اور فیض صحبت سے عجیب وغریب حالات پر مجھ پر گزرے، اور حضور علیہ السلام کی عنایت اور بندہ نوازی ایسی ہوئی جس کی نسبت میں بجز اس کے اور کیا کہوں'' ۔
>
> شاہاں چہ عجب گر بنواز ند گدارا (۲)

مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کی خدمت میں

مولانا شاہ کرامت علیؒ کے بعد ان کو دوسرے مرشد اور رہنما کی تلاش ہوئی۔ جذبۂ

---

(۱) مولانا شاہ کرامت علی قادریؒ سلسلہ قادریہ کے بزرگ تھے، ابتدا ہی میں فارس سے ہندوستان تشریف لائے۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے تعلیم حاصل کی تھی، اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کے ساتھ کھیلے تھے، کالپی میں انتقال فرمایا، اور وہیں مدفون ہوئے۔ (۲) ارشاد رحمانی۔ ص:۳۰

اخلاص اور طلب صادق نے ان کو جلد ہی ایک ایسے مرشد تک پہونچادیا، جس کی نگاہ تربیت نے ان کو روحانی بلندی اور کمال کے اس مرتبہ تک پہونچایا جو بعض اوقات طویل مجاہدات اور ریاضتوں کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتا۔ مولانا محمد علی اس حاضری اور ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''مولانا کرامت علیؒ کے انتقال کے بعد مجھے دوسرے رہنما کی ضرورت ہوئی۔ حضرت قبلہؒ اس زمانہ میں کانپور میں رونق افروز ہوا کرتے تھے، اور جناب محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب مالک مطبع نظامی کے مکان پر فروکش تھے، یہ خاکسار سن کر حاضر خدمت بابرکت ہوا۔ اس وقت حضرتؒ دوست محمد عطر فروش کی دُکان پر تشریف فرماتھے۔ جگہ تنگ ہونے کے باعث میں نعلینوں کے قریب بیٹھ گیا۔ آپ نے مکرر اپنے پاس بیٹھنے کو ارشاد فرمایا، میں بہ پاس ادب وہیں بیٹھا رہا۔ اتفاقاً میری حرکت سے لاٹھی گری، اور ایک شیشہ ٹوٹ گیا۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ بڑوں کے کہنا نہ ماننے سے ایسا ہی ہوتا ہے۔ پھر مجھے بغور دیکھ کر فرمایا کہ فلاں بزرگ جو یہاں تھے تم ان کے بیٹے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ:۔ میں ان کا پوتا ہوں!۔ اس صحبت میں زیادہ کچھ کلام کی نوبت نہ آئی۔ پھر میں خاں صاحب موصوف کے مکان پر حاضر ہوا، حضرت قبلہؒ نے دریافت کیا:۔ تم کس کی صحبت میں بیٹھے ہو؟ میں نے عرض کیا:۔ جناب شاہ کرامت علیؒ صاحب کی خدمت میں کچھ عرصہ تک حاضر ہوا ہوں۔ آپ نے حسب معمول سر جھکالیا، اور تھوڑے تامل کے بعد فرمایا کہ ''بڑے شخص تھے'' ایک مرتبہ پھر حاضر ہوا، اس وقت آپ سورہ رحمٰن کا ترجمہ ارشاد فرمارہے تھے، مولوی محب اللہ صاحب مرحوم پانی پتی اور مولوی حافظ عبدالغفار صاحب لکھنوی آپ کے پاس بیٹھے ہوئے سن رہے تھے۔ میں علیحدہ تخت پر بیٹھ گیا۔ اثر بیان سے میرے آنسو جاری ہوگئے۔ آپ نے میری طرف بھینی نظروں سے دیکھا، اور دونوں عالموں موصوفین سے فرمایا کہ:۔ تم انہیں جانتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا کہ:۔ جی ہاں: طالب علم ہیں، مدرسۂ فیض عام میں پڑھتے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ:۔ تم نہیں جانتے۔ اتنا فرما کر پھر ترجمہ فرمانے لگے۔

تھوڑے عرصہ کے بعد ان دونوں صاحبوں سے پھر وہی سوال کیا۔ انہوں نے عرض کیا کہ:۔ ہم تو یہی جانتے ہیں کہ ایک نیک بخت طالب علم ہیں۔ آپ نے پھر فرمایا کہ:۔ تم نہیں جانتے۔ ایک مرتبہ حضرت قبلہؒ بنارس تشریف لئے جاتے تھے اور حسب دستور کانپور میں فروکش ہوئے، مجھے اطلاع نہیں ہوئی، مگر ایک اضطراب پیدا ہوا، میں بے اختیار کھڑا ہو گیا اور مضطربانہ ادھر ادھر پھرنے لگا۔ اتفاقاً راہ میں حافظ موسیٰ صاحب دوست محمد عطر فروش کی دُکان پر ملے، اور انہوں نے حضرت قبلہؒ کے تشریف لانے کا حال بیان کیا۔ میں اس وقت مطبع نظامی گیا۔ جمعہ کا روز تھا، خاں صاحب مالک مطبع نظامی تنہا بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ:۔ میں حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں، آپ بہ نظر عنایت اطلاع کر دیجیے؟ خاں صاحب کوٹھے پر جہاں آپ رونق افروز تھے گئے، اور پھر آ کر کہا کہ:۔ آج جمعہ ہے اس وقت ملاقات نہ ہو گی، بعد نماز جمعہ آنا۔ میں افسردہ ہو کر لوٹ آیا اور جمعہ کی نماز کرنیل محمد زماں خاں کی مسجد میں پڑھی، اس کے بعد خاں صاحب کے ہمراہ خدمت بابرکت میں حاضر ہوا، مگر پہلے سے کچھ لوگ وہاں پہونچ گئے تھے اور آپ انہیں کچھ کتابیں تقسیم فرما رہے تھے۔ تھوڑی دیر خاں صاحب اور میں کھڑے رہے جس وقت آپ نے نظر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا اسی وقت لوگوں سے فرمایا کہ:۔ اب جاؤ انہیں بیٹھنے دو۔ بعض نے بیٹھے رہنے پر اصرار کیا، مگر آپ نے فرمایا کہ نہیں اس وقت جاؤ، سب چلے گئے، میں اور خاں صاحب بیٹھ گئے۔ مجھ سے دریافت فرمایا کہ:۔ تم کیا پڑھتے ہو؟ میں نے عرض کیا ''قاضی مبارک'' ارشاد ہوا: استغفر اللہ، نعوذ باللہ، قاضی مبارک پڑھتے ہو، اس سے حاصل؟ ہم نے فرض کیا کہ تم منطق پڑھ کر قاضی مبارک کے مثل ہو گئے پھر کیا؟ قاضی مبارک کی قبر پر جا کر دیکھو کیا حال ہے، اور ایک بے علم کی قبر پر جاؤ جس کو خدا سے نسبت تھی اس پر کیسے انوار و برکات ہیں، فیضان صحبت سے مجھے اس وقت نیم بے خودی سی تھی۔ اس کے بعد کچھ خاں صاحب سے کلام کیا۔ پھر ارشاد فرمایا کہ:۔ کیا پڑھتے ہو؟ میں نے عرض کیا:۔ ہدایہ۔ کیونکہ میں ان دنوں دونوں

کتابیں پڑھتا تھا۔ اس پر بیع وشراء کے مسئلے دریافت فرمانے لگے، اس وقت میری حالت ایسی متغیر تھی کہ جن مسائل کا میں بے تامل جواب دے سکتا تھا ان کا جواب بہت تامل سے دیا۔ اس اثناء میں حضرت قبلہؒ نے عبدالرحمٰن خاں صاحب سے دریافت فرمایا کہ:۔ تم نے صبح آ کر کہا تھا کہ ایک طالب علم ملنے کو آتے ہیں وہ کون تھے؟ خاں صاحب نے کہا:۔ جناب! یہی تھے۔ ارشاد ہوا کہ:۔ تم بڑے نادان ہو، مجھ سے آ کر کہا کہ ایک طالب علم آتے ہیں، بھلا میں کیا جانوں کون طالب علم ہے، یہ تو ہمارا لڑکا ہے۔ خاں صاحب نے جواب دیا:۔ حضرت! مجھے معلوم نہیں تھا۔ غرضکہ عصر کے وقت تک خاں صاحب اور میں صحبت سے فیضیاب رہے۔ اس وقت تک اگرچہ شرف بیعت مجھے حاصل نہ تھا، مگر یہ عنایت مزدہ تھی حصول نیاز مندی کا۔"

گنج مراد آباد کی پہلی حاضری اور بیعت

اس کے بعد پھر حضرت قبلہؒ کے قدوم میمنت لزوم سے مشرف نہیں ہوا، اور مجھے سلسلہ میں داخل ہونے کا شوق ہوا۔ یہ حاضری اگرچہ بقصد بیعت تھی، مگر مجھے یاد ہوتا ہے کہ دنیاوی غرض بھی اس کے ساتھ تھی، یعنی کسی خاص مقام میں نوکری کی غرض سے سفارش کرانا منظور تھا۔ الحمد للہ کہ وہاں جا کر یہ خیال ہی محو ہو گیا، اور سفارش کرانے کا ارادہ بالکل ہی جاتا رہا۔ شام کو میں وہاں پہونچا تھا اور گھوڑے پر گیا تھا، آپ نے گھاس پہلے ہی خرید کر رکھی تھی۔ صبح کو بعد نماز میں نے بیعت کے لئے عرض کیا، آپ نے قبول فرمایا اور داخل سلسلہ فرما کر بہت دیر تک توجہ دیتے رہے۔ بعد فراغ ارشاد ہوا کہ ہم نے بہت دور تک توجہ دے دی ہے۔ اس کے بعد آپ کھڑے ہو گئے اور خادم کو آواز دی، وہ حاضر ہوا، فرمایا کہ: گھر میں سے ان کے لئے کچھ لے آؤ؟ وہ گیا اور آ کر کہا، کہا ابھی کچھ پکا نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ: پکا کچا جو کچھ ہو لے آؤ؟ وہ گیا اور ڈلیا میں کچھ چنے لے آیا، غالباً ڈھائی سیر ہوں گے۔ مجھ سے ارشاد ہوا کہ تمہارے پاس کوئی کپڑا ہے، میں نے رومال حاضر کیا، آپ نے تین لپیں ان چنوں میں سے بھر کر میرے رومال میں دیں اور ارشاد

فرمایا کہ کہ لو یہ تمہیں دنیا دیتے ہیں کھانے کے واسطے، یہ ارشاد آپ کا مسجد کے در میں تھا، جب آپ لب فرش پہونچے تو خادم سے فرمایا کہ ان کے لئے پان لاؤ۔ میں نے عرض کیا کہ:۔ حضرت! مجھے پان کی عادت نہیں۔ مگر میرے قول کی طرف توجہ نہیں فرمائی اور مکرر خادم سے فرمایا کہ پان لاؤ۔ وہ پان لایا، آپ نے اسے لے کر اپنے منہ مبارک میں لیا اور کسی قدر چبا کر مجھے عنایت فرمایا، اور زبان فیض ترجمان سے یہ لفظ بھی ارشاد ہوئے:۔ لو یہ پان ہے عرفان کا، اسے کھالو' یہ دونوں باتیں معمول کے خلاف تھیں، اس لئے ان دونوں اشاروں کو مولانا روم کے اس شعر کا مصداق کہنا کسی طرح بیجا نہیں ہے:

گفتۂ او گفتہ اللہ بود

گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود(۱)

مولانا محمد علی حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ سے ملاقات کرنے اکثر تنہا جاتے تھے، راستہ میں کوئی ساتھ ہو جاتا تو راہ سے الگ ہو جاتے۔ مقصد یہ تھا کہ تنہائی میں اطمینان کے ساتھ بیٹھ سکیں، اور حضرتؒ کی پوری توجہ حاصل ہو سکے۔

حدیث کی تکمیل

حدیث سے (جیسا کہ اس سے پہلے ذکر کیا گیا ہے) فطری مناسبت تھی۔ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کی صحبت و بیعت نے اس رنگ کو اور گہرا کر دیا۔ اس شغف اور تعلق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اتنے اہتمام کے ساتھ درس حدیث کے باوجود دل کو تسکین نہ ہوئی اور تشنگی کا احساس باقی رہا۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ خواہش اس قدر غالب ہوئی کہ مشہور و نامور محدّث مولانا احمد علیؒ سہارنپوری (۲) (م ۱۲۹۷ھ) کے ہاں تشریف

---

(۱) ارشاد رحمانی۔ (۲) مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ اپنے زمانہ کے نامور اور ممتاز محدث تھے۔ اس عہد میں ان کو وہ مرکزیت اور امتیاز حاصل تھا کہ تکمیل علوم کے بعد درس حدیث اور اجازت حدیث کے لئے اکثر علماء ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، اس عہد کا مشکل سے کوئی ممتاز عالم ہوگا جس نے مولانا سے حدیث کی سند و اجازت حاصل نہ کی ہو۔ ان میں مولانا محمد علی مونگیری اور مولانا شبلی بھی شامل ہیں۔ مولانا نے تعلیم مولانا مملوک علی نانوتویؒ سے، اور سند حدیث شیخ وجیہ الدین سہارنپوریؒ سے حاصل کی تھی۔ پھر حجاز تشریف لے گئے اور شاہ عبدالعزیزؒ کے پوتے شاہ اسحاق دہلویؒ سے صحاح ستہ کی تکمیل کی۔ مولانا کی ساری عمر خدمت حدیث میں گزری، جس میں دس سال صرف صحیح بخاری کی تصحیح و تحشیہ میں صرف ہوئے۔ ۱۲۹۷ھ میں انتقال فرمایا۔

لے گئے اوران کے پاس گیارہ مہینے قیام کر کے صحاح ستہ، مؤطا امام محمد، مؤطا امام مالک پڑھی، اوراول الذکر دو چیزوں کی سند بھی حاصل کی۔

مولانا احمد علی رحمۃ للہ علیہ نے ان کی بڑی عزت اور قدر کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ بصیرت اور فراست ایمانی نے اس بات کو محسوس کرلیا تھا کہ مولانا کے اندر کیا جوہر قابل پوشیدہ ہے ۔

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

مولانا اپنے شاگرد کا ایسا احترام کرتے تھے جیسا کہ ایک شاگرد کسی استاد کا کرتا ہے۔ مصنف ''مقامات'' لکھتے ہیں:۔

''مولانا آپ کی اس قدر عظمت کرتے تھے کہ لوگوں کو تعجب ہوتا تھا، بعد عصر درس سے فارغ ہوکر مولانا مکان نوتعمیر میں جا کر لیٹ جاتے تھے، اور اکثر طلبہ ہمراہ جا کر قریب بیٹھ جایا کرتے تھے، مگر جب حضرت تشریف لے جاتے تو فوراً اٹھ بیٹھتے تھے۔ حضرت نے ایک روز فرمایا کہ جناب میں آپ کا ایک ادنیٰ شاگرد ہوں، سیکڑوں علماء آپ کے شاگرد ہیں، سن میں آپ میرے والد سے زائد ہیں، اس سن میں آپ تمام دن پڑھا کر اس وقت لیٹ جاتے ہیں اور پھر میری حاضری میں اٹھ بیٹھتے ہیں۔ اس کا جواب کچھ آپ نے نہیں دیا، مگر حضرت نے اس وقت کا حاضر ہونا چھوڑ دیا''۔(۱)

اسی زمانہ کا واقعہ ہے مولانا فرماتے ہیں کہ:۔ میں عرصہ سے دو وظیفے فتوح کی غرض سے پڑھا کرتا۔ ایک عمل چہار شنبہ، دوسرا عمل یا منعم جو خاندان برکاتیہ میں مشہور اور معمول بہ ہیں۔ اس وقت بھی ان کے پڑھنے کا معمول تھا، اور نتیجہ بظاہر معلوم ہوتا تھا، یعنی اچھی طرح گزر ہوتی تھی، ایک روز خیال ہوا کہ یہ وظیفہ تو تم اس لئے پڑھتے ہو کہ فتوح ہو، اور کھانے پینے کو کچھ ملے، دیکھنے والے سمجھتے ہیں کہ یاد الٰہی کر رہے ہیں۔ غرض کہ مکر وفریب کی صورت معلوم ہوتی ہے۔ اس روز سے دونوں وظیفے چھوڑ دیئے۔ مگر الحمدللہ اس کے بعد

(۱) مقاماتِ محمدیہ

کسی حالت میں فرق نہیں آیا، اور بدستور عمدگی سے بسر ہوتی رہی۔(۱)

غنائے قلب

فرماتے ہیں کہ:۔ حدیث کے فراغ کے بعد جو نعمت غنائے قلب اور تقویٰ کی اللہ تعالیٰ نے عنایت کی اس کا بیان نہیں ہوسکتا، باوجود یہ کہ ظاہر میں کوئی وجہ معاش نہ تھی، مگر اس قدر اطمینان قلب تھا کہ کسی بادشاہ کو بھی میسر نہ ہوگا۔ وہاں سے لوٹنے کے بعد کسی نوکری کی خواہش دل میں نہ رہی۔ دل میں یہ خطرہ بھی آسان نہ آتا تھا کہ وجہ معاش تو کچھ ہے نہیں، گزر کیسے ہوگی۔(۲)

سہارنپور سے واپس ہونے لگے تو گنج مرادآباد تشریف لے گئے، اور مولانا فضل رحمٰنؒ نے صحاح ستہ، موطا امام مالک اور حصن حصین کی اجازت مرحمت فرمائی۔

اجازت وخلافت

اسی زمانہ میں مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ نے بیعت کی اجازت بھی دی، اور وہ بھی عجیب اور سادے طریقہ سے 'ارشاد رحمانی' میں مولانا لکھتے ہیں:۔

> جب میں رخصت ہونے کی غرض سے حضرتؒ کے ہمراہ مسجد کے اندر سے صحن مسجد میں آیا تو حضرت قبلہؒ میرا ہاتھ پکڑ کر مسجد کے اندر داہنے گوشہ میں لے گئے اور اکڑو بیٹھ کر ارشاد فرمایا کہ:۔ جو کوئی تمہارے پاس آکر بیعت کی درخواست کرے تو خاندان نقشبندیہ اور قادریہ میں مرید کرلیا کرو۔ میں نے عرض کیا کہ:۔ حضرت! میں اس قابل نہیں ہوں! ارشاد ہوا کہ:۔ تمہیں اس سے کیا بحث ہے، جو ہم کہتے ہیں وہ کرو۔ پھر میں نے عرض کیا کہ اس بوجھ کو حضور ہی سنبھالیں، اور خیال رکھیں؟ فرمایا:۔ ہاں۔(۳)

تدریسی خدمات

گنج مرادآباد سے واپسی کے بعد دلاری کی مسجد (کانپور) میں درس دینا شروع کیا۔ ایک سال تک مولانا احمد علیؒ کی صحبت اور درس حدیث نے اور مولانا فضل رحمٰنؒ کی صحبت

---

(۱) مقاماتِ محمدیہؒ (۲) مقاماتِ محمدیہؒ:۹ (۳) ارشاد رحمانی۔ص:۴۷

وبیعت نے جو اثر پیدا کیا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں سے زائد ملنا جلنا ترک ہوگیا، اور زیادہ تر استغراق رہنے لگا۔ دن اور رات کا بیشتر حصہ درس حدیث ذکر وشغل اور مراقبہ میں گزرتا۔ طلبہ کے اصرار اور طلب کا یہ عالم تھا کہ حوائج ضروری اور نماز وغیرہ کے علاوہ فجر سے لے کر عشاء تک سارا وقت درس ہی میں صرف ہوتا، اس کے بعد بھی طلبہ کے ہجوم اور ذوق طلب میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔

اس زمانہ میں مولانا نے نذر لینا بھی چھوڑ دیا، منت واصرار کے بعد بھی قبول نہیں کرتے تھے۔ ایک بار مولانا فضل رحمٰنؒ گنج مرادآبادی کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے دریافت فرمایا کہ:۔ تم کسی کی نذر نہیں لیتے؟ عرض کیا کہ:۔ دل نہیں قبول کرتا۔ فرمایا کہ:۔ یہ ایک شہرت کا موجب ہے ایسا نہ کرنا چاہئے، بلکہ لا رد ولا کد پر عمل کرنا بہتر ہے (یعنی نہ تو کسی کی دی ہوئی شئے کو رد کرے، اور نہ دل میں کسی سے لینے کی خواہش رکھے)۔(۱)

مدرسۂ فیض عام کے مہتمم نے جب درس وتدریس کا یہ نقشہ دیکھا تو اس بات کی کوشش کی کہ مولانا مدرسہ میں درس دیا کریں، لیکن مولانا نے معذرت کی، اور ادھر اصرار شروع ہوا، بہرحال بات اس پر ٹھہری کہ اس کو مولانا فضل رحمٰنؒ کی رائے پر چھوڑ دیا جائے، وہ جیسا فرمائیں ویسا کیا جائے۔ چنانچہ مولاناؒ کو خط لکھا گیا، مولانا کا جو جواب آیا، اس میں یہ لکھا تھا:۔

”درامور شما اختیار شما است، صلاح ما ہمہ آنست کاں صلاح شما است“

اس واقعہ کے بعد مولانا نے مدرسہ ہی کو ترجیح دی۔ چند ماہ وہاں درس دیا ہوگا کہ اس شدید مشغولیت اور محنت کے نتیجہ میں بیمار ہوگئے اور ڈھائی برس تک سخت علیل رہے صحت کے بعد طلبہ نے بہت چاہا مگر ایک سبق بھی آپ نہیں پڑھا سکتے تھے۔ جب شروع کرتے تو دو چار روز کے بعد تنفس ہونے لگتا، یہاں تک کہ ضروری بات بھی نہیں کر سکتے تھے مجبوراً چھوڑنا پڑا۔(۲)

علی گڑھ سے واپسی کے بعد آپ نے اسی مدرسۂ فیض عام میں تقریباً ڈھائی تین سال تک حدیث کا درس دیا تھا اور اس کے بعد سہارنپور کا قصد کیا تھا۔

---

(۱) مقامات۔ ص:۱۴۰ (۲) مقالہ متعلقہ سوانح۔ ص:۱۱

سفر سہارنپور سے پہلے ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ مولانا آل احمد صاحب محدث پھلواری (۱) (مہاجر مدینۂ منورہ م ۱۲۹۶ھ) کانپور تشریف لائے اور دو مہینے تک مسلسل آپ کے مہمان رہے۔ مولانا (آل احمد) نے بخاری شریف کا کچھ حصہ آپ سے سنا، اور بڑی مسرت کے ساتھ بلا طلب حدیث کی سند عطا فرمائی۔

مولانا محمد علی فرماتے تھے کہ بعض صاحبوں کو سند لینے کا بہت شوق ہوتا ہے مگر ہمیں کبھی اس کا خیال نہ ہوا، کیونکہ اگر ہمیں کچھ آتا ہے تو ایک ہی سند کافی ہے، بلکہ ایک تحریر بھی اگر نہ ہو تو لوگ پڑھیں گے اور فائدہ پہونچے گا، کوئی سند دیکھ کر نہیں پڑھے گا۔ اور اگر کچھ نہیں آتا، اور التجا کر کے اور خطوط لکھ کر دنیا بھر سے سندیں منگالیں، بجز اس کے کہ نفس کو فخر ومباہات کا موقع مل گیا، اور ایک قسم کا فریب دنیا کو دینا ہے۔ (۲)

انجمن تہذیب کا قیام

ثقافتی انجمنوں کا قیام جو اس وقت کم از کم حلقۂ علماء میں بالکل نئی بات تھی، اور عام تعلیم یافتہ مسلمانوں میں بھی اس قسم کی انجمنوں کا زیادہ رواج نہیں ہوا تھا، اس طرح ایک انجمن ''انجمن تہذیب'' کے نام سے مولانا نے کانپور میں قائم کی۔ اس کا مقصد علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں صحیح اسلامی افکار کی اشاعت وترجمانی اور ان کے درمیان باہمی اتحاد اور اخوت پیدا کرنا تھا۔ بہت سے لوگوں نے رائے دی کہ اس قسم کی انجمنوں کا قیام کانپور میں ناممکن ہے، لیکن مولانا نے ان باتوں کی کچھ زیادہ پرواہ نہ کی۔ اس انجمن

---

(۱) مولانا آل احمد محدث پھلواری نوجوانی ہی میں ہجرت کر گئے تھے۔ حدیث وفقہ کی تحصیل شیخ محمد بن یحی السنجیطیؒ سے کی۔ شیخ محمد اکرم لاہوریؒ سے حصن حصین کی خاص اجازت حاصل ہے۔ مولانا نے بہت سے ممالک کی سیاحت کی۔ سمرقند، بخارا، کابل، غزنی، کشمیر اور پنجاب کا بار بار سفر کیا۔ اجلہ علماء نے ان سے علم حدیث میں استفادہ کیا۔ ۱۲۹۶ھ میں وفات پائی اور بقیع میں آسودۂ خاک ہوئے (نزہۃ الخواطر، ج:۷، ص:۲) مولانا رحمانی نے اپنے مقالہ متعلقہ سوانح میں لکھا ہے کہ: انہوں نے حدیث شیخ احمد سندھی محدث سے پڑھی، اور شیخ محمد یحی کے علاوہ شیخ عبدالجلیل بن عبدالسلام برادر علامہ سید احمد زینی اور شیخ ارتضی گوپاموی (مہاجر) سے کامل تین سال تک حدیث کا درس لیا اور سند واجازت حاصل کی۔ انہوں نے مولانا کا سنہ وفات ۱۲۹۵ھ لکھا ہے۔ (۲) مقامات ص:۱۴

میں غالباً پہلی بار قدیم طرز کے علماء کے ساتھ وکلاء اور رؤساء بھی شریک ہوئے، اور آغاز میں بہت زور وشور کے ساتھ اس کا کام چلنے لگا۔ مولانا نے اس انجمن میں کوئی عہدہ قبول نہیں کیا، دوسرے لوگ اس کے عہدہ دار رہے، مولانا ان کی ہمت افزائی کرتے رہتے تھے۔ لیکن ان کی دوسری مصروفیات اور مشاغل کے ساتھ یہ کام زیادہ دنوں تک چل نہ سکا اور کام کی رفتار سست پڑ گئی۔ (۱)

ذکر وشغل کے اہتمام اور تصوف کے ذوق ورجحان کے ساتھ اس انجمن کی تاسیس مولانا کی ژرف نگاہی، زمانہ کی نباضی اور وقت شناسی کی دلیل ہے، جس کا مکمل اظہار آخر کار ندوۃ العلماء کے قیام کی صورت میں ہوا، اور مولانا کا یہ ذوق ورجحان اور جامعیت قلب ونظر واضح ہو کر سامنے آ گئی۔

علمی ذوق اور جذبۂ تحقیق

مولانا کا علمی ذوق اور جذبۂ تحقیق ان کی درسی اور تدریسی زندگی دونوں سے عیاں ہے۔ چنانچہ زمانۂ طالب علمی میں مولانا سید حسین شاہؒ سے (جو مدرسۂ فیض عام میں ان کے استاذ اور متبحر عالم تھے) بعض موضوعات پر تین تین روز تک علمی بحثیں ہوئی ہیں، بعض مسائل کی تحقیق کے لئے اکثر لکھنؤ کا سفر کرتے، اور کئی کئی روز قیام کرکے علم کی تشنگی بجھاتے۔

مولانا محمد اسیہول صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> ''میں نے عمر کا اکثر حصہ علم ہی کی خدمت میں گزارا ہے، اور خدا کے فضل سے طالب علمی کے زمانہ ہی سے تحقیق مطالب اور تنقیح مسائل کا شوق رہا ہے۔ بعد ختم فقہی مسائل کی تحقیق کا شوق پیدا ہوا، اس وقت کتابیں موجود نہ تھیں صرف تحقیق کی غرض سے لکھنؤ جاتا تھا اور دس دس پندرہ روز قیام کرکے مولوی عبدالحیؒ صاحب مرحوم سے کتابیں لے کر دیکھتا تھا اور بعد دیکھنے کے مولوی صاحب موصوف سے گفتگو ہوتی تھی۔'' (۲)

---

(۱) مصنف ''کمالات'' نے اس انجمن کا مختصراً ذکر کیا ہے۔ دوسرے ماخذ میں اس کا ذکر یا تو نہیں ہے یا نہ ہونے کے برابر ہے۔ (۲) مقامات۔ ص:۱۴

مولانا لطف اللہ صاحب سے بھی مختلف مسائل پر اسی طرح علمی مذاکرہ اور مباحثہ ہوتا تھا، اور جب تک تشفی نہیں ہو جاتی تھی اس کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

ایک مرتبہ بعض کتابوں کے لئے پٹنہ کا سفر کیا، اور خدا بخش خاں اورنٹیل لائبریری میں بیٹھ کر ان کا مطالعہ کیا۔(۱)

فقہ پر گہری نظر

فقہ سے مولانا کی دلچسپی کا ذکر اوپر گزرا ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لئے لکھنؤ کے وہ سفر کافی شہادت ہیں جو وہ وقتاً فوقتاً کسی مسئلہ کی تحقیق کے سلسلہ میں کرتے تھے اس ذوق ودلچسپی کا فائدہ یہ ہوا کہ اس شعبہ میں ان کی نظر بہت گہری اور وسیع ہوگئی۔ ردعیسائیت کی کوششوں کے ساتھ یہ سلسلہ جاری رہا اس درمیان میں بعض اکابر علماء کو ان سے کچھ اختلاف بھی ہوا لیکن بعد میں صفائی ہوگئی۔ حاجی امداد اللہ صاحبؒ نے مکۂ معظمہ سے مولانا کے نام مکتوب میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے، لکھتے ہیں:۔

> ''مکرر یہ کہ عزیزم مولوی رشید احمد صاحب محدث گنگوہی کو آپ سے رنج ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے سوا اس کے کہ اختلاف بعض مسائل کی وجہ سے آپس میں حجاب ہو گیا ہے جس وقت کہ بدستور سابق خط وکتابت اور آمد وشد جاری ہو جائے گی تو بالکل صفائی ہو جائے گی، مسائل میں صحابۂ کرام وائمہ مجتہدین، علماء محققین رضوان اللہ عنہم اجمعین میں بھی آپس میں اختلاف تھا لاکن اس کی وجہ سے کسی کو ذرہ برابر بھی کدورت نہ ہوئی'' (۲)

مولانا کی ان فقہی آراء کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ تیار ہو گیا، جو ''کتاب المسئلة'' کے نام سے خانقاہ رحمانی میں مشہور ہے۔

میلاد کے مسئلہ پر ایک مرتبہ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ سے گفتگو ہوئی اور مولانا نے فرمایا کہ وہ اس طرح کے میلاد کے خلاف نہیں ہیں جس طرح کا میلاد مولانا لطف اللہ صاحب پڑھتے ہیں۔(۳)

---

(۱)۔مقالہ۔ص:۱۴۰ (۲)مقالہ متعلقہ سوانح بحوالہ الجامعہ۔ص:۲۲۳ (۳)ایضاً۔

مولانا کا کتب خانہ

سہارنپور سے واپسی کے بعد کتابوں کے حصول پر خاص توجہ کی، رفتہ رفتہ ایک بڑا کتب خانہ تیار ہوگیا، مولانا رحمانی اس کتب خانہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''عربی علوم وفنون کی شاید ہی کوئی قابل ذکر کتاب ہوگی جو اس کتب خانہ میں موجود نہ ہو، یہی حال زبان فارسی کے سلسلہ میں ہے۔ اُن باکمال علماء کی رائے ہے جنہوں نے اس کتب خانہ سے استفادہ کیا ہے کہ علومِ اسلامیہ پر بڑے سے بڑا کام اس کتب خانہ میں بیٹھ کر کیا جاسکتا ہے، اور آج بھی علماء آتے ہیں اور اس کتب خانہ میں بیٹھ کر اپنی علمی پیاس بجھاتے ہیں۔ اس کتب خانہ کے متعلق اتنی بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ کم از کم ہندوستان کے مشرقی حصے میں لکھنؤ سے لے کر بنگال کی آخری سرحد تک خدا بخش خاں لائبریری (پٹنہ) اور کتب خانہ ندوۃ العلماء کے سوا اتنا بڑا کتب خانہ موجود نہیں، جو تشنگان علوم کو سیراب کرسکتا ہو'' (۱)۔

مولانا محمد ادریس نگرامی نے مولاناؒ کے ایماء سے تذکرہ علمائے حال'' مرتب کیا تھا۔ مولاناؒ اُن کو اس سلسلہ میں برابر ہدایتیں اور مشورے دیتے، اور مختلف پہلوؤں کی طرف رہنمائی کرتے۔ ایک خط میں ان کو لکھتے ہیں:۔

''آپ کی علالت سے نہایت افسوس ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو شفائے کامل عطا فرمائے، آمین! تراجم میں مولانا لطف اللہ صاحب (ساکن علی گڑھ) کا ترجمہ آگیا یا نہیں؟ اگر ایسے مشہورین کا ترجمہ نہ ہو تو نقص رہ جائے گا، اس لئے ضروری ہے کہ ایسے لوگوں کی طرف خاص توجہ کی جائے۔ مثلاً فرنگی محل تشریف لے جاکر مولوی نسیم صاحب کا حال دریافت فرمایئے اور مولوی عبدالحق صاحب خیرآبادی کا حال بھی۔ غرض اِن حضرات کے تراجم بہت ضروری ہیں۔'' (۲)

اس خط سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کو اس قسم کے علمی کارناموں کا کس قدر اہتمام تھا، اور ان کا ذہن اس موضوع پر کس طرح کام کرتا تھا۔

---

(۱) مقالہ ص:۱۴۰ (۲) الجامعہ رجب ۱۳۵۰ھ

یہ علمی ذوق زندگی کے آخری ایام تک قائم رہا۔ آخر عمر میں کتابوں کے حصول کا شوق بہت غالب آ گیا تھا۔ ہندوستان کے مشہور علمی اداروں سے برابر ربط رکھتے تھے، اور جدید مطبوعات سے باخبر رہنے کی کوشش کرتے تھے۔

باب دوم

ردّ عیسائیت

مولانا نے ردّ عیسائیت میں جو خدمات انجام دیں، اس کا جائزہ لینے سے پہلے مناسب ہے کہ اُن حالات پر نظر ڈالیجائے جن حالات میں مولانا کو ردعیسائیت کا اہم فریضہ انجام دینا پڑا۔

ہندوستان میں تبلیغ عیسائیت کا آغاز

تبلیغ عیسائیت کا آغاز ہندوستان میں ۱۸۱۳ء میں ہوا، جب کہ ولبرفورس ممبر پارلیمنٹ کی کوشش سے ہاؤس آف کامنس میں اس مضمون کا ایک بل پاس ہوا کہ ہندوستانیوں کوعیسائی بنانے کے لئے اگر پادری جانا چاہیں توانہیں اجازت ہے۔

اس بل کا پاس ہونا تھا کہ یورپ وامریکہ سے عیسائی انجمنوں اوراداروں کی طرف سے خاصی تعداد میں پادری اور تبلیغی وفود ہندوستان روانہ ہونا شروع ہوئے اوراس میں برابراضافہ ہوتا رہا۔ ۱۹۰۰ء سے قبل ہی ایک محتاط انداز کے مطابق ان اداروں کے ۴۲ مشن (جن میں ہر مشن ایک وسیع ادارہ تھا) ہندوستان میں قائم ہو چکے تھے۔ یہ ادارے پوری سرگرمی اور ہوشیاری کے ساتھ اپنے کام میں مشغول تھے، اوراس کے لئے ہر قسم کے مؤثر وسائل وذرائع اختیار کرنا اپنا مذہبی، قومی اور سیاسی فرض سمجھتے تھے۔ اگر چہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے ان کوششوں کوقدرتی طور پرنقصان پہونچا، اوران کی مہم کی تیزی وسرگرمی میں فرق آگیا، لیکن دوسری طرف عیسائی فرقوں کے درمیان باہمی رقابت اور جذبۂ مسابقت

کی وجہ سے پادریوں کی آمد بڑھتی گئی۔ مستزاد یہ کہ اختلاف اور تصادم سے بچنے کے لئے انہوں نے ملک کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا تھا، اور اپنے حدود میں رہ کر کام کر رہے تھے۔

ایک مبصر نے ایک فاضلانہ مضمون میں جو ندوہ کے اجلاس بریلی منعقدہ شوال ۱۳۱۶ھ میں پڑھا گیا، اور مولانا محمد علیؒ نے اس کو بہت اہمیت دی، ان حقائق پر روشنی ڈالی ہے اور اعداد و شمار پیش کئے ہیں۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

> ''ان سب فرقوں نے آپس کی رضامندی سے اپنے اپنے مقدور و استطاعت کے موافق کُل ہندوستان اور برہما کو اپنے دین کی اشاعت کے لئے تقسیم کرلیا ہے، اور اپنے اپنے گروہ کے حدود اور وسعت کارروائی پہلے سے تجویز کر لی ہے۔ مثلاً پنجاب میں اسکاٹ لینڈ کا بریزی ٹرین چرچ اور راجپوتانہ اور ہندو ریاستوں میں آئر لینڈ کا رومن کیتھولک، اور ممالک مغربی وشمالی میں زیادہ تر امریکہ کا کیتھولک ڈیسٹ چرچ وغیرہ''۔(۱)

آگے لکھتے ہیں:۔

> ''فقط ایک شاخ یعنی میتھوڈیسٹ ایسکوپل آف امریکہ کی کارروائیوں کا مختصر حال یہ ہے کہ (اس پر اوروں کو بھی خیال کرلینا چاہئے) اس کے پادری تبت کے پہاڑوں کی بلند چوٹیوں سے لے کر ہند کی جنوبی منتہا راس کماری تک اور بلوچستان کے صدر شہر کوئٹہ سے جو انگریزی عملداری کی مغربی حد ہے، جزیزہ نما ملایا کی انتہا سنگاپور تک ۲۰ لاکھ مربع میل کی وسعت میں پھیل ہوئے ہیں اور کوئی قصبہ اور قریہ ہندوستان میں باقی نہیں رہا جہاں اس فرقہ کا مشن نہ پایا جاتا ہو، اور ہر مشن کے متعلق اتنے گرجے اور شفاخانے اور چھاپے خانے اور زمینداریاں اور گرانٹ اور صنعت وحرفت اور زراعت وتجارت کے کارخانے اور مذہبی تعلیم کے مدارس ہیں جن کے شمار سے عقل حیران ہے۔''

انہوں نے صرف مذکورہ بالا شاخ کے اعداد و شمار فراہم کر کے بتایا ہے کہ اس کے ۲۵۰ مشن ہندوستان کے مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں اور پھر ان شہروں کی تفصیل دی ہے اور بتایا ہے کہ کس شہر میں کتنے مشن سرگرم عمل ہیں۔

---

(۱) اجلاس بریلی، مقالہ مولانا شفقت اللہ بدایونی۔ ص:۹۳

عیسائیوں کا طریقۂ کار

یہ مشن ایک طرف تعلیم و ترقی کے نام پر اور دوسری طرف مالی امداد کے ذریعہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لئے پوری قوت سے کوشاں تھے۔ جو لوگ عیسائیت کا شکار ہو جاتے تھے ان کی برابر خبر گیری اور مالی امداد بھی کی جاتی تھی۔ ان کی پالیسی یہ تھی کہ وہ لوگوں کی غربت و افلاس سے فائدہ اٹھا کر ان کی مالی امداد اور تعلیم وغیرہ کی ضمانت کر کے انہیں عیسائیت قبول کرنے پر آمادہ کریں، خاص طور پر وہ یتیم اور غریب اور مفلس طبقہ کے بچے جن کے پاس کھانے اور کپڑے کا بھی مناسب انتظام نہیں ہے۔ سرسید احمد خاں نے رسالہ ''بغاوت ہند'' میں ۱۸۳۷ء کے قحط کا ذکر کرتے ہوئے اس پر روشنی ڈالی ہے:۔

> ''۱۸۳۷ء کی قحط سالی میں جو یتیم لڑکے عیسائی کئے گئے وہ تمام اضلاع مغربی و شمالی میں ادارہ گورنمنٹ کے ایک نمونہ گنے جاتے تھے کہ ہندوستان کو بھی اس طرح پر مفلس اور محتاج کر کر کے اپنے مذہب میں لے آئیں گے''۔(۱)

گورنمنٹ مشنریوں کی پوری امداد کرتی تھی اور اُن کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہونچاتی تھی، اس کی وجہ سے پادریوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے تھے، اور وہ بے خوف و خطر ہو کر سب ہندوستانیوں کو عام طور پر اور مسلمانوں کو خاص طور پر عیسائی بنانے کے لئے سرگرم عمل تھے۔ حکومت کی پشت پناہی اور حوصلہ افزائی کی نوعیت یہ تھی کہ بعض قوانین ایسے بنائے گئے جن سے عیسائیت کی تبلیغ میں مدد ملے۔ مثلاً ۱۸۵۸ء کے ACT XXi کے مطابق مذہب تبدیل کر دینے کے بعد بھی ایک شخص موروثی جائداد میں حقدار رہتا تھا۔ ان حالات میں جب پادری ای ایڈمنڈ نے وہ خط جاری کیا جس میں لکھا گیا تھا کہ:۔ اب تمام ہندوستان میں ایک عملدار ہوگئی، تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی، ریلوے سڑک سے سب کی جگہ کی آمد و رفت ایک ہوگئی، مذہب بھی ایک چاہئے، اس لئے مناسب

---

(۱) رسالہ ''بغاوت ہند''۔ ص:۱۶

ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ''۔(۱)

غرض کہ لڑکیوں کے لئے مدارس، بچوں کے لئے تعلیم و تربیت گاہیں، مالی اعانت، اخبارات و رسائل، تبلیغی وفود ہر طرح سے اس بات کی کوشش تھی کہ پورا ملک عیسائی ہو جائے۔

سر چارلس ٹریلویلین آئی، سی، ایس نے جو کونسل کے ممبر تھے، اور بعد میں گورنر بھی ہو گئے تھے، ایک موقع پر ان خیالات کا اظہار کیا:۔

''میرا یقین ہے کہ جس طرح ہمارے بزرگ کُل کے کُل ایک ساتھ عیسائی ہو گئے تھے، اسی طرح یہاں بھی سب کے سب ایک ساتھ عیسائی ہو جائیں گے، ملک میں مذہب عیسوی کی تعلیم بلاواسطہ پادریوں کے ذریعہ سے اور بالواسطہ کتابوں، اخباروں اور یورپینوں سے بات چیت وغیرہ کے ذریعہ نفوذ کرے گی حتی کے عیسوی علوم تمام سوسائٹی میں اثر کر جائیں گے، تب ہزاروں کی تعداد میں عیسائی ہوا کریں گے۔''(۲)

پیغام محمدیؐ میں اخبار نور الانوار مطبوعہ ۲۳راگست ۱۸۹۰ء کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

''دیسی پادریوں کے علاوہ جن کا کوئی شمار ہی نہیں، صرف نوسو ولائتی پادری تھے جو بہت تندہی کے ساتھ تبلیغ میں مصروف تھے، اس کے علاوہ ایک مکتی فوج تھی جس کے ۸۰ دستے ان کی پشت پناہی اور امداد کرتے تھے اور ان کے کام میں ہاتھ بٹاتے تھے''۔

اس زمانہ میں عیسائیوں نے جو طریقۂ کار اختیار کیا تھا اور جتنی ہوشمندی اور باخبری کا ثبوت دیا تھا اور اس کے مقابلہ میں مسلمان علماء نے باستثناء چند (۳) کے جس غفلت اور بے تعلقی کا مظاہرہ کیا تھا اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر کوئی مؤثر شخصیت سامنے آئی اور مشنریوں کی سرگرمیاں اسی طرح جاری رہیں تو نئی نسل کے دین و ایمان کو زیادہ عرصہ تک محفوظ رکھنا ناممکن ہوگا۔

مشنری سوسائیٹیوں نے جو ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی تھیں اس بات کا عہد کیا تھا کہ ان کو تمام مسلمانوں اور ہندوؤں کو عیسائی بنا کر دم لینا ہے۔ انہوں نے ہندوؤں

---

(۱) پروفیسر خلیق احمد نظامی، رسالہ ''العلم'' کراچی (جلد ۹، شمارہ ۳) (۲) تاریخ التعلیم، از سید محمود۔ ص: ۶۹
(۳) جن میں مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان کا تذکرہ آگے آتا ہے۔

کے لئے الگ پادری مقرر کئے تھے اور مسلمانوں کے لئے علیحدہ۔ ان پادریوں کے اسٹاف میں مقامی عیسائی بھی ضرور شامل کئے جاتے تھے۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ جس حلقہ اور جس فرقہ میں وہ کام کریں اس کے سب کمزور پہلو ان کی نظر میں ہوں، اور اس کے مسائل اور ذہنی ساخت سے بھی وہ اچھی طرح واقف ہوں۔ (۱)

اس کے علاوہ انہوں نے اس طرز پر تاریخیں مرتب کروائیں کہ ہندوؤں کے دلوں پر مسلم بادشاہوں کے تعصب اور ظلم وسفاکی کا ایسا نقش قائم ہو کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان سے بددل اور بدظن ہو جائیں۔ خود مسلمانوں کو اپنے آباء واجداد کے اس مذہبی تعصب ونفرت کے مقابلہ میں انگریزوں کی نام نہاد جمہوریت زیادہ پرکشش اور دلآویز معلوم ہو، اور ان کو اپنی تاریخ کے مطالعہ اور اپنی زندگی کی آزادانہ تشکیل سے کوئی دلچسپی باقی نہ رہ جائے۔

اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ:۔ ہنری ایلیٹ نے جس کی تاریخ ہند کی آٹھ جلدیں گزشتہ ۷۵ سال سے ہماری ساری چھوٹی بڑی تاریخوں کا ماخذ رہی ہیں، حکومت کو لکھا کہ اگر اس کی مرتب کی ہوئی تاریخ ہند شائع کر دی گئی تو ہندوستان میں ساری قومی تحریکیں خود بخود سرد پڑ جائیں گی۔ (۲)

اپنے اشاعتی پروگرام میں انہوں نے دو چیزوں کی طرف توجہ دی، ایک یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نوجوانوں کے دلوں میں مختلف شبہات پیدا کئے جائیں اور آپ کی نبوت کو (نعوذ باللہ) مشکوک اور باطل ثابت کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ سلاطین اسلام پر ظلم وسفاکی، تنگ نظری، اور تعصب اور نفس پرستی اور عیاشی کے الزامات لگا کر اسلامی تاریخ کو جہاں تک ممکن ہو داغدار بنایا جائے، اورنگ زیب اور دوسرے مسلمان بادشاہوں کے خلاف جو مہم چلائی گئی اور تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا، یہ دراصل اس سوچی سمجھی اسکیم کا ایک جزو تھی جو اس زمانہ میں پوری قوت سے چلائی جا رہی تھی۔

---

(۱) مولانا شفقت اللہ بدایونی نے ۱۹۰۱ء میں مولانا سید عبدالحی کو ایک خط لکھا تھا، اس خط سے عیسائیت کی تبلیغ اور طریقہ کار پر روشنی پڑتی ہے یہ خط مجموعہ خطوط قلمی میں محفوظ ہے۔ یہ معلومات اسی سے حاصل ہوئیں۔

(۲) پروفیسر خلیق احمد نظامی، رسالہ ''العلم'' کراچی (جلد ۹، شمارہ ۳)

ان خیالات کی اشاعت اتنے زور وشور سے ہوئی تھی کہ مسلمانوں کا ذہین طبقہ بھی جو کالجوں اور اسکولوں میں پڑھتا تھا، سخت ذہنی انتشار اور شکست خوردگی سے دوچار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب مولانا شبلیؒ کی کتاب ''اورنگ زیب'' شائع ہوئی تو مسلمانوں کے چہرے فرط مسرت سے کھل اٹھے اور معلوم ہوا کہ ان کو مدافعت کے لئے ایک کارگر ہتھیار مل گیا ہے۔

کتب خانہ اسکندریہ کے متعلق مستشرقین اور پادریوں کا اعتراض تھا کہ مسلمانوں نے اپنی علم دشمنی اور مذہبی جنون کی وجہ سے اتنے بڑے علمی ذخیرہ کو تباہ کردیا۔ جب مولانا شبلیؒ نے ''کتب خانہ اسکندریہ'' لکھی اور اس دعوے کی مدلل طور پر تردید کی، تو مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئیں، اوران کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ان کے چہرے کا بدنما داغ ڈھل گیا ہے۔ جزیہ کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ یہ ایک ظالمانہ ٹیکس ہے جو اقلیت کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لگایا جاتا ہے۔ مولانا شبلیؒ نے "الجزیة فی الإسلام" لکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ یہ ٹیکس دراصل معاوضہ ہے ان حقوق کا جو اسلامی حکومت ان غیر مسلموں کو عطا کرتی ہے۔ مشن کی کامیابی اور پروپیگنڈے کی یہ صرف ایک مثال ہے اور صرف ایک شعبہ سے متعلق ہے۔

منشی صفدر علی اور عماد الدین

اس زمانہ میں منشی صفدر علی اور پادری عماد الدین (۱) کی کتابیں اور رسائل خاص طور سے بڑے مقبول ہورہے تھے، اخبارات میں بھی ان کے مضامین کی اشاعت خوب ہورہی تھی۔ کلیسا کا یہ قدیم نعرہ تھا کہ جب تک قرآن مجید موجود ہے مسلمانوں پر فتحیاب ہونا مشکل ہے۔ چنانچہ ان دونوں نے نبوت محمدیؐ اور قرآن مجید کو خاص طور پر اپنا ہدف

---

(۱) صفدر علی کا زمانہ ارتداد ۱۸۶۵ء ہے۔ (مقام جبلپور) اور عماد الدین کا ۱۸۶۶ء ہے (مقام امرتسر) صفدر علی نے ''نیا زمانہ'' لکھ کر مسلمانوں میں تبلیغ مسیحیت کی، اور عماد الدین نے کتابوں پر کتابیں (اور وہ بھی بدزبانی کے ساتھ) اسلام کے خلاف لکھ کر مسیحیوں میں خوب نام پیدا کیا۔ کلکتہ اور لاہور میں پادری کے عہدہ پر فائز رہے۔ کنٹربری کے لاٹ پادری نے ڈاکٹر آف ڈیوی نٹی (علامہ الٰہیات) کی ڈگری دے کر ان کا اعزاز بڑھایا ۱۹۰۰ء تک زندہ رہے۔
صدق جدید ۱۹ جولائی ۱۹۶۳ء بحوالہ (PEOPLE OF THE MOSQUE) از بیون جونس۔

بنایا۔ ۱۲۸۹ھ اور اس کے بعد کے سالوں میں ان دونوں پادریوں کو بہت کامیابی حاصل ہوئی اور بکثرت مسلمان اس کا شکار ہونے لگے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی (۱) (م ۱۳۰۹ھ) کے بعد ایسا کوئی شخص نظر نہ آتا تھا جو اس فتنہ کو ختم کرنے کے لئے میدان میں آئے، اور اپنی قوت ایمانی، وسعتِ علم، اور زورِ استدلال کے ذریعہ ان مشنریوں کی علمی بے وقعتی اور بے بضاعتی ثابت کرے، اور ان کی غلط بیانیوں اور افترا پردازیوں کا پردہ چاک کرے، یہ سعادت بھی مولانا محمد علی مونگیریؒ کے حصے میں آئی، اور حق یہ ہے کہ مولانا نے بہت کامیابی اور خوبی کے ساتھ ان پادریوں کے اعتراضات کے جواب دیئے، اور ضعیف العقیدہ مسلمانوں کے شکوک وشبہات کو رفع کیا۔

ردّ عیسائیت کے سلسلے میں مولانا کی جدوجہد کا آغاز

اس خطرہ کی طرف توجہ مولانا کو ایک خاص واقعہ سے ہوئی، جس وقت وہ علی گڑھ میں مولانا لطف اللہ صاحبؒ سے تحصیل علم حدیث میں مشغول تھے، اور بعض طلبہ کو پڑھاتے بھی تھے۔ اس وقت انہوں نے ایک خواب دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:۔ ''جاؤ یہ وقت بیٹھنے کا نہیں جہاد کرو''۔

مصنف ''کمالات'' نے لکھا ہے:۔

> ''اس خواب کے بعد ہی یہ واقعہ پیش آیا کہ اسی مدرسۂ علی گڑھ میں ایک طالب علم نے جو آپ سے مختصر معانی وغیرہ پڑھتا تھا اس نے پادری عماد الدین اور کرسٹان کی کتابیں دیکھ لیں اور کچھ شبہات مقدس مذہب اسلام کی طرف سے اس کے قلب میں آ گئے، اور وہ طلبہ سے کہنے لگا۔ یہاں تک اُسے لغزش ہوئی کہ ایک روز وہ جامع مسجد میں بیٹھ گیا اور طلبہ سے کہا کہ میرے سوالات کا تشفی بخش جواب دو۔ اس وقت دو

---

(۱) مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے عیسائیت کے بڑھتے ہوئے فتنہ کی جس طرح سرکوبی کی، اور اس شعبہ میں جو اہم ترین خدمات انجام دی وہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا ایک روشن ورق ہے۔ ازالہ الاوہام، ازالۃ الشکوک اور احسن الحدیث کے علاوہ ان کی کتاب اظہار الحق بے حد مقبول ہوئی، اور ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی اس کی اشاعت ہوئی۔ فرانسیسی، انگریزی، جرمنی، اور ترکی میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ مولانا مکہ معظمہ ہجرت فرما گئے تھے، اور تاحیات وہیں رہے۔ (وفات ۱۳۰۹ھ)

طالب علم جواس مدرسہ میں بہت ممتاز تھے اس سے گفتگو کرنے لگے۔ قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت میں گفتگو تھی۔ عمادالدین نے جو شبہات کئے تھے وہی وہ کرتا تھا یعنی اس نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ بڑے فصیح تھے، ان کا دیوان نعوذ باللہ قرآن کے مثل ہے۔ مقامات حریری کی عبارت (نعوذ باللہ) اس سے اچھی ہے۔ مسیلمہ نے بھی ایک کتاب قرآن شریف کے مقابل لکھی تھی، اسے لاکھوں اہلِ عرب نے مان لیا تھا۔ طلبہ بحث کررہے تھے مگر کوئی شافی اور مسکت جواب نہیں دے رہے تھے، گفتگو ہورہی تھی کہ ہمارے حضرت قبلہ تشریف لائے اور اُن طلبہ سے فرمایا کہ ذرا آپ ٹھہر جائیں مجھے کچھ کہنے دیں۔ وہ دونوں صاحب خاموش ہوگئے۔ آپ نے اُس طالب علم سے فرمایا کہ:۔ قرآن مجید عربی زبان میں ہے، ہم اور تم اور نہ عمادالدین عربی کے ایسے ادیب ہیں.... اس لئے اس پر ایسے شخص کی شہادت ہونا چاہئے جو عربی کا بڑا ادیب ہو، اور جس کی فصاحت و بلاغت کو طرفین نے مان لیا ہو۔ اب قرآن مجید کا بے مثل ہونا اور مقامات حریری وغیرہ کا قرآن مجید کے مثل نہ ہونا تو ہم ایسے حضرات کی شہادت سے ثابت کرتے ہیں جن کا کامل ادیب ہونا تم اور عمادالدین مان چکے ہو، اور تم مسیلمہ کی کتاب کا بے مثل ہونا کسی ایسے ادیب کی شہادت سے پیش کرو۔ حضرت قبلہ نے فرمایا کہ عمادالدین حضرت علیؓ اور صاحب مقامات کو بہت بڑا افصیح و بلیغ کہتا ہے اور ان کے دیوان اور ان کی کتاب کو قرآن مجید سے زیادہ فصیح کہتا ہے، یہ سب فصحاء جن کی فصاحت تمہیں مسلّم ہے، قرآن مجید کے بے مثل ہونے پر ایمان لائے ہوئے ہیں اور اپنی کتابوں کو اس کے نزدیک ہیچ سمجھتے ہیں، پھر اب تمہیں ماننے میں کیا عذر ہے؟ وہ طالب علم خاموش ہوگیا۔ تھوڑے تامل کے بعد اس نے کہا کہ اب میرے شبہات کا جواب ہوگیا اب میری تسلی ہوگئی، اب اگر تثلیث کے بطلان پر کچھ عقلی دلائل قائم کرکے مجھے دکھادیجئے تو میرا دل بالکل صاف ہوجائے گا؟۔ آپ نے فرمایا:۔ استفسار (۱) دیکھو! اس نے کہا:۔ میں نے دیکھی ہے، اس سے تسلی نہیں ہوئی۔ حضرت قبلہ نے تعطیل کے روز بیٹھ کر ۹ یا ۱۰ دلیلیں لکھ کر اسے دیں وہ بہت خوش ہوا، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی بدولت اس کے ایمان کو قائم کردیا۔ (۲)

---

(۱) یہ کتاب مولانا آل حسن صاحب نے میزان الحق اور تحقیق دین حق کے جواب میں لکھی ہے۔ عیسائیۃ کے رد میں جو بہترین کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں یہ بھی شامل ہے۔ (۲) کمالات محمدیہ۔ ص: ۱۳۴ و ۱۳۵

منشور محمدیؐ

ردعیسائیت کا آغاز مولانا کی اس گفتگو سے ہوا، اور اس کے بعد پے در پے کامیابی نصیب ہوئی۔ ۱۲۸۹ھ میں انہوں نے اس مقصد کے لئے کانپور سے ایک اخبار "منشور محمدیؐ" جاری کرایا، اور اس میں عیسائیت کی تردید اور ان کے عقائد کے ابطال میں مضامین شائع کرنا شروع کئے، لیکن پادریوں نے ان میں سے کسی ایک مضمون کا جواب دینے کی جرأت نہیں کی۔ مولانا اس اخبار کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب کتاب "آئینہ اسلام" میں لکھتے ہیں:۔

> "اخبار منشور محمدیؐ میں اکثر مضامین چھپے ہیں جن کو مشتہر ہوئے نو دس برس کا عرصہ ہوتا ہے، مگر آج تک نہ تو منشی صفدر صاحب نے ان کے جواب الجواب میں قلم اٹھایا، اور نہ کسی اور پادری نے۔ (۱)

یہ اخبار ۴، ۵ سال تک گرانقدر خدمات انجام دینے کے بعد بند ہوگیا، یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا محمد علیؒ، محدث زمانہ مولانا احمد علی سہارنپوریؒ کے ہاں تکمیل حدیث کے لئے گئے ہوئے تھے اور مناسب طریقہ پر اس کی نگرانی اور انتظام دشوار تھا۔

اس اخبار سے جہاں یہ فائدہ ہوا کہ مسلمان، مشنریوں کے دعووں کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوگئے وہاں ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علماء اور اہل دین میں اس خطرہ کا احساس پیدا ہوگیا، اور متعدد اصحاب علمی طور پر اس مہم میں شریک ہوگئے۔

اس اخبار کے ذریعہ ان دونوں (منشی صفدر علی اور عماد الدین) کو مناظرہ کی بھی دعوت دی گئی لیکن ان کی طرف سے اس کے جواب میں خاموشی تھی، بار بار دعوت کے بعد بھی انہوں نے سامنے آنے کی جرأت نہ کی، اس کا اثر نفسیاتی طور پر مسلمانوں پر بہت اچھا پڑا اور وہ مسلمانوں جو مذبذب ہوگئے تھے ان کے قدم پھر جم گئے۔

مولانا محمد علی نے اس اہم کام کے لئے اور بہت سے لوگوں کو تیار کیا اور ان کی رہنمائی کی، ان میں سے بعض حضرات نے اس سلسلہ میں امتیاز بھی حاصل کیا اور بہت کامیابی کے ساتھ عیسائیت کی تردید کا فرض انجام دیا۔

---

(۱) آئینہ اسلام ص:۱ حاشیہ

عجیب بات ہے کہ جس طرح مولانا رحمت اللہ کی تائید کے لئے اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر وزیر خان کو پیدا کر دیا اور انہوں نے پادری فنڈر کو خود ان ہی کے بیانات اور تحریروں سے ملزم ثابت کیا، اسی طرح مولانا محمد علی کے لئے اللہ تعالیٰ نے شیخ مولا بخش کو کھڑا کر دیا اور انہوں نے پادری آئزک فیلڈ بریو کا زبردست مقابلہ کیا۔ شیخ مولا بخش کے تبحر علمی اور وسعت معلومات کا اندازہ ''مراسلات مذہبی'' کی ان دو جلدوں سے ہوسکتا ہے جو پادری مذکور سے مناظرہ پر مشتمل ہیں۔(۱)

مراسلات مذہبی میں شیخ مولا بخش نے اس بات کا صاف اعتراف کیا ہے کہ جو کچھ ہے سب مولانا کا فیض اور برکت ہے۔ اس کے آگے لکھتے ہیں کہ:۔ مولانا محمد رحمت اللہ کیرانویؒ کے بعد علماء میں سے بجز مولانا ممدوح کے کسی کو کامل توجہ اس طرف نہیں ہوئی۔ مولانا ممدوح کی تحریر میں بڑی خوبی یہ ہے کہ جواب تحقیقی ایسی عمدگی اور مہذبانہ طور سے ہوتا ہے کہ ہر ایک صاحب حق کو اس سے کامل تسلی ہو جاتی ہے۔ اس پُر آشوب زمانہ میں مولانا کی ذات بابرکات مغتنمات سے ہے۔(۲)

کانپور میں یتیم خانہ کا قیام

عیسائیوں کا دوسرا میدان، جہاں ان کو سو فیصدی کامیابی کی امید تھی، وہ یتیم، لاوارث اور غریب بچے تھے، جن کے قیام وطعام اور تعلیم کا بندوبست کر کے بہت آسانی کے ساتھ عیسائی بنایا جاسکتا تھا، اس لئے ضرورت تھی کہ ایسے یتیم خانے اور مکاتب قائم کئے جائیں جہاں ان بچوں کو داخل کر کے ارتداد سے بچایا جاسکے۔ اس مقصد سے مولانا نے کانپور میں جہاں اس زمانہ میں متعدد عیسائی مشن کام کر رہے تھے(۳) یتیم خانہ اسلامیہ کی سنگ بنیاد رکھی، جس میں مسلمان بچوں کو تعلیم کے ساتھ صنعت وحرفت سکھانے

(۱) اس کتاب میں انجیل کی تحریف پر ۱۲۶ ایسی دلیلیں دی گئی ہیں جن کا جواب عیسائی نہیں دے سکے، پھر قرآن مجید کی صحت، اثبات نبوت محمدیؐ، اور ابطال تثلیث وغیرہ پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ۱۸۸، ایسی کی فہرست بھی شامل ہے جو مختلف زمانوں میں لکھی گئیں اور جن کا جواب عیسائیوں نے ابھی تک نہیں دیا۔ یہ کتاب سب سے پہلے ۱۳۰۵ھ میں شائع ہوئی۔ میرے پیش نظر جو نسخہ ہے وہ ۱۳۲۱ھ کا چھپا ہوا ہے۔(۲) مراسلات مذہبی۔ ص:۳ (۳) مولانا شفقت اللہ بدایونی نے اجلاس بریلی میں جو اعداد وشمار پیش کئے تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عیسائیوں کے نو مختلف مشن کانپور میں کام کر رہے تھے۔

کا بھی انتظام تھا۔ مولانا کو اس کا جس قدر اہتمام تھا اس کا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے جو اس زمانہ میں مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کو لکھے گئے۔

قرآن مجید پر عیسائیوں کے ایک اعتراض کا جواب

پادری قرآن مجید پر یہ اعتراض کرتے تھے کہ حضرت عثمانؓ سے پہلے قرآن مجید کی کوئی خاص ترتیب نہ تھی، اور اس کا کوئی یقینی اور قابل اعتماد نسخہ موجود نہیں تھا۔ اتنے زمانہ کے بعد اس کی جمع و ترتیب کی نوبت آئی، اس لئے یہ کہنا کیسے درست ہوسکتا ہے کہ اس کا ایک حرف اور ایک شوشہ بھی محرف نہیں ہے۔ بعض وہ مسلمان جو مغربی تہذیب سے مرعوب تھے وہ بھی اس قسم کے خیالات رکھتے تھے اور ان پادریوں کے اعتراضات کو بہت اہم سمجھتے تھے۔ انہیں سب حالات کے پیشِ نظر مولانا نے اس مسئلہ کی تحقیق کر کے ایک اہم رسالہ "البرہان لحفاظ القرآن" کے نام سے لکھا، یہ رسالہ تحفۂ محمدیہ کے پریس میں طباعت کے لئے دیا گیا لیکن افسوس کہ وہاں اس کو مسودہ تلف ہوگیا، اس کے بعد ایک صاحب نے مولانا سے اسی موضوع پر کچھ استفسارات کئے اور مولانا نے ایک مفصل مکتوب میں (جو مکاتیب محمدیہ حصہ اول میں موجود ہے) اس پر بہت محققانہ اور مبصرانہ طریقہ پر سیر حاصل بحث کی۔ یہ مکتوب اپنے مواد و مشتملات، تاریخی تحقیق، اور استدلال کے لحاظ سے قرآن مجید کے ہر طالب کے لئے قابل مطالعہ اور لائق استفادہ ہے۔ ذیل میں اس کا ایک ٹکڑا دیا جاتا ہے جو "مصحف صدیقی" کی ترتیب سے متعلق ہے اور اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ نہ صرف عہد عثمانی میں بلکہ عہد صدیقی میں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن مجید انتہائی محتاط قابل اعتماد و یقینی طریقہ پر سینوں اور سفینوں دونوں میں محفوظ تھا، اس کی ایک ایک آیت کی کتابت بھی ہوچکی تھی اور وہ مختلف اجلۂ صحابہ کے پاس علیحدہ علیحدہ موجود تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان تحریر شدہ اجزاء کو جمع کر کے اپنے سامنے رکھا، اور اجلہ صحابہ و حفاظ کے ایک منتخب ترین مجمع نے بالاتفاق اس کی تصدیق کی، اس کی تفصیل مولانا کی زبان سے سنئے:۔

"اس کا ثبوت کافی طور سے کتب احادیث اور تواریخ میں موجود ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب پندرہ بیس سے کم نہ تھے، اسد الغابۃ وغیرہ

ملاحظہ ہو۔ یہ بھی ثابت ہے کہ آخر میں حضرت زید بن ثابتؓ زیادہ لکھتے تھے۔
حضرت زیدؓ کے بیٹے خارجہؓ بیان کرتے ہیں کہ کچھ لوگ اس کی نسبت دریافت کرنے آئے تو میرے والد نے جواب دیا کہ میں کیا بیان کروں، مختصر یہ ہے کہ میں کا پڑوسی تھا اس لئے آپؐ کا معمول تھا کہ آپؐ پر وحی آتی تھی مجھے بلا بھیجتے، میں آ کر لکھ دیا کرتا۔ یہ بھی یاد رہے کہ یہ لکھا ہوا ایسا نہیں ہوتا تھا کہ اس میں کسی وقت غلطی کا شبہہ ہو سکے کیونکہ کاتب وحی لکھ کر اس کو سناتے تھے اور بار بار سناتے تھے، تا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو الفاظ کی پوری صحت ہو جائے اور اس کے معنی اور مطلب بھی بخوبی سمجھ میں آ جائیں، قرآن کے یہ لکھے ہوئے ٹکڑے اور پرچے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے اور سلطنت سے زیادہ گراں بہا جانتے تھے، غرضکہ اس طرح تمام قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوا دیا تھا۔
حضور انورؐ کے عہد میں قرآن مجید کا لکھا ہوا موجود ہونا بعض تفاسیر اور کتب احادیث میں تو مصرح ہے ہی، خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کی خبر دی ہے جہاں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت یہ فرمایا ہے: "یتلوا صحفا مطهرة" یعنی وہ رسول جو تم پر پاک صحیفے پڑھتے ہیں (صحیفہ اس کاغذ وغیرہ کو کہا جاتا تھا، جس پر کچھ لکھا ہو) مطہرۃ کی قید سے معلوم ہوا کہ وہ صحیفہ جو ہر طرح کی بُرائی سے پاک ہے، اس سے ظاہر ہو گیا کہ وہ لکھا ہوا اُس قدوس کا کلام ہے جو ہر عیب سے پاک ہے۔ یہ پاک صحیفے کس پر لکھے گئے تھے اس کی تفصیل تفسیر الاتقان اور فتح الباری وغیرہ میں مذکور ہے۔ حاصل یہ ہے کہ مختلف چیزوں پر لکھا ہوا تھا۔ کاغذ کا رواج اس وقت تک پورے طور پر نہ تھا، یہ اوراق جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور سے لکھوائے تھے۔ اس کے سوا جو صحابی لکھنا جانتے تھے وہ لکھتے تھے، اکثر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سن کر حضورؐ کے روبرو لکھتے تھے، ایسا بھی ہوا کہ کسی نے اپنے یاد کے بموجب لکھا، کسی نے ان اوراق کی نقل کی جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوائے تھے، مگر یہ سب لکھا ہوا منتشر اور غیر مرتب تھا۔ جن صحابہؓ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید یاد کیا تھا

انہیں مرتب یاد تھا، مگر بعد وفات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کو اس طرف خاص توجہ ہوئی مختلف وجوہ سے، چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب آپ نے لوگوں میں اختلاف دیکھا تو قسم کھائی میں اپنی پیٹھ سے چادر نہ اتاروں گا جب تک قرآن مجید کو پورا نہ لکھ لوں، اور اپنے گھر میں جا کر بیٹھ گئے اور اپنی یاد کے بموجب پورا قرآن شریف لکھ لیا۔ ابوالحسن بغدادی کہتے ہیں کہ یہ قرآن مجید حضرت جعفرؓ کے خاندان میں رہا، پھر کہتے ہیں کہ میں نے اپنے وقت میں ایک قرآن مجید حضرت علیؓ کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیکھا جس کے شروع کے کچھ اوراق ضائع ہو گئے تھے، وہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد میں بطور وراثت چلا آتا تھا، ابوالحسن کی وفات ۳۳۴ھ میں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ تیسری چوتھی صدی میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن مجید موجود تھا۔ اس کے علاوہ حضرت علیؓ کے خادم خالد بن ہیاج بہت خوشخط مشہور تھے اور قرآن مجید لکھا کرتے تھے۔ علامہ ابن ندیم چوتھی صدی کے نصف آخر میں لکھتے ہیں کہ میں نے محمد بن الحسین بغدادی کے کتب خانہ میں انہیں خالد کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن مجید دیکھا جب خالد حضرت علیؓ کے خادم ومصاحب تھے تو ظاہر ہے کہ یہ قرآن مجید حضرت علیؓ کے قرآن مجید کے موافق ہوگا۔ اس سے بھی ثابت ہوا کہ ۳۷۷ھ تک حضرت علیؓ کا نسخہ موجود تھا۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ابی بن کعبؓ نے بھی قرآن مجید لکھا تھا اور اس کی نقلیں ہوتی رہیں۔ علامہ ابن ندیم لکھتے ہیں کہ میں نے ایک قرآن مجید دیکھا جو عبداللہ بن مسعودؓ کے نسخہ کی نقل تھا اور دوسری صدی میں لکھا گیا تھا، علامہ ممدوح نے یہ بھی لکھا کہ فضل بن شاذان کہتے ہیں کہ میرے ایک معتبر اور ثقہ دوست کہتے تھے کہ بصرہ کے ایک قریہ میں محمد بن عبدالملک انصاری کے پاس قرآن مجید تھا انہوں نے لا کر مجھے دکھایا، وہ حضرت ابی بن کعبؓ کا قرآن مجید تھا، ان نسخوں کے دیکھنے والے کوئی اختلاف اس قرآن مجید مروجہ سے نہیں بیان کرتے بجز سورتوں کی ترتیب میں، غرضکہ سیکڑوں برس تک تو ان اصحاب کبار کے لکھے

ہوئے قرآن مجید کا وجود یہاں سے ثابت ہوگیا، مگر یہ نسخے ان حضرات نے فرداً فرداً اپنی اپنی یاد کے بموجب لکھے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی خلافت کے عہد میں اس سے بھی اعلیٰ عمدہ صورت یہ اختیار کی کہ مجموعی شرکت سے کلام مجید کا نسخہ تحریر کرایا جن صحابہ کو قرآن مجید یاد تھا اور اپنی یاد میں مشہور تھے انہیں جمع کیا، ان میں بڑے اور مشہور حضرات یہ ہیں:۔

زید بن ثابتؓ، ابی بن کعبؓ، عثمانؓ، علیؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن السائبؓ، خالد بن ولیدؓ، طلحہؓ، سعدؓ، حذیفہؓ، سالمؓ، ابوہریرہؓ، ابوالدرداءؓ، ابوموسی الاشعریؓ، عمر بن العاصؓ۔

ان سب کا مجمع حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مکان پر ہوا، اور اس جگہ کے صدر زید بن ثابتؓ قرار دیئے گئے، اور اس امر پر گفتگو ہوئی کہ قرآن مجید کس طرح جمع کیا جائے۔ یہ رائے قرار پائی کہ مسجد نبویؐ میں بیٹھ کر اعلان کیا جائے اور جس جس کے پاس جس قدر لکھا ہوا ہو اُس سے منگایا جائے اور مقابلہ کر کر کے نقل کیا جائے۔ مسجد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا اعلان کیا اور فرمایا کہ جس کے پاس قرآن کا کوئی حصہ، کوئی سورت، کوئی آیت لکھی ہوئی ہو تو لائے اور اطراف مدینہ میں حضرت بلالؓ بھیجے گئے کہ تمام اصحابؓ کو اطلاع دیں کہ جس کے پاس جس قدر لکھا ہوا ہو وہ لائے، یہ سب اصحابؓ پورے قرآن مجید کے حافظ تھے، مگر یہ کمال احتیاط اور دور اندیشی تھی کہ ایک جماعت کی یاد پر بھی مدار نہیں رکھا گیا بلکہ یاد اور کتابت دونوں کو مطابق کر کے نقل کی گئی۔ حضرت زیدؓ اس جماعت میں ممتاز تھے اس لئے کہ علاوہ اوصاف کمال کے جوان، قوی الحفظ، کاتب وحی اور خوشخط تھے، اس لئے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے خاص کر انہیں حکم دیا کہ تم لکھو، اور بعض وہ صحابہؓ جو نہایت فصیح و بلیغ تھے وہ لکھوانے پر متعین کئے گئے۔ صحیح بخاری میں یہ سب قصہ منقول نہیں ہے کہ اس کے راوی نے بطور اختصار زیدؓ کو حکم کرنا اور ان کا جمع کرنا نقل کیا ہے۔'' (۱)

---

(۱) مکاتیب محمدیہؐ، حصہ اول۔ ص: ۱۳۰،۱۴

مولانا کی تصنیفات ردّ عیسائیت میں

عیسائیت کے رد میں غالباً مولانا کی سب سے پہلی تصنیف ''مرآۃ الیقین'' ہے، پادری عماد الدین نے مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی کتاب ''اعجاز عیسوی'' کے رد میں ''ہدایت المسلمین'' لکھی، اور آدھی یا تہائی کتاب کے اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی۔ ''اعجاز عیسوی'' جس وقت لکھی گئی اس وقت مشہور پادری فنڈر موجود تھے لیکن وہ اس کا جواب نہ دے سکے۔ اور اس کے بعد ۱۴ برس تک کسی پادری نے اس پر قلم اٹھانے کی ہمت نہیں کی۔ ۱۸۶۸ء میں عماد الدین نے اس کا جواب لکھا اور اس کے بعد مختلف لوگوں نے وقتاً فوقتاً اس کی تردید میں رسائل لکھے لیکن ابھی تک کسی نے اس کا مکمل جواب نہیں دیا تھا، بیشتر علماء کو اس خطرہ کا زیادہ احساس بھی نہ تھا، مولانا نے اپنی کتاب میں سنین طباعت اور صفحات کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ عیسائی علماء اناجیل کی تحریف کا خود اقرار کرتے ہیں، اور مولانا رحمت اللہ نے جو کچھ بھی لکھا ہے سو فیصدی صحیح لکھا ہے۔

عیسائی تاریخ کا مطالعہ

مسیحیت پر مولانا کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور اس کے مخفی گوشے جو بعض اوقات پادریوں اور مؤرخین کی نظروں سے بھی اوجھل رہ جاتے ہیں، ان کی نظر میں رہتے تھے، اکثر مواقع پر ان کا تاریخی مطالعہ اور مذہب مسیحی سے واقفیت پادریوں سے زیادہ نکلی۔

عماد الدین نے کتاب میں ایک جگہ یہ لکھا تھا کہ گروٹیس کوئی مشہور عالم نہیں ہے بلکہ کوئی یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کون تھا۔

مولانا اس کے جواب میں اور دلائل دینے کے بعد لکھتے ہیں کہ:۔

''گروٹیس تو وہ شخص ہے جس کے حالات زندگی کئی مؤرخین نے قلمبند کئے ہیں۔ سنئے چارلس ہول بیا گریفیکل ڈکشنری میں لکھتا ہے کہ گروٹیس کے حال میں گٹن برگ نے ۱۶۵۲ء میں ایک کتاب لکھی، اور برگنی نے ۱۷۵۴ء میں اس کے حال میں ایک کتاب

لکھی، اور چارلس ٹیلر نے ۱۸۲۶ء میں ایک کتاب لکھی، یہ شخص پیدا ہوا تھا ۱۵۸۲ء میں اور مرگیا ۱۶۴۵ء میں خیال کرنے کا مقام یہ ہے کہ گروٹیس کتنا مشہور اور معتبر شخص ہے کہ متعدد لوگوں نے خاص اس کے حالات میں کتابیں لکھی ہیں، اب پادری صاحب کی جہالت کو ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ اتنے بڑے مشہور عالم سے مطلقاً آگاہ نہیں ہیں''۔(۱)

یہ ایک مثال ہے۔ مولانا کی ساری تصنیفات کا یہی حال ہے اور اس میں ہر جگہ یہ تحقیقی اور تاریخی رنگ نمایاں ہے۔

آئینہ اسلام

مولانا کی دوسری تصنیف ''آئینہ اسلام'' ہے یہ کتاب مولانا نے حیدرآباد کے دوران قیام میں ۱۲۹۷ھ میں تصنیف فرمائی اور اس میں منشی صفدر علی کی کتاب ''نیاز نامہ'' کا جواب لکھا۔ منشی صفدر علی نے اور باتوں کے علاوہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ شریعت دو قسم کی ہے اخلاقی اور رسمی، اور اخلاقی شریعت رسمی شریعت سے افضل ہے، جو اعمال بذاتہ نیک یا بد ہیں وہ شریعت اخلاقی کہلاتے ہیں، اور جو اعمال بذاتہ نیک یا بد نہیں بلکہ حکم خداوندی نے ان کو نیک و بد اور حلال و حرام ٹھہرایا ہے وہ شریعت رسمی کے دائرہ میں آتے ہیں۔ پھر اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو رسمی شریعت دی گئی تھی، اس لئے کہ اس وقت لوگ شریعت اخلاقی کے متحمل نہیں تھے، جب انسان اس درجہ کو پہونچ گئے اور اس کے اہل ہوگئے تو حضرت مسیح نے شریعت اخلاقی بیان فرمائی، اب کیا وجہ ہے کہ قرآن و حدیث پھر اسی رسمی شریعت کی دعوت دیتے ہیں جس کا زمانہ ختم ہو چکا۔

مولانا نے اس مفروضہ کی مدلل تردید کی ہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ''یہ اعتراض چند امور پر مبنی ہے جب تک ان کا ثبوت نہ ہولے اس اعتراض کو پیش کرنا محض نادانی ہے۔ پہلا امر یہ ہے کہ مسیح نے شریعت موسوی کو منسوخ کر دیا ورنہ کیونکر ثابت ہوگا کہ جب شریعت اخلاقی کی حاجت نہ رہی، آپ کے قول سے یا آپ کے کسی مقتدا کے کلام سے اگرچہ وہ حواری کیوں نہ ہو،

---

(۱) مرآۃ الیقین۔ ص:۱۳۰

حکم شریعت منسوخ نہیں ہوسکتا۔ دوسرا امر یہ کہ جو شریعت اخلاقی حضرت مسیح کو عنایت ہوئی وہ حضرت موسیٰ یا دیگر انبیاء کو نہیں ہوئی تھی ورنہ اس کے کیا معنی ہوں گے کہ اس وقت کے لوگ متحمل نہ تھے اور مسیح نے شریعت اخلاقی بیان فرمائی، تیسرا امر یہ ہے کہ شریعت اخلاقی قرآن وحدیث میں نہیں۔ چوتھے یہ ثابت کرنا چاہئے کہ ہزاروں برس تک تمام دنیا کے لوگ ناقابل رہے اور شریعت اخلاقی کے لائق نہ ہوئے اور یکبارگی مسیح کے وقت میں لوگ اس کے لائق ہو گئے"۔(۱)

مولانا کا طرز تصنیف

مولانا کی تصنیفات میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ عیسائیوں کے مآخذ اوران کے مستند مؤرخین ومصنفین کے حوالہ سے ان کا رد کرتے ہیں، ان کا تاریخی مطالعہ اس موضوع پر بڑا وسیع معلوم ہوتا ہے، اور دوسری طرف ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ رد عیسائیت ہی پر اکتفا نہ ہو بلکہ اسلام کو ان کے سامنے دلنشیں اور علمی طریقہ پر پیش کیا جائے اور مثبت پہلو بھی ان کے سامنے اچھی طرح واضح ہو کر آجائے۔

قرآن وحدیث پر عیسائیوں کا ایک قدیم اعتراض یہ ہے کہ اس کی تعلیمات عیسائی مذہب سے ماخوذ ہیں، مولانا نے اس سلسلہ میں ایک عیسائی عالم مریدت کا نام پیش کیا اور کہا کہ وہ ۲۰ برس تک عیسائی مذہب کا زبردست مبلغ اور داعی رہا، اس کے بعد اس نے یہ مذہب چھوڑ دیا، اور ۱۸۶۴ء میں ایک کتاب لکھی جس میں اس نے بت پرستوں کی کتابوں سے مقابلہ کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انجیل کے احکام یہاں سے لئے گئے ہیں، یہ لکھنے کے بعد مولانا کہتے ہیں کہ اگر ملحدین کا یہ نظریہ غلط ہے (اور یقیناً غلط ہے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ بات کیسے مانی جاسکتی ہے کہ انہوں نے توریت وانجیل سے استفادہ کیا ہے، اس لئے کہ حضورؐ امی تھے اور حضرت مسیح تعلیم یافتہ تھے اور ان کتابوں کا مطالعہ کرسکتے تھے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اسلام کی تشریح بھی ساتھ ساتھ کرتے جاتے ہیں، ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اگر ذرا بھی مناسبت ہو اور موقع ہو تو اس سے فائدہ اٹھایا جائے اور

۱۔ آئینۂ اسلام۔ ص:۳۰

اسلامی نظام کی مصلحت اور افادیت واضح کی جائے۔ چنانچہ اس کتاب میں ایک موقع پر منشی صفدر علی کے اس اعتراض کی تردید کی ہے کہ شریعت مسیحی میں عبادت دعا کے مرادف تھی اور اسلام نے رسمی شکلوں کو اختیار کیا ہے اس لئے مسیحی شریعت اخلاقی ہوئی اور اسلامی شریعت رسمی۔ اس بات کا جواب مولانا اوپر دے چکے ہیں، لیکن ان اعمال ظاہری اور افعال جسمانی کی وضاحت کرتے ہوئے، مولانا نے ان کی حقیقت اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے، ان کی حکمت و مصلحت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''اعمال ظاہری اور افعال جسمانی کی مشق سے روح پر بھی اثر ہوتا ہے، اور جس طرح کا فعل ہاتھ، پیر، زبان سے انسان کرتا ہے اس طرح کی تاثیر اس کے قلب میں پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً کسی شخص کو تقسیم مال یا اور کوئی راحت رسانی کی خدمت سپرد کی جائے اور وہ بے روک ٹوک اپنی خدمت کو کثرت سے انجام دیتا رہے تو ضرور ہے کہ اس کے قلب میں فیاضی اور راحت رسانی کی صفت کچھ نہ کچھ پیدا ہو جائے گی اور اگر پہلے سے اس کے قلب میں یہ صفت ہوگی تو اس کی وجہ سے اس میں ترقی ہو جائے گی، اسی طرح اگر شخص کو کسی وجہ سے مارنے دھاڑنے ایذا رسانی کا اتفاق زائد ہوتا ہو تو اس کے قلب میں سختی ضرور آجائے گی''۔

اس کی تفصیل بیان کرنے کرنے کے بعد آگے لکھتے ہیں:۔

''غرض کہ کوئی شخص مشق ظاہری کے اثر سے انکار نہیں کر سکتا پھر کیا وجہ ہے کہ عبادت اور ریاضت جسمانی کو بیکار بتایا جاتا ہے، حالانکہ اس سے مقصود یہی ہے کہ اس کی وجہ سے روح میں اثر پیدا ہو، اور اگر روح میں بالکل غفلت ہے تو اس تحریک سے متنبہ ہو، اور اگر متنبہ ہے تو کمال پیدا کرے''۔

ترانۂ حجازی اور دفع التلبیسات

مولانا کی ایک اور کتاب جو عماد الدین کے جواب میں ہے ''ترانہ حجازی'' ہے، یہ ۱۲۹۵ھ میں شائع ہوئی۔ پادری عماد الدین او مجتہد صاحب لکھنوی کے درمیان ۱۸۷۱ء میں ایک تحریری مناظرہ ہوا تھا، اس کو ایک عیسائی نے ''نغمۂ طنبوری'' کے نام سے شائع کیا تھا اور ساتھ ہی کچھ سوالات کا اضافہ بھی کر دیا تھا۔ ترانۂ حجازی اس کتاب کے رد میں ہے،

اس میں مولانا نے جہاد کا صحیح اسلامی نقطہ نظر اور اس کے خلاف عیسائیوں کے اعتراضات کا جواب، نبوت محمدیؐ کا ثبوت، عصمت انبیاء، قرآن مجید کا توریت وانجیل سے ماخوذ نہ ہونا اور اس طرح کی اور دوسری چیزیں ثابت کی ہیں، دوسری کتاب ''دفع التلبیسات'' ہے، یہ پادری مذکور کی کتاب ''تقلیعات'' کے جواب میں ہے، اس میں اثبات نبوت محمدیؐ اور اناجیل کی تحریف پر بحث کی گئی ہے، یہ کتاب ۱۳۰۲ھ میں شائع ہوئی۔

مولانا محمد علی نے عماد الدین سے ان دونوں کتابوں کا جواب طلب کیا تھا اور اخبارات میں اعلان کر دیا تھا کہ جو ان کتابوں کا جواب دے گا اس کو انعام دیا جائے گا، لیکن کسی نے جواب دینے کی ہمت نہ کی۔

اس کے بعد ''ساطع البرہان'' اور ''براہین قاطعہ'' تصنیف کیں، جس میں بالترتیب قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے کا اثبات اور عیسائیوں کے عقائد کا ابطال کیا ہے۔

پیغام محمدیؐ

لیکن مولانا کی سب سے مشہور اور معرکۃ الآراء تصنیف جس کو مولانا رحمت اللہ کی ''اظہار الحق'' یا ''اعجاز عیسوی'' سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ ''پیغام محمدیؐ'' ہے۔ یہ کتاب مولانا نے صفدر علی کے ''نیاز نامہ'' اور پادری ٹھاکر داس کی کتاب ''عدم ضرورت قرآن'' کے جواب میں لکھی ہے۔

ہندوستان کے عیسائیوں کو اول الذکر کتاب پر بہت ناز اور اعتماد تھا۔ متعدد علماء نے اس کا جواب دینے کا ارادہ کیا لیکن ان کا یہ ارادہ پایۂ تکمیل کو نہ پہونچا۔ مسلمانوں میں اس کی وجہ سے یک گونہ انتشار پیدا ہو رہا تھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ مسلمانوں نے باقاعدہ جا کر بعض علماء سے درخواست کی لیکن چونکہ اس خطرہ کا ان کو پورا احساس نہ تھا اس لئے آمادگی ظاہر کرنے کے باوجود خود کوئی عملی قدم نہ اٹھا سکے۔

مولانا رحمت اللہ اور ڈاکٹر وزیر خان اس وقت مکۂ معظمہ میں موجود تھے، مسلمانوں کا ایک وفد مکۂ معظمہ اس غرض سے گیا کہ غالباً مولانا سے اس سلسلہ میں کوئی بڑی مدد مل سکے گی لیکن اس صورت سے بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا (۱)۔ پشاور کے ایک مشہور اور ممتاز

---

(۱) غالباً مولانا کو بعد مسافت اور پیرانہ سالی کی وجہ سے پوری توجہ کرنے کا موقع نہ مل سکا۔

واعظ اور عالم نے اس کا وعدہ کیا، لیکن بدقسمتی سے وہ بھی اس خدمت کو انجام نہ دے سکے۔(۱) بعض علماء وہ تھے جو صرف ان مسائل کی تحقیق کے حق میں تھے جو مستشرقین یورپ نے پیدا کر دیئے تھے۔ پادریوں کی طرف سے کوچہ و بازار میں جس طرح عیسائیت کی علانیہ تبلیغ ہو رہی تھی اور نبوت محمدیؐ اور کلام الٰہی مورد اعتراض، اور ہدف اہانت بنایا جارہا تھا اس کی طرف ان کو زیادہ توجہ نہ تھی، اس لئے ان کے نزدیک اس کا تعلق فن مناظرہ سے تھا۔ اور وہ اس کو بُرا سمجھتے تھے حالانکہ ان حالات میں اس کی ضرورت اسی طرح قائم تھی، ہاں شرط یہ تھی کہ اس کے لئے جدید اسالیب اختیار کئے جائیں، اور نیا طرز اپنایا جائے۔ مولانا محمد علی اس بات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"کیا اس اہانت کی جواب دہی علماء کی ذمہ نہ ہوگی، بیشک ہوگی کیونکہ یہ انہیں کا کام تھا، انہوں نے کیوں ترک کیا اور کس لئے کمزوروں کی مدد نہ کی، اس وجہ سے ضرور ہے کہ علماء اس طرف توجہ فرمائیں، اور جس طرح اور علوم پڑھایا کرتے ہیں اسے بھی پڑھائیں، پہلے زمانہ کا جو علم کلام ہے وہ اس وقت کارآمد نہیں، جن فرقوں کا رد اس میں ہے ان کا وجود دنیا میں ناپید ہے، پھر ان کے رد کے درپے ہونا اپنے بیش بہا وقت کو رائیگاں کرنا ہے، اس وقت اس علم کلام کو پڑھنا پڑھانا چاہئے جس کی ضرورت اس وقت ہے"۔(۲)

یہ کتاب دو جلدوں میں ہے، پہلی جلد ۳۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کے شروع میں ایک مفصل مقدمہ ہے جس میں اجمالی طور پر سارے نیاز نامہ کا جواب موجود ہے اور کتاب کا نچوڑ آ گیا ہے۔

اناجیل مروجہ کے ضبط و صحت کی تردید اور اس کی تحریف کے اثبات کے لئے مولانا اپنی تائید میں ایک عیسائی عالم اور مؤرخ کا قول پیش کرتے ہیں۔ انجیل متی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اس انجیل میں اول تو یہ اختلاف ہے کہ کس زبان میں لکھی گئی، اکثر علماء عیسائی اس بات کے قائل ہیں کہ متی حواری نے عبرانی میں لکھی تھی مگر اس کا وجود

---

(۱) یہ معلومات "پیغام محمدیؐ" سے اخذ کئے گئے ہیں۔ (۲) پیغام محمدیؐ، ص: ۳۲۰

صفحۂ عالم سے ناپید ہے اس کا ترجمہ یونانی میں ہے۔ پھر تحقیقی طور پر یہ معلوم نہ ہوا کہ ترجمہ کس نے کیا اور کب ہوا۔ بعض کہتے ہیں کہ یونانی میں لکھی تھی، بعض قائل ہیں کہ یونانی اور عبرانی دونوں میں لکھی تھی مگر کوئی دلیل نہیں ہے صرف اٹکل پر مدار ہے، دوسرے اس امر میں اختلاف ہے کہ کب تصنیف ہوئی۔ ہارن صاحب اپنی تفسیر کی چوتھی جلد کے حصہ دوم کے باب دوم میں لکھتے ہیں کہ:۔ جو حالات ہم کو قدیم مؤرخوں کلیسا سے انجیلوں کی تصنیف کے بارہ میں میں ملے ہیں ایسے غیر معین اور ابتر ہیں کہ کسی معین امر کی طرف نہیں پہونچاتے اور پرانے سے پرانے متقدمین نے اپنے وقت کی گپوں کو سچ خیال کر کے لکھ دیا اور اس کے بعد کے لوگوں نے ادب کی وجہ سے ان کے لکھے ہوئے کو قبول کر لیا اور یہ روایتیں جھوٹی سچی ایک لکھنے والے سے دوسرے لکھنے والے تک پہونچیں اور بعد گزر جانے مدت دراز کے ان کا پرکھنا غیر ممکن ہو گیا''۔(۱)

ان ساری انجیلوں کا ذکر کر کے مولانا نے تاریخ، سنین اور خود عیسائی علماء اور مؤرخین کے حوالہ سے انجیل کو محرف اور ناقابل اعتماد ثابت کیا ہے، اور یہ لکھا ہے کہ بائبل کے اختلافات کی تعداد ۱۰ لاکھ بتائی گئی ہے۔ اس کے علاوہ تثلیث و کفارہ کا بطلان، قرآن مجید اور حدیث نبویؐ کی حقانیت کا اثبات، شریعت اسلامی اور شریعت مسیحی کے قوانین و احکام کا مقابلہ اور جائزہ اچھے اور مفصل طریقہ پر لیا گیا ہے۔

منشی صفدر علی کا بڑا اعتراض یہ تھا کہ جب خود قرآن مجید ان کتابوں کی تصدیق کرتا ہے تو پھر مسلمانوں کو اس کے ماننے میں کیوں تامل ہے۔ مولانا یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن جس توریت کی تصدیق کرتا ہے اس کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ وہ یہ پانچ صحیفے ہیں کو پیدائش، خروج، احیاء، گنتی اور استثناء کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ یہ ذکر ہے کہ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، دوسری جگہ زیادہ تشریح ہے اور الواح کا ذکر ہے جس میں ۱۰ احکام تھے، پھر مولانا کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں ایک جگہ حضرت موسیٰ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی قوم سے یہ کہیں کہ وہ ان کی عمدہ ترین باتوں پر عمل کریں، الواح پر جو احکام تھے ان

---

(۱) پیغام محمدیؐ، حصہ اول۔ ص:۳۹

میں کوئی ایسی بات نہ تھی کہ ان پر عمل کرنا ضروری نہ ہو، البتہ اس کا امکان ہے کہ کتاب میں ایسی باتیں شامل ہوں۔ مثلاً شریعت ابراہیمی اور شریعت نوحی کے وہ احکام بھی توریت میں مذکور ہیں جو شریعت موسوی میں نہ تھے، اس کے پیش نظر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید ان پانچوں کتابوں کی تصدیق کررہا ہے۔

مولانا یہ لکھنے کے بعد کہ یہ کتابیں اول سے آخر تک حضرت موسیٰ کی نہیں ہیں، یہ دلیل پیش کرتے ہیں، استثناء میں ہے کہ:۔ سو خدا کا بندہ موسیٰ خداوند کے حکم کے موافق خواب کی سرزمین میں مرگیا اور اس نے اسے سواب کی ایک وادی میں بیت فغور کے مقابل گاڑا۔ یہ آج کے دن تک کوئی اس کی قبر کو نہیں جانتا'' دوسری جگہ ہے کہ:۔ ''اب تک بنی اسرائیل میں موسیٰ کے مانند کوئی نبی نہیں اٹھا الخ''۔ اس کو دیکھ کر ہر شخص کو یقین کرسکتا ہے کہ یہ حضرت موسیٰ کا لکھا ہوا نہیں ہے کسی اور نے لکھا ہے، اور وہ بھی حضرت موسیٰ کے بہت بعد لکھ کر شامل کردیا گیا ہے۔ چنانچہ ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ آج کے دن تک کوئی اس کی قبر نہیں جانتا۔

اسی طرز استدلال اور اسلوب میں مولانا نے بہت تفصیل و وضاحت، اور دلائل کے ساتھ اس خیال کی پرزور تردید کی ہے۔

''پیغام محمدیؐ'' کے ایک حصہ کا انگریزی ترجمہ بھی مولانا کے متوسل کی کوشش سے شائع ہوا اور ہند و بیرون ہند کی مشنروں کو بھیجا گیا۔ کتاب کا بنگلہ ترجمہ بھی شائع ہوچکا ہے''۔

اس کتاب کا اثر منشی صفدر علی اور دوسرے پادریوں پر ایسا پڑا کہ مناظرہ کے لئے تو کیا آمادہ ہوتے، مولانا محمد علی کے سامنے آنے سے بھی ڈرنے لگے۔ اتفاق سے ایک صاحب نے (جو مولانا محمد علی کے ہمنام تھے) ان سے ملنے کی کوشش کی، لیکن محمد علی کا نام سنتے ہی ملنے سے انکار کردیا۔ ''تحفۂ محمدیہؐ'' میں اس سلسلہ میں ایک دلچسپ لطیفہ لکھا ہے کہ:۔

''ایک صاحب جن کا نام محمد علی تھا، بھنڈارے آئے (یہ غالباً منشی صفدر علی کا مستقر تھا) اور ملاقات کا پیغام بھیجا، انہوں نے ملنے سے انکار کردیا، اتفاق سے بھنڈارے سے واپسی پر پادری صاحب کا ساتھ ہوگیا، مولوی صاحب نے ان سے گفتگو کرنا چاہی، پادری صاحب نے پوچھا کہ:۔ آپ مولوی محمد علی کانپوری

ہیں؟ مولوی صاحب نے کہا اس سے کیا بحث کہ میں کون ہوں، آپ سے ملنا چاہتا ہوں، اس وقت بھی انہوں نے انکار کیا۔ پھر مولوی صاحب ان کے ڈبہ میں گئے اور گفتگو کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں ہر جواب سے انکار کر دیا''۔(۱)

مذکورہ بالا کتابوں میں اکثر کتابیں بار بار طبع ہوئیں لیکن کسی ایک کتاب کا جواب کسی ایک پادری کی طرف سے نہیں دیا گیا، ان کتابوں کے اثر سے مشنریوں کے حوصلے بہت پست ہوگئے، ان کی سرگرمیوں کی رفتار کمزور پڑ گئی، اور بعض بعض جگہ اس قسم کی کوششوں کا سلسلہ بالکل بند ہوگیا۔

۱۔ ''تحفۂ محمدیہ'' اکتوبر ۱۸۹۲ء ۔ص:۳

باب سوم

تحریک ندوۃ العلماء

اور
اس کا پس منظر

مولانا کا عہد

مولانا محمد علی مونگیریؒ نے جس وقت ہوش سنبھالا وہ انیسویں صدی کے نصف آخر کا زمانہ تھا، یہ وہ عہد ہے جس میں تازہ دم مغرب اور ضعیف وناتواں مشرق کی باہمی کشمکش اپنے نقطۂ عروج پر پہونچ چکی تھی، اس عقلی وفکری کشمکش کے نتیجہ میں قدرتی طور پر بہت سی شخصیتیں پیدا ہوئیں جو مسلمانوں کے مختلف مکاتب خیال کی نمائندہ تھیں، متعدد تعلیمی اور اصلاحی تحریکیں اٹھیں اور انہوں نے اپنے اپنے دائرہ میں اسلام اور مسلمانوں کی قابل قدر اور ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔

قدیم عربی مدارس

مولانا مونگیریؒ کے عہد پر نظر ڈالئے تو ایک طرف قدیم عربی مدارس اپنے تمام خصوصیات اور امتیازات کے ساتھ نظر آئیں گے، کتاب وسنت پر استقامت اور اسلاف کے طریقۂ فکر اور طریقۂ تعلیم پر اصرار ان کا شعار تھا، اور نو وارد مغربی تہذیب اور ہندوستانی

سماج کے تصادم سے پیدا ہونے والے نئے مسائل اور سوالات کی طرف ان کی توجہ بہت کم تھی، ان کے ذمہ دار اور ارباب حل وعقد (جن کا اخلاص شبہ سے بالاتر ہے) شاید یہ سوچتے تھے کہ آگے بڑھ کر دشمن پر حملہ کرنے کے بجائے قلعہ بند ہو کر اپنی حفاظت زیادہ مفید ہے اور صرف اسی طریقہ سے دین وایمان کی حفاظت ممکن ہے۔

اس طرز فکر کا اظہار نصاب تعلیم میں اس طرح ہوا کہ درس نظامی (جس کے قبل کے نصاب میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہیں، حالانکہ اس عہد میں بہت کم تغیرات ہوئے تھے) بغیر کسی بنیادی تغیر کے اپنی قدیم شکل پر برقرار رکھا گیا اور اس عہد انقلاب میں جو غالباً جدید تاریخ انسانی کا سب سے زیادہ تیز رفتار اور تغیر پذیر عہد ہے، اس میں سب سے کم تغیر قبول کیا گیا۔

اس زمانہ میں (قیام ندوۃ العلماء کے وقت) جو نصاب تعلیم بعض قدیم مرکزی مدارس میں رائج تھا، اس پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ طلبہ کے قیمتی اوقات کا کتنا بڑا حصہ معقولات پر بلاضرورت صرف ہو رہا تھا اور دینیات اور ''علم نافع'' کی طرف توجہ کتنی کم تھی۔ مثلاً شرح ملا جامی جو ۴۰۰ صفحے کی کتاب ہے، آٹھ مہینے میں ختم کرائی جاتی تھی، مختصر المعانی ۳۴۰ صفحے کی کتاب ہے اور اس کی مدت سات ماہ تھی، لیکن صحیح البخاری کے لئے جو ۱۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے، ۶ ماہ مدت رکھی گئی۔ (۱)

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دارالعلوم دیوبند کے لئے جو نصاب تعلیم تجویز کیا تھا اس میں میبذی کے سوا فلسفہ کی کتابیں خارج کر دی گئی تھیں، مدت تعلیم بھی ۶ سال رکھی گئی تھی، حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ بھی فلسفہ و منطق اور فلاسفۂ یونان کے علوم کے مخالف تھے، اور اس کو قلب کی ظلمت کا باعث سمجھتے تھے۔ خود مولانا محمد علی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> ''ان کو (مولانا احمد حسن کانپوری) مشغولی اور توغل معقولات کی طرف بہت ہے، مناسب یہ تھا کہ الٰہیات کو معقولات پر غالب رکھتے، معقولات کی شاخ فلسفہ و نیچریت ہے، جس طرح کہ علوم دین کی مزاولت سے انبیاء واولیاء کے قلوب کے انوار و برکات جو

۱۔ روئداد ندوۃ العلماء، سال اول (حصہ اول)

اس میں ہیں قلب پر اثر کرتے ہیں، اسی طرح جو علوم کہ بے دینوں کے ہیں، ان کی ظلمت وتشویش اس میں ہے، وہ مزاولت سے قلب میں سرایت کرتی ہے"۔(۱)

اسی طرح مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی بھی رائے یہ تھی کہ ان کتابوں کا پڑھانا دین اور وقت دونوں کا ضیاع ہے۔ ایک خط میں اپنی اس رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"فلسفہ محض بے کار امر ہے، اس سے کوئی نفع معتد بہ حاصل نہیں سوائے اس کے کہ دو چار سال ضائع ہوں اور آدمی خر دماغ، غبی دینیات سے ہو جائے، فہم کج اور کور فہم شرعیات سے ہو جائے اور کلمات کفریہ زبان سے نکل کر ظلمات فلاسفہ میں قلب کو کدورت ہو جائے اور کوئی فائدہ نہیں"۔(۲)

لیکن ہندوستان کی عام تدریسی فضا کے اثر سے نیز دار العلوم کے دوسرے اساتذہ کی خواہش اور دباؤ سے مولانا نانوتویؒ کی وفات کے بعد تدریجی طور پر فلسفہ ومنطق کی ساری کتابیں داخل کر لی گئیں، اور اس کے ساتھ مدت تعلیم میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔

خود مولانا نانوتویؒ فلسفہ کے بالکلیہ مخالف نہیں تھے، اور جیسا کہ ان کے بعض جملوں سے معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں دین پر بقاء واستقامت کے لئے معقول کو ضروری سمجھتے تھے، (دیکھئے سوانح قاسمی، ص:۱۹۸و۱۹۹) البتہ اس فن کے اس قدر غلبہ اور بالادستی کو وہ بھی پسند نہ کرتے تھے، جتنی بالادستی اس کو مدارس عربیہ کے نظام درس بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ درس نظامی پر حاصل تھی۔

مولانا کی رائے اور مسلک کی تو بڑی حد تک توجیہ اور تاویل بھی کی جاسکتی ہے اس لئے کہ بدلتی ہوئی دنیا کے مسائل اس وقت اتنی وضاحت کے ساتھ اور کھل کر ان کے سامنے نہیں آسکے تھے جتنی وضاحت، سرعت اور جارحیت کے ساتھ وہ اس کے بعد سامنے آئے ہیں، اور اسلام کی صلاحیت وبرتری کے لئے چیلنج بن گئے ہیں۔

لیکن ان سب باتوں کے ساتھ اس حقیقت سے کوئی ہوشمند اور منصف انسان انکار نہیں کرسکتا کہ دیوبند کے فضلاء نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر دین خالص کی جس

---

(۱) کمالات محمدیہ۔ص:۳۴،۳۵ (۲) سوانح قاسمی۔ص:۲۹۲(جلد دوم)

طرح حفاظت کی ہے اور اس کو بدعت، تحریف اور تاویل سے محفوظ رکھا ہے، اس سے ہندوستان میں اسلامی زندگی کے قیام اور بقاء واستحکام میں بیش قیمت مدد ملی ہے اور آج جو صحیح اسلامی عقائد، دینی علوم، اہل دین کی وقعت اور صحیح روحانیت اس ملک میں نظر آتی ہے اس میں بلاشبہ اس کا نمایاں اور بنیادی حصہ ہے، اگرچہ زمانہ کی تغیر پذیری نئے نئے خطرات اور مسائل میں روز افروزں ترقی، اور الحاد و بے دینی کی اشاعت، نیز وطنیت اور قومیت اور مغربیت واشتراکیت کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت کی بناء پر مغربیت و مادیت کی طوفانی لہریں عام مسلمانوں کے سروں سے گزر کر اب ان قلعوں کی دیواروں سے بھی ٹکرانے لگی ہیں جن کو اب تک محفوظ اور اس نئے طوفان کی دسترس سے بہت دور سمجھا جاتا تھا۔

سرسید کا مکتبِ فکر

دوسری طرف سرسید اور ان کے مکتب خیال کے حامی تھے، سرسید کیا چاہتے تھے؟ اس کو مختصراً الفاظ میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ اپنے عقیدہ کو عزیز رکھو، لیکن مغربی تہذیب کے رنگ میں پوری طرح رنگ جاؤ، اور اس اقبال مند اور فاتح قوم کی ساری خصوصیات اور صفات پیدا کرو خواہ اس کا تعلق معاشرت سے ہو یا سیاست سے، نظام تعلیم وتربیت سے ہو یا قومی کردار سے، انفرادی زندگی سے ہو یا مجلسی اور قومی زندگی سے، یعنی اس کا مطلب یہ تھا کہ عقیدہ تم حجاز سے لو اور عمل مغرب سے، ایمان کتاب الٰہی اور سنت نبویؐ سے لو، اور طرز فکر اور نظام زندگی فلسفۂ یورپ سے، لیکن سرسید کو شاید اندازہ نہ تھا کہ اس پالیسی کے ساتھ عقیدہ بھی زیادہ عرصہ تک اپنی صحیح حالت پر قائم نہیں رہ سکتا، چنانچہ اس کا پہلا اثر خود ان کے افکار وخیالات پر پڑا، جس کا اندازہ ان کی تفسیر، رسالہ تہذیب الاخلاق کے پرچوں اور ان کی تفسیری وفقہی تاویلات سے بخوبی ہوتا ہے۔ (۱)

---

(۱) مولانا حالی نے جو ان کے از حد عقیدت مند اور مداح ہیں، بہت صاف الفاظ میں سرسید کی اس بات پر نکتہ چینی کی ہے اور لکھا ہے کہ:۔ بہت سے مقامات ان کی تفسیر میں ایسے بھی موجود ہیں جن کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایسے عالی دماغ شخص کو کیسے ان تاویلات باردہ پر اطمینان ہوگیا اور کیونکر ایسی فاش غلطیاں ان کے قلم سے سرزد ہوئیں۔ (حیات شبلی، ص ۲۱۵ حاشیہ)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ایک طرف قدیم مدارس کا نظریہ یہ تھا کہ قلعہ بند ہو کر اپنے کو نئے فتنوں اور نئے مسائل سے محفوظ کر لو، تو دوسری طرف سرسید کی رائے یہ تھی کہ تہذیب وتمدن، معاشرت واخلاق اور خیالات وافکار میں مغرب کی تقلید کرو اور اس کے سانچہ میں اپنے کو ڈھال دو۔ لیکن کیا ان دو راستوں کے علاوہ کوئی تیسرا راستہ نہیں تھا؟

سید امیر علی اور مولوی چراغ علی

سید امیر علی (م) ومولوی چراغ علی (م ۱۸۹۵ء) نے سرسید سے کچھ آگے بڑھ کر اسلام کی مدافعت اور مغربی مفکرین ومصنفین کے اعتراضات کے جوابات دینے کی کوشش کی اور اس میں ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے، بالخصوص سید امیر علی کی کتاب (SPIRT OF ISLAM) نے مغرب کے علمی حلقوں سے زبردست خراج تحسین وصول کیا اور ہندوستان کے اعلیٰ تعلیم یافتہ حلقہ پر خاصا اثر ڈالا، لیکن افسوس ہے کہ ان دونوں کا طرز فکر اور اسلوب بیان معذرت خواہانہ (APOLOGETIC) اور مدافعانہ تھا، وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ ان مسائل پر علماء کے اصول وہی ہیں جو مغربی مفکرین کے ہیں اور اسلام مغربی علوم کا کسی صورت میں مخالف نہیں ہے۔

ان کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ وہ طبعی اور اجتماعی علوم میں کوئی فرق نہ کر سکے۔ انہوں نے جو سلوک سائنسی اور تطبیقی علوم سے کیا تقریباً وہی سلوک معاشرتی علوم سے کیا، حالانکہ یہ طبعی علوم درحقیقت مشترک انسانی سرمایہ ہیں جن پر کسی مذہب، نسل یا ملک کی اجارہ داری نہیں، ان علوم کا تعلق انسانی عقل، ضرورت اور تجربہ سے ہے، ان کو نہ اسلامی کہا جا سکتا ہے۔ نہ غیر اسلامی، جغرافیہ، انجینئرنگ وٹیکنالوجی کیمسٹری، بیالوجی، وغیرہ یہ سب علوم وہ ہیں جن کا تعلق انسانی علم وتجربہ سے ہے، اگر ان کے بعض اجزاء اسلامی اصولوں سے متصادم ہوں گے تو اسلام کو مقدم رکھا جائے گا۔ ہاں نظام زندگی، معاشرت اور مقصد حیات اور طرز فکر کے شعبہ میں جس پر انسانی زندگی کی بنیاد ہے اور جس سے اس کا رخ اور سمت متعین ہوتی ہے اسلام کا علیحدہ اور مستقل نظام ہے جس میں کوئی ترمیم وتنسیخ اور کوئی قطع وبرید نہیں ہو سکتی، اس کے ساتھ بہت سے امور وہ ہیں جس کے لئے اسلام نے صرف کلیات اور رہنما اصول

عطا کرنے پر اکتفا کی ہے اور اس کی تشریح اور زندگی پر تطبیق انسانی عقل اور زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات پر چھوڑ دی ہے۔ مثلاً مکانات کی تعمیر، موسموں اور ضروریات کے مطابق لباس کے تغیرات، وسائل تبلیغ ودعوت، طریقۂ تعلیم، صنعت وتجارت وغیرہ، یہ چیزیں وہ ہیں جن کے حالات وتغیرات اور اپنے ذوق ورجحان وضرورت ومصلحت کے مطابق (حدود شرعیہ کے اندر) یہ تبدیلیاں اسلامی نقطۂ نظر سے جائز اور انسانی فطرت کے نقطۂ نظر سے ضروری بھی ہیں، بشرطیکہ وہ اسلام کے مقصد کو پورا کرتی ہوں اور اس کے اصولوں کی روشنی میں اور اس کے مزاج اور روح کو سامنے رکھ کر اختیار کی گئی ہوں۔

بدقسمتی سے عالم اسلام میں اب بھی ایسے افراد موجود ہیں جو یہ کوشش کرتے ہیں کہ قرآن کو سائنس سے ثابت کیا جائے اور اس کی آیات کی ایسی تفصیل اور توجیہ کی جائے کہ دونوں میں کوئی تضاد باقی نہ رہے، حالانکہ یہ تضاد صرف ان کے ذہن کی پیداوار ہے، حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہیں و، اسلام کا مقصد اور قرآن کا موضوع انسان کی ہدایت ہے، نہ کہ اس کی مادی ترقی، پھر اسلام کو اس سائنس کا پابند کس طرح بنایا جاسکتا ہے جو تجربہ اور وسائل کی ترقی کے ساتھ اپنے نظریات بھی برابر تبدیل کرتی رہی ہے۔(۱)

سر سید امیر علی گو مذہباً شیعہ تھے لیکن اس فرقہ کے تعصّبات اور تنگ نظری سے بلند ہوکر انہوں نے اپنی علمی واصلاحی جدوجہد جاری رکھی۔

سید امیر علی کو مغرب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اور اس سرزمین اور ماحول میں ایک طویل عرصہ گزارنے کی وجہ سے مغربی فلسفۂ حیات، تاریخ اور مسیحیت پر ان کی نگاہ بہ نسبت سر سید احمد خاں اور مولوی چراغ علی کے زیادہ گہری اور وسیع تھی، وہ یورپ کی کمزوریوں اور اس کے تاریک ترین حصوں سے بھی بخوبی واقف تھے، اس لئے انہوں نے زیادہ وسعت نظر اور قوت استدلال کے ساتھ اسلام کی وکالت کی، اور مغربی مصنفین

---

(۱) ان حضرات کے موقف کے سلسلہ میں ایک تاویل یہ کی جاسکتی ہے کہ سائنس کی بے اعتباری اور تغیر پذیری اس زمانہ میں اس طرح کھل کر سامنے نہ آئی تھی جس طرح اب آئی ہے جب کہ آئن اسٹائن اور اس کے ہم عصر سائنسدانوں نے سائنس کے زمین وآسمان ہی بدل کر رکھ دیئے ہیں اور اس کی تغیر پذیری اور کسی ماوراء الطبیعیات ہستی اور طاقت سے اس کا تعلق ماننے پر مجبور ہوگئے ہیں۔

پر جوابی الزامات لگائے، لیکن ان کا زیادہ تر زور اسلام کی مدافعت اور اس کی طرف سے صفائی پر رہا۔ وہ انگریزی کے بلند پایہ ادیب اور انشاء پرداز تھے۔ شکسپیر، ملٹن، بائرن، کیٹس، ولیم میور، اور والٹر اسکاٹ کا انہوں نے بہت گہرا مطالعہ کیا تھا، اور شیلے کے تو گویا وہ حافظ ہی تھے۔ انگریزی ادب پر مکمل عبور اور دسترس کی وجہ سے ان کی تحریریں بہت طاقتور اور جاندار تھیں، اور اس سے ان کی تصنیفات کی کلاسیکیت اور وقعت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ انہوں نے تاریخ، قانون، اور فقہ اسلامی پر قابل ذکر کتابیں لکھیں۔ لیکن ان کے اور مولوی چراغ علی کے علم و مطالعہ اور جذبۂ اصلاح و دردمندی کے اعتراف کے ساتھ یہ کہنا پڑے گا کہ یہ کتابیں مغربی فلسفۂ حیات اور طرز فکر پر اصولی تنقید سے خالی ہیں، اور ان میں مغربی تہذیب پر آگے بڑھ کر حملہ کرنے کے موقف کو بالکل اختیار نہیں کیا گیا ہے، اسلئے ان کے سارے استدلال اور علمیت نیز ادبی بلندی اور حسن کے باوجود یہ خلا بدستور باقی رہا، اور مغربی ذہن و دماغ نے اس کے اثر کو زیادہ محسوس نہیں کیا۔

ان کتابوں کے سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ آگے بڑھ کر جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کی فضیلت اور برتری کا اچھا تاثر دیا ہے، لیکن مغربی فلسفہ، مغربی علم اجتماع، اور مغربی تمدن نے لوگوں کے ذہن و دماغ پر جو نقش قائم کیا تھا اس کو زائل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ نیا تأثر اور نیا نقش دیرپا ثابت نہ ہو سکا اور مغربی طرز فکر کی بنیادیں بدستور مضبوط اور مستحکم رہیں۔

روحانی مراکز اور خانقاہیں

ان مکاتب خیال اور تعلیمی مراکز و تحریکات کے پہلو بہ پہلو ایک قوت اور بھی تھی جس کے اثر سے اسلامی ہند کا کوئی حصہ آزاد نہیں تھا، یہ روحانی خانقاہیں اور تصوف کے سلسلے تھے جن کے احسان کے بارگراں سے ملت اسلامیہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ یہ مراکز ایمان و یقین، اخلاقی و روحانی تربیت، اور اصلاح باطن کا وہ سرچشمہ تھے جہاں سب اہل ایمان اور اہل طلب سیراب ہوتے اور اپنی روحانی تشنگی دور کرتے۔ جس شخص کو صحیح اسلامی صفات، ایمانی کیفیات اور روحانی ترقیات کی فکر و جستجو ہوتی وہ ان مراکز میں آ کر اپنی

متاعِ گم شدہ پاتا، زندگی کا مقصد سمجھتا، اور خدا کی معرفت ومحبت کی لذت سے آشنا ہوتا۔

جو چند نام خاص طور پر اس سلسلہ میں لئے جا سکتے ہیں ان خواجہ محمد سلیمان تونسویؒ (م ۱۸۴۱ء) اور مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ (م ۱۸۹۵ء)، حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکیؒ (م ۱۳۱۷ھ) مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (م ۱۳۲۳ھ) کے نام سرفہرست ہیں۔ ان بزرگوں کے حلقے ہندوستان کے مضطرب اور تغیر پذیر ماحول میں رشد وہدایات کے وہ جزیرے تھے جہاں آکر انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے دل کا مرہم اور قلب کا سکون پایا، دینی وروحانی تربیت اور ترقی سے بہرہ مند ہوئے، اور پھر یہ پیغام ودعوت لے کر مختلف علاقوں میں پھیل گئے۔ ان حضرات کے علاوہ اور مشائخ بھی تھے جن کی تربیت واصلاح سے ہزاروں لاکھوں بندگان خدا فیضیاب ہوئے اور پھر خود دور دراز علاقوں کو سیراب کیا۔ اس ملک میں دینی فضا قائم رکھنے میں ان ہستیوں نے جو کارنامہ انجام دیا ہے اس کے ذکر کے بغیر اسلامی ہند کی دینی، اجتماعی اور علمی تاریخ نامکمل رہے گی۔

نظام درس اور مدارس کا عمومی جائزہ

عام عربی مدارس کی مثال اس شخص سے دی جا سکتی ہے جس کا سر رشتہ اس کے تمدن وتہذیب کی ابدی اور لازوال قوت سے بالکل کمزور پڑ چکا ہو اور جدید افکار ونظریات اس کی قامت پر راس نہ آتے ہوں، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان مدارس کی ساری طاقت اور صلاحیت، نزاع باہمی، فلسفیانہ بحثوں، منطقی موشگافیوں، اور فقہی اختلاف کی نذر ہو رہی تھی۔ اور جس وقت مغربی تہذیب اپنی تمام رعنائیوں اور فتنہ سامانیوں کے ساتھ ہندوستان کی مسلم سوسائٹی پر اپنا سایہ ڈال رہی تھی اور اس تہذیبی تصادم کی وجہ سے ذہین اور حساس طبقہ میں ایک ذہنی اضطراب برپا تھا، اس وقت 'مسلم' کی تکرار اور حفظ کا سلسلہ بدستور جاری تھا، اور اس آہنگ میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔(۱)

---

(۱) یہ بات حیرت اور افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک ایسے اصحاب موجود تھے (اور ممکن ہے اب بھی موجود ہوں) جنھوں نے دس دس اور بارہ بارہ مرتبہ 'مسلم' کی تکرار کی ہے اور اس کو پورا حفظ کیا ہے اور زندگی کا کارآمد اور قیمتی حصہ صرف اسی کی قرأت وسماع، تکرار وحفظ، بحث ومذاکرہ، یا شرح وتوضیح میں گزارا ہے۔

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ۱۱۱۹ھ سے قبل لکھی جانے والی کتاب اس قدر التزام اور وقعت واحترام کے ساتھ اب تک پڑھائی جاتی رہی ہے اور پڑھائی جارہی ہے کہ دوصدی سے زائد عرصہ گزرنے کے بعد بھی حلقۂ مدارس میں اس کی اہمیت اور ضرورت اس طرح مسلّم ہے جس طرح اس عہد میں تھی (۱)۔ علمائے کبار کا سرمایۂ علمی بالعموم متون کی شروح، شروح کے حواشی اور حواشی کے منہیات تھے۔ (۲)

آخری زمانہ میں نصاب درس میں جو اضافہ کئے گئے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مدارس اس وقت کس درجہ ذہنی اور علمی انحطاط کا شکار ہو چکے تھے۔ ملا نظام الدین کے جاری کردہ درس میں اولاً تو بہت زمانہ تک کوئی تبدیلی نہ ہوئی، اور جب تبدیلی ہوئی تو بغیر کسی غور وفکر کے، پھر حیرت کی بات یہ ہے کہ جو نئی کتابیں ملا نظام الدین کے درس میں شامل کی گئیں وہ سب کتابیں شروح وحواشی پر مشتمل ہیں، ایک کتاب بھی مستقل بالذات تصنیف نہیں اور نہ کسی کتاب میں کوئی نیا نظریہ یا خیال پیش کیا گیا ہے۔

یہ کتابیں حسب ذیل ہیں:۔

حاشیہ غلام یحیٰ علی میر زاہد رسالہ، شرح سلم للقاضی مبارک علی التصورات، وشرح حمد اللہ علی التصدیقات، وشرح ملاحسن علی التصورات، بعض مدارس میں یہ مزید اضافے کئے گئے، شرح السلم لبحر العلوم، شرح السلم ملا مبین، حاشیہ بحر العلوم علی میر زاہد رسالہ، حاشیہ ملا مبین علی میر زاہد رسالہ۔ (۳)

الثقافۃ الإسلامیۃ فی الہند کے مصنف نے مختلف علوم وفنون پر ہندوستانی علماء کی تصنیفات کا تفصیل اور استیعاب کے ساتھ ذکر کیا ہے، اس ذیل میں انہوں نے صرف منطق کے شروح وحواشی کی جو تفصیل لکھی ہے اس کی تعداد ۱۱۷ تک پہونچتی ہے جس میں ۳۷ کتابیں صرف علامہ محبّ اللہ بہاریؒ کی مشہور کتاب 'سلّم' کی شرح میں لکھی گئی ہیں، اور بقیہ دوسری کتابوں کی شرح میں۔

---

(۱) اس کتاب کی شرح میں اب تک ۳۷ کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ دیکھئے "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند"

(۲) ملاحظہ ہو:۔ الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند، اور نزہۃ الخواطر (جلد ۶ و ۷)

(۳) الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند مولانا حکیم سید عبدالحیؒ۔ ص: ۱۷ (مقدمہ)

''مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے میر زاہد کی کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے خوب لکھا ہے کہ:۔

''ان کتابوں کے ساتھ مولویوں کے شغف کا یہ حال تھا کہ جب تک ان تینوں یا ان میں سے کسی ایک کتاب پر اپنا خاص حاشیہ مولوی نہ لکھتا مستند مولویوں میں شمار نہیں ہوتا تھا، یہی حال سلّم اور اس کی شروح کا تھا''۔(۱)

لطف کی بات یہ ہے کہ بعض کتابیں نہ صرف یہ کہ بغیر غور و فکر و مشورہ کے بلکہ بلا کسی ارادہ کے داخل نصاب ہو گئیں۔

مولانا سید عبدالحئیؒ لکھتے ہیں:۔

''اس اضافہ کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔ مولوی محمد فاروق چڑیا کوٹی اپنے استاد مفتی محمد یوسفؒ سے نقل کرتے ہیں کہ:۔ ان کے بچپن میں شرح سلّم علی العموم رائج نہ تھی بلکہ قاضی مبارک کے شاگرد مولوی مدن وغیرہ اپنے شاگردوں کو سلّم کے ساتھ شرح سلّم قاضی مبارک بھی پڑھاتے تھے، اور ملا حسن کے شاگرد شرح سلّم ملا حسن پڑھاتے تھے، اور بحر العلوم کے خاندان میں شرح سلّم بحر العلوم رائج تھی، اور حمد اللہ کے تلامذہ اپنے استاد کی شرح پڑھاتے تھے۔ پڑھانے میں ایک دوسرے پر نوک جھونک بھی ہوتی جاتی تھی، اس لئے ایک کو دوسرے کی کتاب دیکھنا ضروری تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ یہ سب کتابیں درس میں داخل ہو گئیں، جن کو اگر ہم کہنا چاہیں تو صحیح طور پر ناخواندہ مہمان یا سبزۂ خودرو سے تعبیر کر سکتے ہیں''۔(۲)

یہ منطق کا ذکر تھا، نظام درس کا مجموعی جائزہ ہمیں متعدد افسوسناک خامیوں کی طرف متوجہ کرتا ہے، اور وہ بنیادی نقائص سامنے آتے ہیں جنہوں نے اس نصاب درس کو نہ صرف غیر مفید بلکہ یہ کہنا شاید صحیح ہو کہ بعض حیثیتوں سے مضر بنا دیا ہے، اس سے نہ طالب علم میں حدیث و تفسیر کا صحیح ذوق اور ملکہ پیدا ہوتا ہے، نہ ذوق علمی میں کوئی ترقی ہوتی ہے۔

اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس نصاب میں منطق کی ۱۵ کتابیں تھیں اور تفسیر کی دو بیضاوی اور جلالین (۳)۔ بلاغت و عربیت کا حصہ نہ ہونے کے برابر تھا، بقول مولانا عبدالحئیؒ کے:۔

---

(۱) سوانح قاسمی، ص ۲۸۹ (حاشیہ) (۲) ''الندوہ'' (جلد۔۶، ص ۱۴) (۳) ''الندوہ''، ص ۱۵

''اس نصاب سے طلبہ میں کسی فن میں کمال تو نہیں پیدا ہوتا البتہ احتمال آفرینی کی عادت پڑ جاتی ہے، رہ گئی حدیث، تو اس کی کتابیں ہر مدرسہ میں رائج نہ تھیں، بعض اہل شوق اس کے لئے سفر کرتے اور جہاں پر یہ متاع گرانمایہ ملتی حاصل کرتے لیکن بالعموم سب طلبہ کو اس کے حصول میں جو دشواری تھی وہ ظاہر ہے''۔

اسلامی تاریخ، جغرافیہ، علم اعجاز القرآن، علم کلام جدید، نیز وہ علوم اور موضوعات جن کا تعلق قوموں کے عروج و زوال اور فلسفہ تمدن و اجتماع، اور فکر و اجتہاد سے ہے، نظر انداز ہو رہے تھے۔

عربی زبان کے ساتھ اس مردہ زبان کا معاملہ تھا جو کھنڈرات تاریخی آثار اور کتبوں وغیرہ میں محفوظ ہو، اور بدقت تمام پڑھی اور سمجھی جاتی ہو، حالانکہ یہ ایک ایسی زندۂ جاوید، زرخیز، ترقی پذیر زبان ہے جو کتاب و سنت کی کلید اور اسلام کے عظیم کتب خانہ میں داخلہ کی اولین شرط ہے جس میں اسلامی علوم کے علاوہ شعر و ادب، تاریخ و فلسفہ اور تصوف کے بیش بہا خزانے اور انسانی ذہانت کے لازوال اور یادگار نمونے پوشیدہ ہیں۔

اس کے پورے ادبی سرمایہ سے جو کتابیں انتخاب کی گئیں ان میں سرفہرست مقامات حریری ہے۔ جو اس حلقہ مدارس کی بہت محبوب اور پسندیدہ کتاب رہی ہے۔ اس کتاب نے جو اپنی مسجع عبارتوں، پیچیدہ ترکیبوں اور مشکل وثقیل الفاظ کے لئے مشہور ہے، مدرسین اور طلبہ کو عربیت کی ''راہ راست'' سے ہٹانے میں بڑا کام کیا، اور نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی اکثریت صحیح عربی ذوق سے اکثر نا آشنا رہی۔ نفحۃ الیمن ادبی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے کوئی بلند نمونہ نہیں، خصوصاً کم سنی میں اس کا پڑھنا پڑھانا ناموزوں و بے محل ہے۔

مقامات حریری کے علاوہ نصاب درس میں جو کتابیں داخل تھیں ان کا بیشتر حصہ نظم پر مشتمل تھا۔ دیوان حماسہ، دیوان متنبی، سبعہ معلقہ، قصیدہ بانت سعاد، قصیدہ البردہ للبوصیری وغیرہ ہمیشہ داخل نصاب رہیں، اہل نظر جانتے ہیں کہ ادبی ذوق پیدا کرنے اور تحریر و تقریر کی مشق کے لئے نظم کی افادیت ہر زبان میں بہت کم رہی ہے، اور انشاء و ادب کی تعلیم کے لئے ہمیشہ نثر کو مفید سمجھا گیا ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس بات پر گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"تحریر وتقریر کی مشق اور عربی زبان میں ترجمانی اور اظہار مافی الضمیر میں جو چیز مفید ہے وہ نثر ہے نہ کہ نظم، نظم پابہ زنجیر ہوتی ہے اور مقید، اگر چہ نثر بھی ہمارے ہاں نظم سے کچھ کم نہیں رہی، اس لئے کہ اس میں جو قافیہ بندی اور تکلف وصنعت داخل ہوگئی ہے اس نے ادب کو بھی نظری علوم کی طرح بنادیا ہے جو پڑھائے جاتے ہیں زندگی میں برتے نہیں جاتے"۔(۱)

اس نصاب تعلیم (بشمول نصاب ادب) کا ایک اثر یہ بھی پڑا کہ قرآن مجید کا صحیح فہم جس کے لئے صحیح عربی ذوق اور ملکہ شرط ہے طالبین کے لئے بہت دشوار ہوگیا، ان کتابوں اوران کے طریقۂ تدریس نے ان کے ذہن ومزاج کی ایسی تشکیل کی کہ وہ قرآن مجید کے الفاظ وتعبیرات کے سیدھے اور سمجھ میں آنے والے مفہوم کو چھوڑ کر بلا ضرورت پیچیدہ راستہ اختیار کرنے کے عادی بن گئے اور تاویل کے خوگر ہوگئے۔

اس جائزہ سے یہ سمجھنا چاہئے کہ ان صدیوں میں کوئی ایسی بلند قامت شخصیت پیدا نہیں ہوئی جو اپنے زمانہ کی سطح سے بلند اور مجتہدانہ فکر وبصیرت کی حامل ہو۔ خانوادہ ولی اللّٰہی اس باب میں ایک روشن مثال ہے اور اس نے اسلام اور مسلمانوں کی جو عظیم خدمت انجام دی ہے اس سے کون ناواقف ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ ملا نظام الدینؒ کے معاصر تھے، اور حجاز سے واپسی پر انہوں نے نصاب تعلیم میں کچھ اہم تبدیلیوں کا ارادہ کیا تھا، لیکن اس مسئلہ میں ان کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوسکی، اس کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا سید عبدالحیؒ لکھتے ہیں:۔

"شاہ صاحبؒ نے اپنے طرز کا ایک جدید نصاب بنایا تھا مگر چونکہ اس زمانہ میں علم کا مرکز ثقل دہلی سے لکھنؤ کو منتقل ہو چکا تھا اور تمام درسگاہوں میں منطق وحکمت کی چاشنی سے لوگوں کے کان وزبان آشنا ہو رہے تھے، اس نصاب کو قبولیت حاصل نہیں ہوئی، اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کے نامور بیٹوں نے زمانہ کی روش سے مجبور ہو کر اس کو رواج دینے کی کوشش بھی نہیں"۔(۲)

---

(۱) مقدمہ مختارات: ص ۵ (۲) الندوہ: جلد ا، ص ۱۲

ان سے پہلے شیخ محمد بن طاہر پٹنیؒ (م ۹۸۶ھ)، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (م ۱۰۵۲ھ)، مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ (م ۱۰۳۴ھ) جیسے حضرات زمانہ کی عام سطح سے بہت بلند اور ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان میں سے اگر صرف مجدد صاحبؒ کی تجدیدی کارناموں اور مجتہدانہ فکر و نظر کو ظاہر کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کے لئے مستقل کتاب کی نہیں، پورے کتب خانہ کی ضرورت ہوگی۔

اسلام کی اولین سرچشمہ سے زیادہ سے زیادہ قربت واتصال، جہاد واجتہاد کے احیاء، اور اسلامی نظام زندگی کے قیام واستحکام کے شعبہ میں سید احمد شہیدؒ (م ۱۲۴۶ھ) اور مولانا اسماعیل شہیدؒ (م ۱۲۴۷ھ) نے اسلامی ہند کی تاریخ کے وقار کو بلند اور اس کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ لیکن ان خوشگوار اور عطر بیز وقفوں کے باوجود ہندوستان کے حلقۂ درس وتدریس کی عام فضا بے کیف اور پرسکون تھی اور اس میں کوئی تغیر وانقلاب اور کوئی خلش واضطراب نظر نہ آتا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید سیاسی انقلابات اور سماجی تغیرات کی لہریں اس سے کترا کترا کر گزر رہی ہیں، وہ جدید سیاسی واجتماعی افکار ونظریات جو مسلم معاشرہ کے لئے سخت ذہنی کشمکش اور اضطراب کا باعث تھے۔ ''مدرسہ'' پر بالکل اثر انداز نہ تھے، یا اس نے اپنی آنکھیں بند کر کے خود کو محفوظ سمجھ لیا تھا۔

جو راز میکدہ میں ہے اک اک زبان پر
افسوس مدرسہ میں ہے بالکل نہاں ہنوز

فتنۂ تکفیر اور نزاع باہمی

انسان کو اللہ تعالیٰ نے عظیم صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں، وہ ہر لمحہ اور ہر آن کسی میدان کی جستجو میں رہتا ہے، یہ صلاحیتیں اگر صحیح رخ اختیار نہ کریں تو لازماً تخریبی میدانوں کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں، ان کا ازالہ نہیں ہو سکتا امالہ ہو سکتا ہے۔ عربی مدارس کے ساتھ یہی دشواری پیش آئی کہ اس نصاب درس اور طریقہ تعلیم کی وجہ سے ان کے سامنے کوئی ایسا تعمیری اور انقلابی میدان میں نہ رہا جہاں ان صلاحیتیوں اور طاقتوں کا مظاہرہ ہوتا، یہ نظام درس اپنے بہت سے خصوصیات اور فوائد کے باوجود ملت کے مسلم نوجوانوں میں جو دینی

علوم حاصل کررہے تھے، فراخدلی، بلند نظری، فکری حوصلہ مندی، اور مجتہدانہ روح پیدا کرنے سے بڑی حد تک قاصر تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی یہ صلاحیت جو صحیح رہنمائی وتربیت اور مناسب استعمال سے ان بڑے مقاصد کے لئے بیحد مفید ثابت ہوسکتی تھی، ایک دوسرے کی تکفیر وتفسیق، فروعی اختلافات، جماعتی عصبیت اور علمی طبقہ واریت کی نذر ہوکر رہ گئی، اور بکثرت ایسے مناظر اور واقعات پیش آئے جنہوں نے ہندوستان کی اسلامی تاریخ کو داغدار بنادیا۔

ہندوستان کے مقتدر علماء اور نامور شخصیت پر کفر کے فتوے لگائے گئے، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ ختم نبوت کے منکر ہیں، مولانا گنگوہی کی طرف امکان کذب باری کا فتوی منسوب کیا گیا، مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ سے یہ بات منسوب کی گئی کہ انہوں نے شیطان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اعلم قرار دیا ہے۔ مولانا تھانویؒ کو یہ الزام دیا گیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کو زید وبکر بلکہ چوپایوں کے علم کے برابر سمجھتے ہیں۔ (۱) آخر میں مولانا محمد علیؒ (۲) اور مولانا شبلی نعمانیؒ پر بھی کفر کا فتویٰ صادر کیا گیا۔

پوری امت مقلدین اور غیر مقلدین میں تقسیم ہوگئی۔ اہل حدیث اور اہل فقہ کے دو الگ الگ گروہ بن گئے، اور ایک دوسرے سے اس طرح برسر پیکار ہوئے کہ گویا وہ دو مختلف مذاہب کے پیرو ہیں وساری طاقت آمین بالجہر، قرأۃ فاتحہ اور رفع یدین کے نقض یا اثبات پر صرف کردی گئی، فقہ کے جزئیات اور مختلف فیہ مسائل پر جن پر اسلام کی بقاء وترقی کا انحصار نہ تھا۔ ضخیم مناظرانہ کتابیں تیار ہونے لگیں، مناظرے ہوئے، اور طنز وتعریض کا ایک لاانتہاہی سلسلہ شروع ہوگیا، اور اس میں سخت تشدد ومبالغہ سے کام لیا گیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس میں وقت کے اہم ترین مسائل پر (جن کا تعلق براہ راست اسلام کے بقاء واحیاء اور مسلمانوں کے مستقبل سے تھا) غور کرنے کی فرصت باقی نہیں رہی، اس عہد میں جس قسم کی کتابیں شائع ہورہی تھیں، اور ان میں جو ذہنیت اور منافرت کی روح کام کررہی تھی، اس کا اندازہ ان کے ناموں ہی سے ہوجاتا ہے۔

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے "نقش حیات" از مولانا سید حسین احمد مدنی، ص: ۱۲۶ تا ۱۳۵

(۲) دیکھئے "اتمام الحجۃ" از سید احمد الحسنی رائے بریلوی

فیؤس الكملة على رؤس الجهلة(۱)
مولانا حکیم الٰہی بخش صاحب (مطبوعہ) ۱۳۰۰ھ
ظفر مبين على جمع الشياطين
مولانا محمد علی بچھرانوی (مطبوعہ) ۱۲۹۰ھ
سوط الرحمن على حاسد النعمان
مولانا حکیم الٰہی بخش خانصاحب (مطبوعہ) ۱۳۰۶ھ
سبحن السبوح عن عيب كذب مقبوح
مولانا احمد رضا خاں بریلوی

یہ نام رسائل و مؤلفات کی اس طویل فہرست سے لئے گئے ہیں جو اس دور میں بڑی تعداد میں شائع ہوتی تھیں اور بڑی دلچسپی سے پڑھی جاتی تھیں۔

ہندوستان کے چیدہ اور نامور علماء کے بھی بعض منتسبین اس وبا سے محفوظ نہ رہ سکے اور اپنے اخلاص اور تبحر علمی کے باوجود انہوں نے اس قسم کے مسائل پر اپنے وقت اور دماغ کا خاصا حصہ صرف کیا، جب مولانا ابوالحسنات عبدالحی فرنگی محلی (م ۱۳۰۴ھ) نے نواب سید صدیق حسن خاں کی بعض کتابوں پر تنقید کی، تو مولوی عبدالنصیر سہسوانی نے اس کے جواب میں شفاء الحي عما أورده الشيخ عبد الحي کے نام سے ۱۲۹۴ھ میں ۱۱۲ صفحے کی ایک کتاب لکھی اور بہت ہی سختی اور درشتی کے ساتھ مولانا کی تنقید پر کلام کیا، اس کے جواب میں مولانا عبدالحی نے ابراز الغي الواقع في شفاء العي کے نام سے ۶۴ صفحہ کا ایک اور رسالہ لکھا اور ان کی تنقید پر تعاقب کیا، اور قدرتی طور پر اپنے علمی مرتبہ اور جلالت شان کا خیال رکھا۔ لیکن یہ سلسلہ اسی پر ختم نہیں ہوا۔ مولانا کے اس رسالہ کے جواب میں مولوی ابومحمد ٹونکی نے آخر الدواء الكي کے نام سے ۲۰۸ صفحہ کی ایک کتاب

(۱) اس کتاب میں فرید کوٹ کے ایک افسوس ناک مناظرہ کا ذکر ہے جو احناف اور غیر مقلدین میں ہوا تھا، رفع یدین اور آمین بالجہر کا مسئلہ تھا۔ راجہ بکرم سنگھ والی فرید کوٹ کے یہاں محفل مناظرہ گرم ہوئی، اور خاصی رد وقدح اور سب وشتم کے بعد احناف کو فتح ہوئی۔ محضر پر علماء کے ساتھ راجہ صاحب اور ٹھاکروں نے بھی دستخط کئے، یہ واقعہ ۱۸۸۳ء میں پیش آیا۔

تصنیف کی اور اس میں انہوں نے جو اسلوب اختیار کیا وہ اس قابل بھی نہیں تھا کہ شائع ہو، جن باتوں پر انہوں نے گرفت کی وہ اس قدر مضحکہ خیز، طفلانہ اور سطحی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے، اس کتاب سے اس زمانہ کے طرز فکر اور ذہنی افلاس کی پوری تصویر نگاہوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں :۔

''جب لوح کتاب کا یہ حال ہے تو سمجھو ساری خطابیات کا کیا مآل ہوگا، بسم اللہ ہی صحیح نہیں، کتاب کو دو بیتوں سے شروع کیا ہے، اس گمان پر کہ اس میں لفظ بسم اللہ آیا ہے۔ اگر آیا ہے تو بسم اللہ ثانی کی حاجت تھی، اگر تھی تو اس کے اوپر اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم لکھنا کیا ضرور تھا۔ شیخ جی (یعنی مولانا عبدالحی فرنگی محلی) کے نزدیک یہ تذکرہ گویا قرآن ہے جس کے لئے اعوذ باللہ کی کھینچ تان ہے، چنانچہ آیہ کریمہ ان ھذہ تذکرہ الخ اس کا نشان ہے۔ نعوذ باللہ من الکفر ان یا مطلب اس نعوذ کا یہ ہوگا کہ مخاطب لائق استعاذہ ہے پھر اگر مخاطب سے استعاذہ منظور نظر ہوتا تو سرے سے تذکرہ جمع کرنا ہی کچھ ضرور تھا، تم نے اگر اپنی کتاب کو اس اعوذ سے رونق بخشی ہے تو دوسرا بھی اس کے مقابلہ میں قبل تسمیہ یہ لکھ سکتا ہے۔ اعوذ باللّٰہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم و من ھمزہ و نفخہ و نفشہ''۔(۱)

پوری کتاب اسی قسم کے طنزیہ جملوں اور ترکیبوں سے بھری ہوئی ہے اور اس عہد کا افسوسناک منظر پیش کرتی ہے، اس زمانہ میں جن مسائل پر علماء کی قوت صرف ہو رہی تھی، وہ زیادہ تر طبقات ارض میں انبیاء کا وجود، اللہ تعالیٰ کا استواء علی العرش، امکان کذب، اور امکان نظیر، فلک کا خرق والتیام، مصافحہ اور معانقہ کا جواز، لعن یزید کا جواز یا تحریم اور معراج جسمانی کے منکر کی تکفیر جیسے موضوعات تھے، اور ان موضوعات پر مخالفت اور موافق دونوں گروہوں کی طرف سے رسائل اور کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ زور وشور سے جاری تھا۔

دوسرا بڑا محاذ جہاں یہ ''سرد جنگ'' جاری تھی مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا تھا، ان کے ہاں بھی جو سب سے اہم مسائل درپیش تھے ان میں امکان کذب، یا مولود وغیرہ کے

۱۔ آخر الدواء الکی: ص ۶

مسائل اولین اہمیت رکھتے تھے اور ان پر قلمی جنگ برابر جاری رہتی تھی۔

مولانا احمد رضا خاں نے ۱۳۰۷ھ میں امکان کذب کے موضوع پر "سبحٰن السبوح عن عیب کذب مقبوح" ملقب "بہ صد تازیانہ بر فرق جهول زمانہ" (۱) کے نام سے ۱۰۴ صفحہ کی ایک کتاب لکھی اور "براہین قاطعہ" کی تردید کی، اور یہ دعویٰ کیا کہ وہ اس کے لئے ۲۰۰ دلیلیں پیش کررہے ہیں، کتاب میں جابجا مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو ملا گنگوہیؒ سے خطاب کیا ہے۔ کتاب کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اس مختصر رسالے موجز عجالے میں مدعیان جدید پر پورے دوسو کوڑوں کی کامل بوچھار 'كذلك العذاب ولعذاب الآخرة أكبر لو كانوا يعلمون' میں نے جس طرح اس رسالہ کا تاریخی نام "سبحٰن السبوح عن عیب كذب مقبوح" رکھا، یوں ہی ان تازیانوں کا عدد درخواست کرتا ہے کہ اس کا تاریخی لقب دو صد تازیانہ بر فرق جہول زمانہ" رکھوں، بالجملہ آفتاب روشن کی طرح واضح ہوگیا کہ ایک مذہب علماء دین پر یہ امام و مقتدی سب کے سب نہ ایک دو کفر بلکہ صدہا کفر میں ڈوبے ہوئے ہیں و فی ذلک أقول:

فكفر فوق كفر فوق كفر

كان الكفر من كثر ووفر (۲)

مقلدین اور غیر مقلدین کی کشمکش

مقلدین اور غیر مقلدین کے درمیان اختلاف و نفرت کی جتنی بڑی خلیج حائل ہوگئی تھی اس کا کچھ اندازہ ان اشتہارات اور ہنڈ بل وغیرہ سے ہوتا ہے جن کو ہماری تاریخ نے عبرت کے طور پر محفوظ کردیا ہے۔ مولانا سید نذیر حسین محدث کے متبعین اور ان کے مخالفین میں جو چشمک چل رہی تھی، سب اہلِ علم اس سے واقف ہیں۔

۱۳۰۰ھ میں جب مولانا حج کے لئے تشریف لے گئے تو مخالفین نے اس موقع سے

---

(۱) کتاب کے سرورق پر کتاب کے تعارف کی جگہ لکھتے ہیں:۔ کتاب لاجواب، رنگ فزائے صدق وصواب، زنگ زدائے کذب واتیاب مسمیٰ بہ نام تاریخی سبحٰن السبوح عن عیب کذب مقبوح۔ (۲) سبحٰن السبوح۔

فائدہ اٹھا کر پاشا کو مولانا سے بدگمان کرنے کی پوری کوشش کی، ان کو معتزلی اور گمراہ بتایا اور ہندوستان میں یہ خبریں مشہور کیں کہ پاشا نے مولانا کو تحقیق و تفتیش کے بعد گرفتار کرلیا، اور توبہ نامہ لکھنے کے بعد ان کو آزاد کیا ہے۔ یہاں تک مشہور کیا گیا کہ ان کو شہید کر دیا گیا۔

ربیع الاول ۱۳۰۱ھ کو جب مولانا واپس تشریف لائے تو ان کے متبعین کو شماتت کا خوب موقع ہاتھ آیا اور دونوں طرف سے اشتہار بازی شروع ہوئی، اس میں جو زبان استعمال کی جاتی تھی وہ انتہائی پست اور عامیانہ ہوتی تھی۔ اس موقع پر ایک اشتہار جو اس توبہ نامہ کے جواب میں غیر مقلدین کی طرف سے شائع کیا گیا ہے میرے سامنے ہے اور مولانا ابوالقاسم ہنسویؒ (۱) کے مرتب کردہ نادر مجموعہ مکاتیب قلمی میں محفوظ ہے۔ یہ اشتہار اس طرح شروع ہوا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل اسلام نے کوئی بہت بڑا قلعہ فتح کیا ہے اور کفر و زندقہ کو شکست فاش ہوئی ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ ان لوگوں نے ان فقہی اختلافات کو جو ہمیشہ رہے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے، کفر و اسلام کا معرکہ بنا دیا تھا اور اس میں وہ شدت اختیار کر لی تھی جو ایک مسلمان کو کسی کافر یا مرتد کے مقابلہ میں ہونی چاہئے، اس اشتہار کی پیشانی پر یہ الفاظ نظر آتے ہیں:۔ ''صدق اللہ وعدہ ونصر عبدہ وہزم الاحزاب وحدہ'' اس سے بھی تسکین نہ ہوئی تو عبد کے نیچے اس کی تشریح کرنے کے لئے میاں صاحب لکھ دیا اور احزاب کے نیچے مقلدین متعصبین، اس سے بھی جی نہ بھرا تو اس کے نیچے ایک سرخی 'اعلان دافع طغیان'، پھر اس کے نیچے طنز سے بھرا ہوا ایک شعر۔

یہ اشتہار اور اس طرح کے اور اشتہاروں کو دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اسلام کی ساری فتح و شکست اس ایک واقعہ سے وابستہ سمجھی جا رہی تھی، اور اس جنگ و جدل

---

(۱) میرے حقیقی نانا مولانا سید ابوالقاسم ہنسویؒ اپنے زمانہ کے ایک صاحب نسبت بزرگ اور عارف مولانا شاہ سید عبدالسلام صاحب ہنسویؒ (م ۱۲۹۹ھ) کے بھتیجے ہیں۔ حاجی امداداللہ صاحبؒ سے مجاز تھے۔ عالم دین ہونے کے ساتھ علمی و تاریخی ذوق کا حصہ وافر ملا تھا، اپنے زمانہ کے تمام اکابر سے بہت اچھے روابط رکھتے تھے۔ مشہور علماء، صوفیا، اور مشائخ کے بیش قیمت خطوط کے دو نادر مجموعے اور رسالہ ''نور العیون'' و ''برکات احمدیہ'' کی ان کی یادگار ہیں۔ مجموعہ خطوط قلمی

کو عین اسلام سمجھا جا رہا تھا۔

لیکن اس صورت حال کے پس منظر کو سمجھنے کے لئے اس سے زیادہ قیمتی دستاویز وہ خط ہے جو مولانا ابو القاسم ہنسویؒ نے اس طوفان مخالفت سے متاثر ہو کر مولانا نذیر حسین صاحب کو لکھا تھا، یہ خط اس دردمند، روشن ضمیر، اور معتدل طبقہ کی ترجمانی کرتا ہے جو ہوا کے مخالف جھونکوں میں بھی اپنی شمع جلائے ہوئے تھا، اور ہمت شکن حالات سے خاموشی کے ساتھ نبرد آزما تھا، وہ بڑی دلسوزی اور قلق کے ساتھ خط میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

''مسائل فروعی میں اس قدر لاولعم، ردوکد، اور سب وشتم نے زور پکڑا ہے جس کا پایاں نہیں، جنگ وجدل فیما بین شعار اسلام ہو گیا ہے، مسائل اصولی ایمانی کہ جس پر بنائے ایمان واسلام ہے مفقود، ایک زمانہ تھا کہ اہل اسلام کفار واشرار سے مجادلہ ومقاتلہ کرتے تھے اور آمادہ ہدم بنائے کفار ومشرکین ہوتے تھے، اب یہ زمانہ ہے کہ باہم مسلمانوں میں خانہ جنگی ہے۔ مسلمان اپنی ملت ومذہب وبنائے اسلام کو گرا رہے ہیں اور باہم ایک دوسرے کو سب وشتم کرتے ہیں کہ جو کچھ روشنی اس کی ہو مبدل بہ تاریکی ہو جاوے، اندھیرے میں اندھیرا ہو، لوگ بزرگوں کو بدنام کرتے ہیں، جو کوئی کلمۂ حق کہتا ہے۔ پکڑا جاتا ہے۔''

آگے لکھتے ہیں:۔

''یہ اشتہار تو بہ جو مکۂ معظمہ میں طبع ہوا، اور اس کی نقل مطبع نظامی کانپور ضمیمہ نور الانوار ۵/ جنوری ۱۸۸۴ء میں چھپا ہے صحیح ہے یا نہیں، اور حقیقت اس کی کیا ہے، جواب عریضہ ہذا پشت عریضہ پر تحریر فرمایا جاوے''۔(۱)

اس خط کی پشت پر مولانا سید نذیر حسین صاحب کا جواب ہے جس میں انہوں نے ان سب افواہوں اور غلط بیانیوں کی تردید کی ہے۔

اس ایک واقعہ سے اس پورے ماحول کی عکاسی ہوتی ہے جو قیام ندوۃ العلماء سے پہلے ہندوستان میں قائم تھا، یہ ایسا ماحول تھا جس میں مسلکِ اعتدال کی دعوت بھی جرم تھی، اور اس پر چلنے والے کو وہ دشواری تھی جو بہاؤ کے خلاف تیرنے والے کو ہوتی ہے۔

---

(۱) مجموعہ خطوط قلمی

جو اہل عزیمت ہوا کے رخ پر چلنے سے انکار کرتے اور حق پرستی اختیار کرتے، ان کی آواز ہوا وتعصب کے اس نقار خانہ میں کوئی نہ سنتا، قوم کا مزاج بگڑ گیا تھا اور علماء کی ایک بڑی تعداد نے اپنی کشتی اس تیز وتند دھارے کے حوالے کر دی تھی۔

اہل حدیث کا احناف سے بغض وعناد اس درجہ بڑھ گیا تھا کہ اس نے اخلاقی اور انسانی حدود کو بھی نظر انداز کر دیا تھا۔

مولانا سید عبدالحیؒ نے آج سے ۶۵ برس پہلے دہلی اور اس کے اطراف کا سفر کیا، اپنے سفر نامہ میں انہوں نے ایک عبرتناک واقعہ لکھا ہے جس کو پڑھ کر اخلاقی انحطاط، مذہبی تفریق اور شعور وحیاء کے فقدان کی تصویر نگاہوں کے سامنے پھر جاتی ہے، اور مسلمانوں کی زبوں حالی اور علماء کی تفرقہ پرستی پر کبھی ہنسی آتی ہے کبھی رونا۔ ایک ابھرتی ہوئی فاتح قوم جس کی خصوصیات اور صلاحیتیں اپنے عروج پر تھیں، اور ایک مغلوب، خستہ حال وشکستہ دل، اور بے شعور قوم کے درمیان جو اپنی خصوصیات اور صفات کو یکسر بھلا بیٹھی تھی، ایک ایسا مقابلہ تھا جس کی ہار جیت کا فیصلہ بہت عرصہ پیشتر بالاکوٹ کے میدان میں ہو چکا تھا۔ مولانا اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

”یہ قصہ مولوی عبدالعلی صاحب (۱) نے بیان کیا کہ سبزی منڈی یہاں بہت قریب ہے۔ اس محلّہ میں ایک مولوی صاحب آ کر رہتے تھے وہ غیر مقلد تھے، میاں صاحب (مولانا سید نذیر حسین صاحب) کے مدرسہ میں رہتے تھے، وہاں کرایہ کا ایک مکان تھا، اس میں ایک بیوی صاحبہ تھیں۔ اسی محلّہ میں ایک کبیر السن میاں جی رہتے تھے وہ پابند اوقات تھے، محلّہ کے لوگ ان کی تعظیم کرتے تھے۔ ایک دن ایک بڑھیا نے ان سے آ کر کہا مولوی صاحب کی بیوی نے آپ کو بلایا ہے، کھڑے کھڑے ذری کی ذری سن جایئے۔ میاں جی صاحب گئے، پردے کے پاس بیوی صاحبہ نے آ کر کہا کہ آپ باخدا آدمی ہیں، مجھ کو للہ ظالم کے

---

(۱) مولانا عبدالعلی مدرسہ شیخ حسین بخش (دہلی) میں مدرس اول تھے۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا احمد علیؒ اور مولانا فیض الحسن کانپوریؒ سے شرف تلمذ حاصل تھا، لیکن زیادہ تعلق مولانا محمد قاسم صاحب سے تھا، اور انہیں سے ارادت رکھتے تھے۔

پنجہ سے چھڑا دیجیے؟ انہوں نے کہا خیر ہے: اس نے کہا خیر کہاں شر ہے، یہ میرا پیر ہے، میں اس کی مرید، میرے خاوند موجود ہیں، دھوکہ سے مجھ کو نکال لایا ہے۔ میاں جی صاحب کو سن کر نہایت ہی تعجب ہوا، اور واقعی تعجب کی بات ہے۔ میں نے یہاں تک جب قصہ سنا تو مجھ کو عجب حیرت ہوئی۔ مولوی صاحب فرمانے لگے کہ میاں جی نے اس کی تسلی تشفی کی اس کے بعد چلے آئے، لیکن موقع کے منتظر رہے۔ ایک دن مولوی صاحب نے خلوت میں کہا کہ مجھ کو تنہائی میں آپ سے ایک راز کہنا ہے بشرطیکہ وہ کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے آپ تک رہے۔ انہوں نے کہا فرمائیے۔ میاں جی صاحب نے کہا کہ میں بھی آپ کا ہم مذہب ہوں مگر حضرت کیا کہیے، اس محلّہ کے لوگ ایسے سخت ہیں، آپ جانتے ہیں کہ یہ لوگ آدمی مار ڈالتے ہیں اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی، اگر میں اظہار کروں تو خدا جانے میری کیا حالت ہو۔ مولوی صاحب نے کہا خیر یہ بہت مناسب ہے، آپ اپنا مطلب کہیے۔ انہوں نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ اس محلّہ میں ایک عورت سے مجھ کو کمال درجہ الفت ہے، لیکن اس کا خاوند موجود ہے، میں چاہتا ہوں کہ کوئی ایسی تدبیر ہو کہ وہ میرے قابو میں آجائے اور شریعت میں بھی جائز ہو؟ انہوں نے کہا کہ یہ کوئی دشوار امر نہیں ہے، یہ لوگ یعنی حنفی المذہب مستحل الدم ہیں، ان کا مال مال غنیمت ہے، ان کی بیویاں ہمارے واسطے جائز ہیں، آپ قابو میں لاسکتے ہیں تو شوق سے لائیے۔ انہوں نے کہا بس مجھ کو یہی چاہئے تھا، اور وہاں سے چلے گئے۔ دوسرے وقت محلّہ کے عمائد سے یہ قصہ بیان کیا اور یہ شرط کرلی کہ ان کو جان سے نہ ماریں۔ ان لوگوں نے اس عورت کے خاوند کو بلا بھیجا۔ جب مولوی صاحب نماز کے واسطے آگے بڑھے تو ایک شخص نے نہایت درشتی کے ساتھ ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا، اور نہایت ہی مرمت کی، اور خاوند اپنی جورو کو لے کر چلا گیا، یہ قصہ حال ہی کا ہے۔ مجھ کو اس کے سننے سے عورت کے نکال لانے پر اتنا استعجاب نہیں ہوا، جتنا ان کا حنفیہ کو مستحل الدم سمجھنے پر ہو، باوجودیکہ اس میں کچھ نہیں ہے۔

بھوپال میں عبداللہ نابینا کہتا ہے کہ ہندوستان میں صرف ڈھائی مسلمان ہیں۔ مولوی محمد بشیر صاحب حنفیہ کو مشرک سمجھتے ہیں۔"(۱)

مسجدیں تکفیر و تفسیق کا اکھاڑہ بن گئی تھیں جس کو مقلدین اور غیر مقلدین ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے استعمال کر رہے تھے۔ مسجدوں پر یہ لکھا جانے لگا تھا کہ یہ حنفیہ کی مسجد ہے اور یہ غیر حنفیہ کی۔ ایک دوسرے کی مسجدوں میں غلاظتیں پھینکنے کی وارداتیں بکثرت ہونے لگی تھیں، خاص طور پر مقلدین کی مساجد میں سڑے ہوئے گوشت کے ٹکڑے اور دوسری ناپاک چیزیں رات کے وقت ڈال دی جاتی تھیں۔ اس سفرنامہ میں دہلی کی جامع مسجد کا حال بیان کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:۔

"دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد جامع مسجد نماز کے واسطے گیا، نماز کے بعد جابجا وعظ ہونے لگا۔ منبر پر مولوی محمد اکبر وعظ کہتے ہیں کہ یہ بزرگ حنفیوں کا خوب خاکہ اڑاتے، دل کھول کر تبرا کرتے ہیں، اور اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ہدایہ پڑھانے سے توبہ کی ہے۔ فرماتے تھے آج کون ہے جس نے ہدایہ پڑھانے سے توبہ کر کے کلام مجید کی تعظیم کی شروع کی، سب جہنم میں جائیں گے۔ اور ہر ہر بات پر اپنی بڑائی بیان کرتے ہیں، ہر آیت کو اہل دہلی اور اپنے اوپر اتارتے ہیں، اہل دہلی کو ظالمین و مشرکین سے ملاتے ہیں اور اپنے تئیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عیاذاً باللہ۔ دوسرے صاحب مئذنہ کے پاس بھی اسی طور پر حنفیہ کا خاکہ اڑا رہے تھے لیکن کف لسان کے ساتھ۔ تیسرے صاحب دوسری جانب مئذنہ کے محدثین و متبعین سب کی خبر لے رہے تھے، انحنا و قیام تعظیمی کے منع کرنے پر سخت و سست کہہ رہے تھے۔ چوتھے صاحب حوض پر کچھ مناجاتیں اور نعتیہ غزلیں پڑھ کر لوگوں کو اپنی طرف راغب کر رہے تھے۔ الغرض ایک ہڑبونگ تھا، اس ہڑدنگے پن کو دیکھ کر نہایت افسوس ہوا، خدا کی مرضی میں کسی کو دخل نہیں، جب سلطنت اسلام جاتی رہی تو جس کا جو جی چاہے کرے۔"(۲)

---

(۱) دہلی اور اس کے اطراف:۵۹و۶۰ (۲) دہلی اور اس کے اطراف:۶۸و۶۹

فوجداری اور مقدمہ بازیاں

ڈریپر نے اپنی کتاب ''مذہب وسائنس'' میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''اسلام کی بڑھتی ہوئی فتوحات کو چارلس مارشیل کی تلوار نے نہیں روکا، بلکہ ان کے باہمی اندرونی فساد سے یورپ کو ان کے ہاتھ سے نجات ملی''۔

اور حق یہ ہے کہ ملت اسلامی کی شیرازہ بندی کو منتشر کرنے، اس کی قوت کو کمزور کرنے، اور دشمن کو اندر گھسنے کا موقع جتنا ان داخلی اختلافات نے دیا ہے اتنا خارجی حملوں نے نہیں۔ مذہبی تفریق اور تعصب اس درجہ پہونچ گیا تھا کہ اس کی نظیر شاید ہندوستان کی تاریخ میں نہ اس سے پہلے صدیوں میں ملے گی اور نہ اس کے بعد کے زمانہ میں۔ مناظروں تکفیر و تفسیق، دشنام طرازی وافتراء پردازی کے آگے بڑھ کر بات مقدمہ بازی اور فوجداری تک جا پہونچی تھی۔ اور ایک دو نہیں خاصی تعداد میں ایسے مقدمے غیر مسلم حکام کے سامنے پیش ہونے لگے جن پر غیر مسلموں کو ہنسنے کا موقع ملتا تھا۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ نہ صرف انگریزوں اور ہندوؤں کو بلکہ خود مسلمانوں کو اپنے دین اور ثقافت سے یک گونہ بدگمانی پیدا ہو رہی تھی۔ ان کے سامنے ایک طرف انگریزوں کا اتحاد، عیسائیوں کی ہم آہنگی اور سرگرمی تھی، دوسری طرف جماعتی تعصب کے یہ افسوسناک مظاہر تھے جن کے تصور سے ایک مسلمان کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔

مرزا حیرت دہلوی نے دو سگے بھائیوں کی لڑائی کا افسوسناک اور چشم دید واقعہ قلمبند کیا ہے جس کو پڑھ کر مسلمانوں کی زبوں حالی کی تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے:

''میں نے یہ خونی منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میں نے سگے بھائیوں کو لڑتے ہوئے خود ملاحظہ کیا ہے۔ میں نے یہ جگر کا شق کرنے والا ٹکڑا بڑے بھائی کی زبانی جب اس نے چھوٹے بھائی کا ہاتھ توڑ ڈالا ہے خود سنا ہے۔..........

افسوس! ہم مسلمان ہی نہ پیدا ہوتے تو یہ دردناک حادثہ نہ ہوتا۔ جب چھوٹا بھائی گرا ہے اور ایک ہولناک چیخ ماری ہے تو بڑے بھائی کا دل بھر آیا، اور خون برادری زور زور سے اس کی رگوں میں جوش مارنے لگا، ہاتھ سے لکڑی پھینک دی،

دوڑ کے اپنے بھائی سے لپٹ کر رونے لگا اور مذکورہ بالا فقرہ کہہ کہ ان کے مولویوں کی شان میں گستاخانہ الفاظ کہنے لگا جنہوں نے لڑوایا تھا اور یہاں تک نوبت پہونچائی تھی۔ اس جھگڑے میں صرف پنجابی تھے (پنجاب کے آدمیوں سے مراد نہیں بلکہ ان لوگوں سے مراد ہے جو دہلی میں مشہور ہیں (۱)''۔

ان ہی پنجابیوں کے متعلق مرزا حیرت نے لکھا ہے کہ:۔

''یہ وہ لوگ تھے جو یتیم خانوں اور تعلیم گاہوں کے قیام میں پیش پیش رہتے تھے اور ہر اجتماعی اور مفید منصوبہ میں بڑھ چڑھ کر مالی امداد دینے کے لئے تیار رہتے تھے اور اسلام کے نام پر بڑے بڑے کام اور قربانی کے لئے سب سے آگے نظر آتے تھے۔''

لیکن ان لوگوں کی اس صلاحیت اور قوت کا جو میدان بدقسمتی سے علماء نے ان کے لئے پسند کیا اس کا ذکر ابھی گزرا ہے۔ چنانچہ یہی قوم دیکھتے دیکھتے بأسهم بينهم شديد کی زندہ تصویر بن گئی، اور مختلف صفات اور صلاحیتوں کے افراد جو ایک لڑی میں پیوست تھے، باہم دست وگریباں اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آنے لگے، اور ان کو دین ومذہب اور شرافت وانسانیت کا بھی پاس نہ رہا۔

مرزا حیرت دہلوی کے رسالہ مقاصد ندوۃ العلماء سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں کوٹلہ والی مسجد میں صرف آمین بالجہر پر جھگڑا اتنا بڑھا کہ دو الگ الگ پارٹیاں بن گئیں، ایک پارٹی چاہتی تھی کہ آمین زور سے کہا جائے، اور ایک چاہتی تھی کہ چپکے سے۔ اس پر سخت لڑائی ہوئی، متعدد آدمی زخمی ہوئے پھر مقدمہ چلا اور اس پر ہزاروں روپیہ برباد ہوا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں پارٹیوں میں ہمیشہ کے لیے نفرت وعداوت پیدا ہوگئی اور پھر آج تک ختم نہ ہوئی۔

اسی طرح میرٹھ میں مقلدین اور غیر مقلدین کی کشمکش اتنی بڑھ گئی کہ ہائی کورٹ تک مقدمہ پہونچا۔ مرزا حیرت اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''چیف جسٹس نے جسٹس محمود کو (جب انہوں نے چیف جسٹس کے فیصلہ پر نکتہ چینی کی) مقدمہ فیصلہ کرنے کا اختیار دیا۔ مسٹر محمود نے جو کچھ فیصلہ کیا وہ ایسا سمویا ہوا تھا کہ اگر دونوں فریق اس پر رضا مند ہوجاتے تو پھر آگے کو کوئی جھگڑا نہ

---

(۱) مقاصد ندوۃ العلماء۔ از مرزا حیرت دہلوی: ص ۱۴

ہوتا، مگر نہیں، نئے نئے مقدمے پیدا ہو گئے، اور وہ نئی نئی شاخیں نکلیں کہ باہم گہری مخالفت کی بنیاد قائم ہو گئی جس کا سلسلہ ابھی تک ختم نہیں ہوا"۔(۱)

اس کے علاوہ علی گڑھ کا مشہور مقدمۂ زہر خورانی اس افسوسناک صورت حال کی ایک اور مثال ہے۔ مولانا لطف اللہ صاحب کو زہر دیا گیا لیکن وہ تکلیفیں اٹھانے کے باوجود بچ گئے۔ لاٹھیاں چلیں، مقدمہ بازی ہوئی اور وہ سب کچھ ہوا جو مسلمانوں کا سر شرم سے جھکا دینے کے لئے کافی ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک بدنما داغ ہے۔ بقول مرزا حیرت کے کہ:۔

"اگر یہ تمام کیفیت مفصل طور پر لکھی جائے اور مستقل کتابی صورت میں اس ماتمی حالت کو لایا جائے تو یہ وہ تاریخ ہو جو صدہا برس تک ہماری آئندہ مہذب نسلوں کو خصوصاً اور غیر قوموں کو عموماً ہم پر اور موجودہ اسلام پر خندہ زنی کا موقع دیگی"(۲)

قدیم وجدید کا مسئلہ

اس کے ساتھ ساتھ قدم قدم پر قدیم وجدید کی کشمکش تھی۔ ایک سرے پر وہ طبقہ تھا جو ہر جائز کو ناجائز سمجھتا تھا، اور دوسرے سرے پر وہ طبقہ تھا جس نے ہر ناجائز کو جائز رکھا تھا۔ بقول اکبر الہ آبادی ؎

ادھر یہ ضد ہے کہ لیمنڈ چھو نہیں سکتے
ادھر یہ ہٹ ہے کہ ساقی صراحی مے لا

بدلتی ہوئی دنیا اور سیاسی واجتماعی انقلابات سے متاثر ہو کر ایک بہت بڑے طبقہ نے ان تمام تغیرات کو جوں کا توں قبول کر لینا سب سے بڑی مصلحت اور دین کی خدمت سمجھی تھی۔ دوسرا طبقہ جو شاید اس سے بڑا تھا ان مسائل سے پہلوتہی اور چشم پوشی پر قانع اور مطمئن تھا، نہ اس کو مستقبل کے اس عظیم ترین خطرہ کا پورا احساس تھا، نہ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے وافر سامان۔

امت دو گروہوں میں منقسم ہو گئی تھی۔ ایک گروہ وہ تھا جس کو قدیم فلسفہ کے بے معنی اور لغو اور گمراہ کن مفروضات محض اس لئے گوارا تھے کہ ان پر قدامت کی چھاپ تھی، اور

---

(۱) مقاصد ندوۃ العلماء: ص ۱۵ (۲) مقاصد ندوۃ العلماء: ۱۶

بہت سے مفید و نافع علوم صرف اس لئے ناقابل قبول تھے کہ ان پر جدت کا الزام تھا۔ دوسرا گروہ وہ تھا جس نے قرآن وحدیث، فقہ وتفسیر اور اسلامی تاریخ کو بھی منطق وفلسفہ اور ہیئت و ہندسہ کی طرح قصۂ پارینہ سمجھ لیا تھا، قدیم وجدید کا یہ زبردست اور عمومی مغالطہ ملک کے طول وعرض پر محیط تھا، اور ہر خاص وعام اس میں گرفتار تھا، کسی کو اس کا ہوش نہ تھا کہ وہ اس مسئلہ کو عام روش سے ہٹ کر سوچے اور اس کا کوئی حل پیش کرے۔

ایک نئی اور جامع شخصیت کی ضرورت

انیسویں صدی کا یہ ہندوستان جس کی تصویر کشی گزشتہ اوراق میں کی گئی ہے ایک ایسے انسان کا منتظر تھا جس کی نگاہ قدیم وجدید کی اس مصنوعی اور سطحی تقسیم سے بالاتر ہو، اس کے نیک وبد اور خوب وناخوب کا معیار تاریخ اور زمانہ نہ ہو بلکہ تاریخ اور زمانہ خود اس کا پابند ہو، اسلام اس لئے برتر اور بہتر نہیں ہے کہ وہ آج سے چودہ سو برس پہلے کا مذہب ہے، بلکہ اس لئے کہ وہ خدا کا آخری دین اور انسانیت کی نجات کا واحد راستہ ہے۔ اسی طرح جدید علوم اور جدید ذرائع ووسائل اس لئے قابل قدر اور قابل تعریف نہیں ہیں کہ وہ بیسویں صدی کے صنعتی اور ترقی یافتہ عہد میں ظہور پذیر ہوئے ہیں، بلکہ اس لئے کہ وہ انسانوں کے لئے مفید ہیں اور ان کو نیک مقاصد کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

اس عہد انقلاب کو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جس میں نہ حلقۂ مدارس کی طرح ہر جدید سے نفرت اور ہر قدیم سے محبت ہو اور نہ جدید طبقہ کی طرح وہ مغرب کی ذہنی غلامی میں مبتلا اور اندھی تقلید کا شکار ہو، نہ اس میں جزئیات اور غیر ضروری اشیاء پر بیجا اصرار ہو اور نہ دین کے بنیادی اور ضروری اجزاء میں نرمی اور مداہنت۔ وہ ایک طرف زمانے کا نبض شناس، ملک کے سماجی اور عقلی تغیرات اور نئی نسل کی نفسیات سے بخوبی واقف ہو، دوسری طرف ایمان ویقین کا حامل وداعی، معرفت الٰہی کا محرم اسرار، اور رشد وہدایت اور اصلاح وتربیت کا قافلہ سالار ہو، عقائد اور اصول کے معاملہ میں فولاد کی مانند سخت ہو اور اجتہادی مسائل اور فروعی اختلافات کے شعبہ میں ریشم کی طرح نرم۔ اس میں مفید خیالات وتجربات سے فائدہ اٹھانے کی پوری صلاحیت اور قابلیت موجود ہو اور قرآن

وحدیث کی رہنمائی اور روشنی میں، نیز اپنے اجتہاد و بصیرت، ایمانی فراست، علم و مطالعہ اور فہم و تدبر سے کام لیتے ہوئے ان افکار و خیالات و تجربات میں حسب ضرورت ترمیم واضافہ کر سکے، اور ان کو اپنے اصولوں کے مطابق اور اپنے ماحول کے موافق بنا سکے۔

غرض ایک ایسی شخصیت جو ایمان ویقین اور علم جدید، روحانی قوت اور جدید صلاحیت، اخلاص و محبت اور علم و ثقافت، صالح قدیم ورثہ اور نئے علم و معلومات کو (جو اکثر متضاد خیال کئے جاتے ہیں) باہم جمع کر سکے اور ان میں صحیح تناسب اور فرق مراتب برقرار رکھ سکے، اس عہد کی اولین ضرورت تھی، یہ شخصیت انیسوی کے اواخر میں مولانا سید علی مونگیریؒ کی صورت میں جلوہ گر ہوئی، جن کا تذکرہ ان اوراق کی زینت اور تذکرہ نگار کے لئے باعث سعادت ہے۔

مولانا کی شخصیت کے تین اہم عوامل

مولانا کی سیرت اور شخصیت کی تعمیر میں جو عوام واسباب (Factors) کارفرما تھے، ان میں تین چیزیں بہت نمایاں ہیں جن سے ان کی شخصیت کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

مولانا کی زندگی اور ان کے دینی و علمی و اصلاحی کارناموں کے مطالعہ سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ درس نظامی اور نزاعی باہمی کے اس ماحول میں جو ملک کے طول وعرض پر محیط تھا اور مجادلہ و مناظرہ کی اس فضا میں جس سے کم وبیش کوئی علمی و دینی طبقہ محفوظ نہ تھا، مولانا نے اپنے کو ان مسموم اثرات سے کس طرح محفوظ اور نہ صرف محفوظ رکھا بلکہ ۱۳۱۰ھ میں اس عہد آفریں تحریک ندوۃ العلماء کی بنیاد ڈالی، جو نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پورے عالم اسلام میں ایک منفرد اور جرأت مندانہ تجربہ تھا، اور جس کی بنیاد ہی قدیم وجدید کی جامعیت اور رفع نزاع باہمی پر تھی۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جدید رجحانات اور جدید تقاضوں سے جو واقفیت مولانا کو حاصل تھی اور زمانہ کی تغیر پذیری اور انقلاب آفرینی کا جو احساس مولانا کے اندر موجود تھا، وہ کس طرح پیدا ہوا، اور اس کے اسباب کیا تھے؟

تیسرا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ مولانا کو ارشاد و سلوک اور تزکیہ و تربیت کے شعبہ میں

جوقبول عام اور رتبۂ بلند حاصل تھا، اس کے یہ ذوق ورجحان کس طرح پروان چڑھا(۱)، اور ان سب شعبوں میں یہ حسین اور خوشگوار امتزاج کس طرح پیدا ہوا جس نے ان کو اسلامیان ہند کے لئے عام طور پر اور ندوۃ العلماء کے فرزندوں اور خادموں کے لئے خاص طور پر ایک مثالی پیکر، ندوۃ العلماء کے تخیل کا زندہ عنوان اور ایک قابل تقلید مثال بنادیا ہے۔

پہلا سبب

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے اس سلسلے میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ مولانا کے ذہن ونظر کی صفائی، سچائی اور سادگی اور جماعتی کشمکش سے ان کی علیحدگی میں ان کے خاندانی ماحول اور سوسائٹی کو بڑا دخل تھا وہ خوش قسمتی سے کسی ایسے گروہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے جو اس ''سرد جنگ'' کا شکار ہو ان کے آباء کرام، ان کے اساتذہ، ان کے ہم درس رفقاء بیشتر وہ لوگ تھے جن کو ان چیزوں میں غلو پسند نہ تھا، اور نہ وہ ان اختلافی مسائل سے کچھ زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔

ان کے بچپن کے ساتھی اور دوست مولوی امام علی ایک متقی اور صالح نوجوان تھے جن کو ان جھگڑوں سے کچھ سروکار نہ تھا، مفتی عنایت احمد کاکوروی اور مولانا لطف اللہ علی گڑھی کو درسی وتدریسی زندگی کی شبانہ روز مشغولیت سے اس کی فرصت نہ تھی کہ وہ ان چیزوں میں وقت ضائع کریں۔ مولانا لطف اللہ صاحب اپنے مرتبۂ علمی، افادۂ عام، اور شہرت کے باوجود بہت متواضع اور کریم النفس انسان تھے اور بہت معتدل جامع وصلح پسند طبیعت رکھتے تھے، انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی کی تکفیر نہیں کی، یہی وجہ ہے کہ ندوۃ العلماء کے قیام کے بعد وہ اس میں برابر شریک رہے اور اس کے متعدد سالانہ جلسوں کی صدارت کی۔ دوسری طرف ابتداء میں مولانا شاہ کرامت علیؒ اور اس کے بعد مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کی ارادت وبیعت نے ان کی توجہ ان مسائل کی طرف کم کردی۔

اس سوسائٹی اور ماحول کی وجہ سے وہ نہ صرف اس فضا کے مضر اثرات سے محفوظ رہ

---

(۱) راقم سطور کو اس میں کوئی اشکال نہیں ہے لیکن عام طور پر لوگوں کے دلوں میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے، خاص طور پر وہ لوگ جو تصوف کو اسلام سے علیحدہ کوئی چیز سمجھتے ہیں۔

سکے، بلکہ باہر رہ کر انہوں نے اس کشمکش اور مسلم معاشرے پر اس کے غلط اثرات کا جائزہ لیا۔ اس ماحول نے ان کو محفوظ تو ضرور کر لیا تھا لیکن محدود نہیں کیا تھا۔ دوسرے علماء سے ان کا رابطہ برابر قائم تھا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ایک طرف وہ جادۂ اعتدال پر مضبوطی سے قائم رہ سکے، دوسری طرف علماء کے ذہنی پس منظر اور ان کے اختلافات کی حقیقت اچھی طرح ان پر ظاہر ہوگئی، حدیث وفقہ سے شغف آغاز عمر ہی سے تھا اور فلسفہ ومنطق سے طبیعت بیزار اور متنفر تھی، اس لئے ان لا طائل مباحث پر انسانی ذہانت اور صلاحیت کا صرف بیجا ان کو کسی طرح درست نہ معلوم ہوا۔

اگر مولانا محمد علیؒ کسی ایسی جماعت سے تعلق رکھتے جو اس کشمکش کا شکار ہوتی، تو باوجود خواہش اور کوشش کے وہ اپنے دل ودماغ، افکار وخیالات اور جذبات واحساسات کو اس کے اثر سے مطلقاً آزاد نہیں کر سکتے تھے، اس کا عکس پڑنا ان پر لازمی تھا لیکن قدرت نے ان کے لئے جو سامان کیا تھا اس کی وجہ سے ان کو ان حالات کو سمجھنے، ان کا غیر جانبداری سے مطالعہ کرنے، ان پر سنجیدگی اور دلسوزی سے غور کرنے اور ان کا حل تلاش کرنے میں بڑی مدد ملی، اور اس موقع سے انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔

دوسرا سبب

جہاں تک جدید تقاضوں اور جدید رجحانات سے مولانا کی واقفیت کا تعلق ہے، اس میں بنیادی حصہ مولانا کے اس کارنامہ کا ہے جو انہوں نے عیسائیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے میں انجام دیا۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں کے بعد اس فتنہ کے سدباب کے لئے جو شخصیت سب سے زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آئی وہ مولانا ہی کی شخصیت تھی۔ انہوں نے اپنے قلم اور زبان سے عیسائی مشنریوں کا پوری طرح مقابلہ کیا، اور اس طرح قدرتی طور پر مشنریوں کا طریقہ کار اور جدید ذرائع ووسائل کا استعمال، ان کی تکنیک علمی طور پر ان کے سامنے آئی اور انہوں نے دیکھا کہ یہ لوگ کن کن میدانوں میں کام کرتے ہیں، اور کیا کیا ذرائع ووسائل استعمال کرتے ہیں۔ کانپور میں یتیم خانہ کا قیام، جہاں یتیم ولاوارث بچے تعلیم حاصل کر سکیں، اور عیسائیوں کے جال میں گرفتار نہ ہوں،

اسی تجربہ اور مقابلہ کا نتیجہ تھا۔

حلقۂ درس سے نکل کر ان مشنریوں کا مقابلہ کرنے سے جدید طریقۂ کار اور جدید ذہن و مزاج کی ایک نئی دنیا مولانا کے سامنے آئی، ان کو نئے نئے تجربات حاصل ہوئے، بدلتی ہوئی دنیا کے مسائل سے واقفیت پیدا ہوئی، جن کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا مشنریوں کا خاص حربہ تھا اس کا علم ہوا، اور ان کمزوریوں کو دور کرنے کی طرف توجہ ہوئی۔ مشنریوں کے باہمی اتفاق، نرم رویہ، جذبۂ اتحاد اور دلآویز طرز عمل کا اندازہ ہوا، اس کے مقابلہ میں علماء کے درشت رویہ اور باہمی کشمکش کا منظر بھی سامنے آیا، رفتار زمانہ اور عصری مسائل سے مشنریوں کی واقفیت کے مقابلہ میں علماء کی علیحدگی پسندی، قدیم پرستی اور بے خبری ظاہر ہوئی، اور اس بات سے مولانا کو یہ اندازہ ہوا کہ ہمارے نظام تعلیم میں ایک انقلابی تبدیلی کی ضرورت ہے اور جب تک یہ تبدیلی عمل میں نہیں آئے گی، مدارس کی موجودہ فضا اور حالات کے رخ میں بھی کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

تیسرا سبب

تصوف وارشاد اور سلوک و تربیت کے ساتھ اس ذوق و رجحان کی پرورش میں مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کے فیض صحبت و تربیت کا بڑا حصہ ہے۔ خوش قسمتی اور نعمت خداوندی تھی کہ مولانا محمد علی کو شیخ بھی ایسا ملا جس کا دامن منطق و فلسفہ کی آلودگیوں سے بالکل پاک تھا اور جس کے ذہن کی وسعت اور قلب کی فراخی کا یہ عالم تھا کہ اس نے سرسید احمد خاں کے لئے بھی جو اس زمانہ میں علماء و مشائخ میں مطعون تھے، تعریفی کلمات کہے، اور حاجی وارث علی صاحب دیویٰ (جو اپنے خاص احوال و کیفیات اور بعض غیر شرعی اشغال کی وجہ طبقۂ علماء میں ملعون تھے) کی مذمت بھی اپنی مجلس میں گوارا نہ کی۔

مولانا فضل رحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کے اس ذہن و مزاج کا اندازہ ذیل کے ایک واقعہ سے بخوبی ہوسکتا ہے جس میں انہوں نے اہل تشیع کیساتھ غیر معمولی برتاؤ اور حسن سلوک کا عجیب و غریب ثبوت دیا۔

مولانا شاہ تجمل حسین بہاری جو مولاناؒ کے خلیفہ ہیں اپنی کتاب ''کمالات رحمانی'' میں لکھتے ہیں:۔

''اہل تشیع کے شہر پورنیہ کے رئیس صاحب مشہور تھے، حضرت قبلہؒ کے ہاں تشریف لائے، وہاں کے بعض خواتین نے شور مچایا کہ ایک رافضی مسجد میں گھسا آتا ہے۔ حضرت قبلہؒ نے ان کو کہا کہ تم ہمارے حجرہ میں ٹھہرو، اور فرمایا کہ یہ حضرت مرتضیٰ علیؓ کے مہمان ہیں۔ بعد بہت گفتگو کے ان اہل تشیع صاحب نے فرمایا کہ آپ سے اعتقاد تو ہوا، مگر ہم مرید نہیں ہوں گے اور مذہب اپنا نہیں چھوڑیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ مذہب چھوڑنے کا کیا کام ہے، حضرت مرتضیٰ علیؓ سے محبت رکھو اور بی بی فاطمہؓ اور امام حسینؓ سے محبت رکھو، مگر ایک شعر پر عمل رکھو، اور وہ شعر یہ ہے:۔

نہ تھی عیب کی جب ہمیں اپنی خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر

پڑی اپنی خطاؤں پر جب کہ نظر تو نگاہوں میں کوئی برا نہ رہا

جب وہ اپنے وطن گئے تو شب و روز چلتے پھرتے یہی شعر پڑھتے تھے، اور کوئی شغل دوسرا نہ تھا۔(۱)

غیر مقلدین کے ساتھ ان کا رویہ تھا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جو مؤلف موصوف نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

''ایک غیر مقلد صاحب مولوی محمد ابراہیم آرہ کہ آخر میں انہوں نے تصوف کا رنگ پکڑا تھا، مراد آباد کی مسجد میں آکر اکہری تکبیر کہی، لوگوں نے غل مچایا کہ ایک فتنہ باز غیر مقلد کدھر سے آ گیا۔ حضرت قبلہ نے سب کو روکا اور کہا حدیث کے ساتھ بے ادبی نہ کرو، ابوداؤد میں ایسی بھی ایک روایت آئی ہے''۔(۲)

مولانا فضل رحمٰنؒ معقولات کے شدید مخالف تھے۔ مولانا محمد علیؒ خود ''ارشاد رحمانی'' میں لکھتے ہیں کہ:۔

''طالب علمی کے زمانہ میں جب مولاناؒ سے میری ملاقات ہوئی تو مجھ سے دریافت فرمایا کہ تم کیا پڑھتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ قاضی مبارک، ارشاد ہوا استغفر اللہ نعوذ باللہ قاضی مبارک پڑھتے ہو، اس سے کیا حاصل، ہم نے فرض کیا

---

(۱) آخر میں یہ صاحب باقاعدہ اہل سنت والجماعت میں داخل ہو گئے۔ نقل از کمالات رحمانی: ص ۲۶

(۲) کمالات رحمانی: ص ۲۷

کہ منطق پڑھ کر قاضی مبارک کے مثل ہو گئے پھر کیا؟ قاضی مبارک کی قبر پر دیکھو کیا حال ہے، اور ایک بے علم کی قبر پر جاؤ جس کو خدا سے نسبت تھی اس پر کیسے انوار وبرکات ہیں۔'' (۱)

مصنف ''کمالات رحمانی'' لکھتے ہیں:۔

''ایک بار مولوی احمد حسن کانپوریؒ حضرت مولانا کے پاس تشریف لے گئے، تو آپ نے حسب عادت دریافت کیا کہ:۔تم کیا پڑھتے ہو؟ انہوں نے سب علموں کا نام لیا، معقولات زیادہ بتایا۔ حضرتؒ نے معقولات پڑھنے پڑھانے کی بہت ہجو کی، اور فرمایا کہ:۔ منطق زیادہ پڑھانے سے قلب سیاہ ہوجاتا ہے، حدیث وفقہ زیادہ پڑھا کرو''۔ (۲)

یہی وجہ ہے کہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کے تعلق سے ان کے اس ذہن ومزاج اور طرز فکر کو اور جلا ہوئی، اس صحبت نے ان کے حق میں دو آتشہ کا کام کیا، اور ان کو ان دونوں پہلوؤں کے جمع کرنے اور ان دونوں کے حدود سمجھنے میں بڑی مدد دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف انہوں نے ایک نئے نصاب درس اور طریقہ تعلیم کا مکمل خاکہ پیش کیا جو اس عہد کے لئے سب سے زیادہ موزوں اور ملت اسلامی کے نئے مسائل اور دشواریوں پر قابو پانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے، دوسری طرف وہ ایک مرشد روحانی اور مصلح ومربی کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آئے جن کے ذریعہ ہزاروں لاکھوں بندگان خدا کی اصلاح ہوئی۔ اور جن کے فیض وتاثیر سے انسانوں کی کثیر تعداد فیضیاب ہوئی، عقل اور قلب کا یہ متوازن اور صحت منداجتماع، باطنی کیفیات وحالات اور فکر ونظر کی وسعت وبلندی کا یہ کامیاب نمونہ اس دور آخر کی ایک نادر مثال ہے، اور یہ مولانا محمد علیؒ کا وہ امتیاز ہے جس نے ان کو ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں ایک منفرد جگہ عطا کی ہے اور ان کی شان کو دوبالا کر دیا ہے۔

---

(۱) ارشاد رحمانی:۴،۵ (۲) کمالات رحمانی:۵۷

باب چہارم

ندوۃ العلماء کا قیام
اور
مولانا کا دورِ نظامت وترقی

پہلا بنیادی جلسہ

علماء کی باہمی کشمکش، فقہی اختلافات کی شدت، حقیقی مسائل سے پہلو تہی، اور وقتی یا مصنوعی مسائل پر زور آزمائی، مناظروں کی گرم بازاری اور تکفیر کا رواج، نئے فتنوں کی طرف سے غفلت، اور غیر ضروری چیزوں پر اصرار، یہ وہ حوصلہ شکن حالات تھے جن میں مولانا محمد علیؒ نے ندوۃ العلماء کا تخیل اسلامی ہند کے سامنے پیش کیا۔

۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیض عام کانپور کے جلسۂ دستار بندی کے موقع پر علماء کی ایک مجلس مشاورت نے اتفاق رائے سے یہ بات طے کی کہ علماء کی ایک مستقل انجمن قائم کی جائے اور آئندہ سال دستار بندی کے موقع پر اس کا پہلا عام جلسہ منعقد کیا جائے، اور ہندوستان کے تمام ممتاز علماء کو اس میں شرکت کی دعوت دیجائے۔ اس مجلس میں شریک ہونے والے بعض ممتاز اور نامور علماء کے نام نامی حسب ذیل ہیں، ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کی اس وقت کچھ زیادہ شہرت نہ تھی، لیکن بعد میں وہ اسلامی ہند کے مطلع پر

آفتاب وماہتاب بن کر چمکے اور اس کی فضاؤں کو علم اور روحانیت سے معطر کر دیا۔

۱۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ (مدرس اول مدرسہ دار العلوم دیوبند)
۲۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ (مدرس مدرسہ جامع العلوم کانپور)
۳۔ مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ (مدرس دوم دار العلوم دیوبند)
۴۔ مولانا شاہ محمد حسین الہٰ آبادیؒ
۵۔ مولانا سید محمد علی مونگیریؒ
۶۔ مولانا لطف اللہ علی گڑھیؒ
۷۔ مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ
۸۔ مولانا نور محمد پنجابیؒ (صدر مدرس مدرسہ اسلامیہ فتح پور)
۹۔ مولانا احمد حسن کانپوریؒ
۱۰۔ مولانا شاہ سلیمان پھلوارویؒ
۱۱۔ مولانا سید ظہور الاسلام فتحپوریؒ
۱۲۔ مولانا عبد الغنی خاں، مئو رشید آبادیؒ
۱۳۔ مولانا حکیم فخر الحسن گنگوہیؒ
۱۴۔ مولانا شاہ تجمل حسین دیسنویؒ

روئداد ندوۃ العلماء ۱۳۱۱ھ بابت سال اول حصہ اول میں مولانا محمد علی اس ابتدائی اور بنیادی جلسہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ''۱۳۱۰ھ میں جب بہت سے نامور علماء مدرسہ فیض عام کانپور کے جلسۂ دستار بندی میں رونق افروز ہوئے، اس وقت بعض دور اندیش علماء نے تحریک کی کہ ایک انجمن علماء کی قائم کی جائے تاکہ جو خرابیاں مسلمانوں میں خصوصاً ان کی تعلیم میں واقع ہوگئی ہیں، ان پر غور کرے اور علماء میں اتحاد پیدا ہو، اس تحریک کو تمام علماء موجودین نے پسند فرمایا اور اس وقت آئندہ کارروائی کرنے کی غرض سے عہدہ دار بھی منتخب ہوئے''۔

اس عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان علماء کو پہلے سے اس قسم کی کوئی اطلاع نہیں دی

گئی تھی، بلکہ عین وقت پر یہ تجویز پیش کی گئی، اور چونکہ اس ضرورت کا احساس ان علماء کے اندر موجود تھا اس لئے یہ تحریک پسند کی گئی اور اس نے اسی وقت عملی قالب بھی اختیار کر لیا۔

اس مجلس میں انجمن کا نام ''ندوۃ العلماء'' تجویز ہوا، اور مولانا سید محمد علی مونگیریؒ اس کے ناظم اول مقرر ہوئے، اور ان سب حضرات نے جو شریک جلسہ تھے اس اسکیم پر تائیدی دستخط کیے۔

ندوۃ العلماء کا تخیل سب سے پہلے کس کے ذہن میں آیا، اس کے متعلق سب سے مستند قول مولانا حبیب الرحمٰن شروانیؒ کا ہے، وہ مولانا سید محمد علیؒ کے صاحبزادہ مولانا لطف اللہ مرحوم کو ایک خط میں صاف صاف لکھتے ہیں:۔

> ''.....ندوۃ العلماء کے قیام کا اولاً موصوف ہی کے دماغ میں خیال پیدا ہوا تھا، جس پر سارے ملک نے لبیک کہا، آج اس کے آثار ملک وملت کے سامنے ہیں۔''(١)

ندوۃ العلماء کے تعارف کے لئے پہلا وفد

مولانا سید محمد علیؒ نے یہ ذمہ داری قبول کرنے کے بعد محسوس کیا کہ ان مقاصد کے تعارف کے لئے بڑے پیمانے پر وسیع جدوجہد کی ضرورت ہے۔ انہوں نے خاص طور پر اخبارات سے فائدہ اٹھانا چاہا اور اس میں مضامین بھیجے، دوسری طرف جلسۂ عام کے لئے زمین ہموار کرنے اور علماء سے رابطہ پیدا کرنے کی پوری کوشش کی۔

مولانا مشتاق علی صاحب (٢) کو (جو اس وقت مدرسۂ اسلامیہ فیض آباد میں مدرس تھے اور اس بنیادی جلسہ میں شریک بھی تھے) اس پر مامور کیا گیا کہ وہ ندوہ کے تعارف کے لئے ہندوستان کے کچھ اہم علاقوں کا ایک دورہ کریں، ندوہ کا یہ گویا پہلا وفد تھا جس نے اس سلسلہ کا آغاز کیا:۔

---

(١) مقالہ متعلقہ سوانح از مولانا منت اللہ رحمانی: ٣١ (٢) مولانا مشتاق علی صاحب نگینہ (بجنور) کے رہنے والے تھے۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا سید احمد مدرس دوم دارالعلوم دیوبند، اور مولانا احمد علی محدث سہارنپوری سے درسیات وحدیث کی تکمیل کی۔ اور مدرسۂ اسلامیہ فیض آباد میں مدرس ہوئے۔ ندوہ کے ابتدائی دور میں ان کی قیمتی کوششوں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

مولانا مشتاق علی صاحب نے بہت خوبی اور دلچسپی کے ساتھ یہ اہم کام انجام دیا۔ انہوں نے جن علاقوں کا دورہ کیا ان میں دیوبند، رام پور، پٹنہ، نگینہ، نجیب آباد، اٹاوہ، علی گڑھ، جھانسی، بھوپال، ملکہ پور، برار اور بمبئی شامل ہیں۔ بمبئی سے وہ کامران ہوتے ہوئے جدہ گئے، اور مکہ معظّمہ و مدینہ منورہ کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے۔

ان کے ساتھ ارکان کی طرف سے مولانا محمد علیؒ کی لکھی ہوئی ایک تحریر تھی، جس میں ندوۃ العلماء کے مقاصد کو دو حصوں میں بیان کیا گیا ہے۔ شاید یہ پہلا رسمی بیان تھا جو اس بنیادی جلسہ کے بعد عام اشاعت کے لئے دیا گیا، اس میں ندوۃ العلماء کے قیام کی دو غرضیں بتائی گئی ہیں، اور قابل لحاظ بات یہ ہے کہ اس میں غیر معمولی طور پر صراحت سے کام لیا گیا ہے۔

غرض اول

چونکہ اس زمانہ میں دیکھا جاتا ہے کہ جو طلبہ علوم عربیہ سے فارغ ہوتے ہیں، وہ امور انتظامی دنیا اور معیشت سے محض ناواقف رہتے ہیں اور بوجہ زیادہ عمر صرف ہوجانے کے کچھ اور کر بھی نہیں سکتے، اس لئے وہ بے موقع طور سے اہل دنیا کے محتاج ہوتے ہیں اور عوام کی نظروں میں بے وقعت اور بیکار ٹھہرتے ہیں، اور علوم دینیہ سے بھی جیسی واقفیت ہونی چاہئے نہیں رکھتے، بلکہ جو علوم دینی اس وقت کے مناسب اور دین کے معین ہیں، ان سے بھی وہ ناواقف رہتے ہیں۔ یہ انجمن ان سب باتوں پر غور کرکے اولاً سلسلۂ تعلیم کو درست کرنے اور بالاتفاق تمام مدارس اسلامیہ میں جاری ہوجانے کی کوشش کرے۔ اور جو امور ان طلبہ کی تہذیب واخلاق اور ترقی علم میں مفید سمجھے حتی الوسع ان کے اجراء میں سعی کرے۔

غرض دوم

اس وقت ہمارے علماء کی باہمی نزاعیں سخت نقصان پہونچا رہی ہیں اور بہت سے چھوٹے چھوٹے امروں پر بڑا فساد برپا ہوتا ہے جس سے علماء اسلام اور خود ہمارے پاک مذہب اسلام کی مخالفین کی نظروں میں اہانت ہوتی ہے، یہ انجمن کوشش کرے کہ یہ باہمی

نزاع نہ ہونے پائے، اور جب کوئی اختلاف کسی گروہ میں واقع ہوا کرے تو وہ اس انجمن کے ذریعہ طے ہو جایا کرے۔(۱)

علماء کی طرف سے استقبال

اس تحریک کا علماء میں عام طور پر گرمجوشی سے استقبال ہوا، بھوپال کے تقریباً سب ہی اہم علماء نے اس سے اتفاق کیا اور تائید میں دستخط کر دیئے، جھانسی کے علماء نے بھی دستخط کیے، نجیب آباد میں سب حضرات نے اس سے اتفاق کا اظہار کیا، بمبئی میں مدارس کے ذمہ داروں سے گفتگو ہوئی، اور ان سب نے ندوۃ العلماء کی ضرورت کو تسلیم کیا اور دستخط کیے۔

مولانا شبلیؒ سے ملاقات اور ندوہ کا تعارف

علی گڑھ میں مولانا مشتاق علی صاحب نے مولانا شبلیؒ سے ملاقات کی اور ندوۃ العلماء کے تخیل ونصب العین، اصلاح نصاب اور رفع نزاع باہمی پر ان سے گفتگو کی، مولانا شبلیؒ اس وقت مدرسۃ العلوم یعنی محمڈن کالج علی گڑھ میں استاذ تھے، مولانا نے ان اغراض ومقاصد سے اتفاق کا اظہار کیا۔ علی گڑھ میں اور حضرات سے بھی اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی اور تقریباً سب نے اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔

حاجی امداد اللہ صاحب کی تائید

حجاز میں یہ انجمن کا پہلا تعارف تھا جب مولانا مشتاق علی صاحب نے مدینہ منورہ کے علماء کے سامنے ندوہ کا تخیل اور اغراض ومقاصد پیش کیے اور انہوں نے اس کی ضرورت واہمیت تسلیم کی۔ مکہ معظمہ میں حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ سے انہوں نے خاص طور پر ملاقات کی، اور سب حالات اور کارروائی لکھی ہوئی ان کے سامنے پیش کی، مولانا اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اس کاغذ کو اپنے دستخط سے مزین فرمایا۔(۲)

---

(۱) روئداد ندوۃ العلماء سال اول حصہ اول: ۱۴ (۲) روئداد ندوۃ العلماء سال اول حصہ اول

ندوۃ العلماء کا مقصد مولاناؒ کے قلم سے

ندوۃ العلماء کے قیام اور جلسۂ عام کے انعقاد کے اسباب و محرکات کیا تھے، بہتر ہوگا اگر اس کو مولانا ہی کی زبان سے براہ راست سنا جائے، روئداد سال اول حصہ اول میں مولانا نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس زمانہ میں طلبہ کی جو حالت تھی، اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''ان مدارس سے دو وقت طلبہ نکلتے ہیں، اول وقت یہ ہے کہ اثنائے تحصیل میں فکر معیشت جب انہیں پریشان کرتی ہے اور کوئی سبب اتفاقی پیش آتا ہے اور مضطر ہو کر تحصیل علم سے دست بردار ہو جاتے ہیں، اس حالت میں افسوسناک امر یہ ہے کہ جس قدر عمر انہوں نے اس علم کی تحصیل میں صرف کی وہ محض بیکار گئی، نہ دنیا کے کام آئی نہ دین کے، کیونکہ جو علم انہوں نے پڑھا وہ کسب معاش کا ذریعہ ہو ہی نہیں سکتا، اب رہا دین اس کی حالت یہ ہے کہ سلسلۂ درس میں اس قدر معقول کی کتابیں بڑھا دی گئی ہیں کہ عرصہ تک وہ کلی اور جزئی کے سوا کچھ نہیں جانتے، اگر کوئی مسئلہ فقہ کا دریافت کیجئے تو اس سے بے خبر، عقائد و کلام کی کوئی بات پوچھئے تو اس سے ناآشنا، قرآن مجید کی کسی آیت یا کسی حدیث کا مطلب ان سے حل ہو سکے، یہ تو غیر ممکن، اس سے تو ان کے کان آشنا ہی نہیں ہوئے۔''

آگے لکھتے ہیں:۔

''دوسرا وقت ان کے نکلنے کا وہ ہے جب فارغ التحصیل ہوتے ہیں، ان میں سے بھی اکثر کی حالت تو قریب قریب اول ہی گروہ کی ہوتی ہے اور جو صاحب خداداد طبیعت کی وجہ سے ذی استعداد ہوئے، تو اب انہیں یہ فکر درپیش ہوئی کہ گزر اوقات کس طرح ہو، معاش کے پیدا کرنے کی کیا سبیل ہے، اس فکر میں یا تو جو کچھ استعداد تھی وہ بھی ضائع کر دی اور پریشان پھرتے رہے، یا وعظ وغیرہ کے ذریعہ سے بسر اوقات شروع کی جس کی وجہ سے ہر ایک کی نظروں میں حقیر ہو گئے، اور اگر بڑے خوش قسمت ہوئے تو ۲۰، ۲۵ روپے ماہوار پر پڑھانے کے نوکر

ہو گئے، ان صاحب کی حالت یہ ہوتی ہے کہ تمام عمر انہیں کتابوں کی لوٹ پھیر میں رہتے ہیں جنہیں پڑھ چکے تھے، انہیں یہ نصیب ہی نہیں ہوتا کہ علوم (دینیہ) کی وہ کتابیں دیکھیں جن سے ان کے علم میں ترقی ہو، جن کی وجہ سے وہ کسی علم دین کے ماہر کامل ہو سکیں، یا کوئی ایسا کام دین کا کام کر سکیں جس سے دین کی اشاعت اور دین کی حمایت ہو اور کوئی معتد بہ فائدہ دین کا ان سے ہو، لطف تو یہ ہے کہ فارغ التحصیل تو ہوئے اور وارث الانبیاء کہلانے کے مستحق ہو گئے، مگر بعض دینی علوم سے ان کے کان بھی آشنا نہ ہوئے، قرآن مجید جو ہمارا دین وایمان ہے اس کے علوم کی طرف توجہ ہی نہیں ہوئی، ہمارے ہادی رسول برحق علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ زبردست دائمی معجزہ دیا گیا جس کا جاننا اور مخالفین کے روبرو اس کے اعجاز کو ثابت کرنا انہیں کا فرض منصبی ہے، مگر یہ ہماری پیاری اور باعث افتخار جماعت اس سے غافل رہی، اور بھلا یہ تو مشکل فن ہے جس سے میں نے غفلت بیان کی، قرآن مجید سے بے توجہی کا تو یہ حال ہے کہ سیدھے سادھے مطالب ومعانی پر عبور نہیں ہوتا، قاضی مبارک اور صدرا کا ایک صفحہ بلکہ ایک سطر بلکہ ایک جملہ بھی بغیر استاد سے حل کیے چین نہیں آتا، اگر پڑھ چکے ہیں اور دوسرے شخص نے استاد سے پھر شروع کی، دوبارہ سہ بارہ سماعت کرنے کو موجود ہیں، مگر قرآن مجید کی معلومات ہمیشہ بالقوہ رہیں گے فعلیت میں کبھی نہ آئیں گے، ایک بار بھی اول سے آخر تک اس کے مطالب پر عبور نہیں ہوتا۔"

آگے دلسوزی کے ساتھ لکھتے ہیں:۔

"افسوس صد افسوس! کوئی گروہ طلبہ کا ایسا نہیں نکلتا ہے جو ملحدوں اور جدید فلسفیوں کے اعتراضات کو اسلام سے دفع کرے جس کا زہریلا اثر بسبب شیوع بے دینی وآزادی کے عالمگیر ہوتا جاتا ہے، اس کا مٹانا ہمارے علماء کا فرض ہے جس طرح ہو سکے، غرض کہ نہ تو حالت تحصیل میں انہوں نے کسی علم دین اور بالخصوص ان علوم مذکورہ میں مہارت دمشق پیدا کی، نہ اس کے بعد انہیں نوبت آئی، اب فرمائیے کہ دین کا کام کون کرے؟ زیادہ افسوس یہ ہے کہ زمانہ کے ضرورتوں سے ناواقف ہونے کی وجہ

سے نہ تو کسی دینی امر کا انتظام کر سکتے ہیں، نہ اس میں رائے دے سکتے ہیں (شاذ و نادر کا اعتبار نہیں) حالانکہ اس وقت ایسے گروہ کی زیادہ ضرورت ہے۔"

نزاع باہمی اور جماعتی عصبیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اب خیال کیجئے مقلدین غیر مقلدین میں کیسی کیسی شرمناک لڑائیاں ہوتی ہیں، ایک بھائی دوسرے بھائی کی جان کا، مال کا، آبرو کا کس طرح خواہاں ہوتا ہے۔ خلاف مذہب کے اجلاس میں مقدمات جاتے ہیں۔ ہمارے محترم علماء مجرموں کی طرح سامنے کھڑے ہوتے ہیں، صحیح بخاری، صحیح مسلم، اور دیگر کتب حدیث ان کے جوتوں کے پاس ان کے نیچے ڈھیر ہوتی ہیں، اور آمین و رفع یدین کی تحقیق جناب چوبے گھنشیام داس صاحب بہادر اور کرمول صاحب بہادر کے روبرو پیش ہوتی ہیں اور اس کو دین خیال کیا جاتا ہے۔ افسوس صد افسوس! ایسے فہم و خیال پر۔ ہمارے علماء کا اس طرح اجلاس میں کھڑا ہونا کیا شان علماء کے خلاف نہیں ہے؟ کیا ہمارے دین کی کتابوں اور ہمارے ہادی برحق کے اشاروں کا یوں بے حرمتی سے رکھا جانا دین کی ہتک نہیں ہے؟ مذہبی اختلافات کا جھگڑا مخالفین مذہب کے روبرو پیش کرنا سخت بے دینی نہیں ہے؟۔" (۱)

یہ تحریر مولانا کے خیالات و افکار کا ایک مرقع ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس نہج پر سوچتے تھے، اور جو کچھ سوچتے تھے اس کو کتنی سادگی سچائی اور دردمندی کے ساتھ پیش کر دیتے تھے۔ اس میں نہ کسی بات کو خوامخواہ فلسفہ بنانے کی کوشش ہے، اور نہ مبالغہ آرائی اور شاعری ہے، اور نہ لفظی صناعی اور عبارت آرائی، اس کا سارا حسن اس کی صداقت اور سادگی میں مضمر ہے، مولانا کی ساری تحریروں میں (خواہ وہ مکاتیب کی شکل میں ہوں یا رسائل و تصانیف کی) یہی رنگ نظر آتا ہے، اور "ہر چہ از دل خیز بر دل ریزد" کا منظر معلوم ہوتا ہے۔

ندوۃ العلماء کا پہلا عام اجلاس

۱۵/، ۱۶/، ۱۷/ شوال ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۲/۲۳/۲۴ اپریل ۱۸۹۴ء کو مدرسہ فیض عام کی

---

(۱) روئداد ندوۃ العلماء سال اول حصہ اول: (۱۲ تا ۱۶) باختصار۔

دستار بندی کے موقع پر کانپور میں ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس بہت شان وشوکت کے ساتھ ہوا، اور اس نے ملک کے طول وعرض میں زندگی کی ایک لہر دوڑا دی، یہ ایک نیا تجربہ تھا جس سے قوم آشنا ہو رہی تھی۔ اس جلسہ میں مختلف دینی جماعتوں اور مکاتب خیال کے نمائندے جس اتحاد اور جذبۂ اسلامی کے ساتھ جمع ہوئے اور باہم شیر وشکر ہو گئے، وہ بجائے خود ایک حیرت انگیز کارنامہ تھا۔

مصنف ''کمالات محمدیہ'' نے صحیح لکھا ہے کہ:۔

''علماء مقلدین وغیر مقلدین میں آپ نے (مولانا محمد علیؒ) عجب طور پر ملاپ کرادیا جو بجز کرامت کے اور کیا کہا جا سکتا ہے''۔(۱)

بڑے بڑے معمر لوگوں نے اس تعجب خیز نظارے کو دیکھ کر بیان کیا کہ: ''ایسا جلسہ جس میں اس قدر کثیر تعداد آدمی اس قرینہ اور سلیقہ کے ساتھ بیٹھے ہوں، اور اس قدر علماء کی پاک صورتیں جن کے منور چہروں سے تمام ہال روشن اور ایک جگہ رونق افروز ہونے سے اسلامی شوکت اور اسلامی دبدبہ ظاہر ہو، ہندوستان میں پہلی مثال ہے۔''(۲)

۲۲/اپریل کی صبح کو ۷/بجے جلسۂ دستار بندی شروع ہوا، اس جلسہ مین مولانا شاہ سلیمان پھلورویؒ (۳) نے ایسی مؤثر تقریر کی کہ سامعین پر وجد کی کیفیت طاری تھی۔ صدر جلسہ مولانا لطف اللہ صاحب نے ۱۴/فارغ التحصیل طلبہ کے سر پرستوں پر اپنے ہاتھ سے دستار باندھی جس پر " ادع الی سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة" بہت خوبصورت طریقہ پر لکھا ہوا تھا۔ شیخ احمد مکی نے عربی لہجہ میں سندھ پڑھ کر سنائی، اور اسی پر جلسۂ دستار بندی کا اختتام ہوا۔

---

(۱) کمالات محمدیہ: ۱۳۷ (۲ جلسۂ دستار بندی فیض عام کانپور: ص ۱۳

(۳) مولانا شاہ سلیمان پھلوارویؒ ایک سحر بیان مقرر اور متبحر عالم تھے۔ ابتدائی درسیات کی تکمیل مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ سے کی، اس کے بعد دہلی گئے اور مولانا نذیر حسین محدث سے علم حدیث کی تحصیل کی، اور مولانا احمد علی سہارنپوریؒ سے بھی سند حاصل کی۔ خوش بیانی میں کم لوگ ان کا مقابلہ کر سکتے تھے، جس وقت چاہتے مجمع کو ہنساتے اور جب چاہتے رلاتے۔ تقریر کے درمیان مثنوی کے اشعار اتنے درد وسوز اور مؤثر لہجہ میں پڑھتے کہ لوگوں کے دل بے قرار اور آنکھیں اشکبار ہو جاتیں۔ ندوہ کا تقریباً کوئی جلسہ ان کی تقریر سے خالی نہ جاتا۔

پہلی نشست

سہ پہر کو ساڑھے ۳/ بجے اس ہال میں ندوۃ العلماء کے اس تاریخی اجلاس کا آغاز ہوا جس کے لئے پورا ملک گوش برآواز تھا، مولانا شبلیؒ بھی اس جلسہ میں شریک تھے، اور نہ صرف شریک تھے بلکہ پوری دلچسپی کے ساتھ کارروائی میں حصہ لے رہے تھے، ان ہی کی تحریک اور مولانا محمد حسین الہٰ آبادی کی تائید سے مولانا لطف اللہ صاحب اجلاس کے صدر قرار پائے۔ یہ جلسہ جس شان سے ہوا اور اس میں جس اتحاد و یگانگت کا منظر دیکھنے میں آیا وہ اپنی نظیر آپ تھا۔ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی جو شریک جلسہ تھے۔ اس قابل دید منظر کا ذکر یوں کرتے ہیں:۔

> ''شوال ۱۳۱۱ھ میں پہلا اجلاس ہوا۔ یہ اجلاس اپنی شان و اجتماع میں خود بے نظیر تھا۔ ایک شان یہ تھی کہ ہر فرقہ کے صنادید شریک جلسہ تھے۔ علماء حنفی کے علاوہ اہل حدیث میں سے مولوی ابراہیم آروی، مولوی محمد حسین بٹالوی، شیعہ مجتہدین میں مولوی غلام الحسنین کنتوری شریک جلسہ تھے۔'' (۱)

اس کے بعد مولانا محمد حسین الہٰ آبادی (۲) نے ندوۃ العلماء کے مقاصد اور موجودہ طریقۂ تعلیم کی خرابیوں، نیز انگریزی تعلیم کے نقصانات اور اس کے سد باب کے موضوع پر ایک پرزور تقریر کی۔ دستور العمل پیش کرنے کا کام مولانا محمد علیؒ نے مولانا عبدالحق حقانی

---

(۱) استاذ العلماء: ۴۴ (۲) مولانا محمد حسین الہٰ آبادی اپنے زمانہ کے نامور علماء میں ہیں۔ مولانا سید عبدالحیؒ کے الفاظ میں:۔ ''ذہانت اور جودت طبع اور حسن تحریر و لذت تقریر میں نادرۂ روزگار تھے''۔ تکمیل درسیات کے بعد حج کے لئے تشریف لے گئے اور شیخ احمد بن زین دحلان الشافعی المالکی سے سند حدیث حاصل کی، اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے استفادہ کیا۔ چار مرتبہ حج کے لئے گئے، اور ہر مرتبہ حالت و کیفیت میں اضافہ ہی معلوم ہوتا تھا، یہاں تک کہ مغلوب الحال سے ہو گئے۔ آخر عمر میں سماع وغیرہ کی طرف بہت زیادہ توجہ ہو گئی تھی، اور خوش آوازی سے وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی، وفات بھی اسی حال میں ہوئی، ایک محفل سماع میں مغنی سے فرمائش کی کہ یہ شعر پڑھو

خشک تار و خشک چنگ و خشک پوست   از کجامی آید ایں آواز دوست

شعر سن کر بے خود ہو گئے، اور تھوڑی دیر کے بعد فرمائش کی کہ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کا یہ شعر پڑھو

گفت قدوسی فقیرے در فنا و در بقا   خود بخود آزاد بودی خود گرفتار آمدی

شعر سننا تھا کہ کیفیت بہت بڑھ گئی، اسی حالت میں سربسجود ہوئے، اور تھوڑی دیر بعد روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ (نزہۃ الخواطر، جلد ۸)

کے سپرد کیا تھا۔ لیکن وہ وقت مقررہ پر تشریف نہ لاسکے۔ چنانچہ مولانا شبلیؒ نے صدر جلسہ کی اجازت سے دستور العمل پیش کیا اور یہ طے پایا کہ پہلے ایک مخصوص جلسہ کیا جائے جس میں اس کی ایک ایک دفعہ کو غور وفکر کے بعد منظور کیا جائے، اس کے بعد جلسۂ عام کی منظوری کے لئے پیش کیا جائے۔

دوسری نشست

دوسری نشست ۱۶ر شوال ۶ ربجے صبح کو ہوئی، ہال وقت سے بہت پہلے ہی بھر گیا تھا، سید محمد شاہ محدث رامپوریؒ نے جلسہ کی صدارت کی۔ سب سے پہلے مولانا عبد الحق حقانی (۱) نے ندوۃ العلماء کے فوائد اور مقاصد پر بڑی گرمجوشی کے ساتھ تقریر کی، اس کے بعد مولانا محمد ابراہیم آروی (مہتمم مدرسۂ احمدیہ آرہ) نے تقریر کی۔ مولوی غلام حسنین نے بھی تقریر کی، لیکن ان کی تقریر کچھ زیادہ پسند نہیں کی گئی۔ بعض اشخاص نے درمیان میں کچھ بولنا بھی چاہا لیکن یہ بات قرار پا چکی تھی کہ مجلس میں کسی قسم کی رد وقدح نہ ہو اس لئے خاموشی اختیار کی گئی۔

اس جلسہ میں دستور العمل (۲) بھی منظور ہوا، اور چار تجویزیں پاس ہوئیں:۔

(۱) پہلی تجویز یہ تھی کہ موجودہ طریقۂ تعلیم قابل اصلاح ہے۔

(۲) دوسری یہ کہ مدارس عربیہ کے مہتمم ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسوں میں شریک ہوا کریں۔

(۳) تیسری یہ کہ مدارس اسلامیہ ایک کڑی میں مربوط کر دیئے جائیں۔

(۴) چوتھی تجویز مدرسۂ فیض عام سے متعلق تھی۔

---

(۱) مولانا عبد الحق حقانی انبالہ (پنجاب) کے رہنے والے تھے، لیکن زیادہ تر تعلیم کانپور میں مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھیؒ سے حاصل کی۔ دہلی جاکر مولانا نذیر حسین محدثؒ سے استفادہ کیا اور وہیں اقامت اختیار کی۔ عرصہ تک مدرسۂ فتحپوری میں درس بھی دیا۔ تعلیم سلوک حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ سے حاصل کی۔ قیام ندوہ کے بعد اس میں دلچسپی لینا شروع کی اور اس کے ساتھ کسی قسم کے تعاون میں دریغ نہیں کیا۔ اردو میں ان کی تفسیر "تفسیر حقانی" کے نام سے بہت مشہور ہے۔

(۲) دستور العمل کے لئے دیکھئے روئداد سال اول: ص ۷۰ و ۷۳

اصلاح نصاب کی تجویز سوائے ایک اختلاف کے کثرت رائے سے منظور ہوئی، اور تمام علماء نے اس بات کو تسلیم کیا کہ موجودہ طرز تعلیم قابل اصلاح ہے۔

اسی وقت بارہ اشخاص پر مشتمل ایک کمیٹی کی تشکیل کردی گئی جس کا کام نصاب تعلیم پر غور کر کے جلد از جلد اپنی سفارشات پیش کرنا تھا۔ اس کمیٹی میں مولاناؒ کے علاوہ مولانا لطف اللہ علی گڑھیؒ، مولانا عبدالحق حقانیؒ، مولانا محمد حسین الٰہ آبادیؒ، مولانا شاہ سلیمان پھلوارویؒ، مولانا شبلی نعمانیؒ، مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ، مولانا محمد حسین بٹالویؒ اور مولانا ظہورالاسلام فتحپوری (۱) شامل تھے۔ ان حضرات سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ دوسرے علماء خصوصاً مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے اس مسئلہ میں رابطہ قائم کریں اور مشورہ کر کے نیا نصاب تعلیم تجویز کریں، دوسری تجاویز بھی کثرت آراء سے منظور ہو گئیں۔

اس جلسہ میں تمام علماء کے اتفاق رائے سے مولانا سید محمد علیؒ کو باضابطہ طور پر ندوۃ العلماء کا ناظم منتخب کیا گیا۔ اور گویا اس فیصلہ کی توثیق کی گئی جو بنیادی جلسہ میں کیا گیا تھی۔ پہلی تجویز کی منظوری کے بعد مولانا شروانی نے جن کا اس وقت عنفوان شباب تھا، نصاب تعلیم کے متعلق ایک بہت اچھا مقالہ پڑھ کر سنایا۔

---

(۱) مولانا ظہورالاسلام فتحپوری ایک فرشتہ خصلت اور صاحب کمال بزرگ تھے، دلمو (رائے بریلی) میں پیدا ہوئے، لیکن تلاش علم نے علی گڑھ تک رسائی کی، جہاں اس وقت مولانا لطف اللہ صاحبؒ کی مسند درس آراستہ تھی، درسیات کی تکمیل کے بعد لکھنؤ تشریف لائے اور علم حدیث مولانا عبدالحی لکھنویؒ سے حاصل کیا، مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ سے بیعت تھے، اور ان سے غیر معمولی تعلق تھا، راہ سلوک ان ہی کی تربیت ورہنمائی میں طے کی۔ مدرسہ اسلامیہ (فتحپور) ان کی زندہ یادگار ہے۔ مولانا کا سب سے بڑا وصف "خدمت خلق وایثار" تھا۔ اس میں ان کے ہاں مسلم وغیر مسلم کی کوئی تفریق نہ تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ مولانا سے کسی نے کچھ سوال کیا اور سخت سردی اور احتیاج کے باوجود مولانا نے اپنی صدری یا اس طرح کی کوئی اور چیز اس کو دے دی۔ فتحپور کے ہندوؤں کا ایک بڑا خاندان آج بھی ان کا معتقد ہے، ان میں سے بعض افراد کو مولانا حد درجہ عقیدت اور محبت تھی۔ ۱۳۴۹ھ میں فتحپور ہی میں انتقال ہوا، جنازہ میں زبردست ہجوم تھا، اور بکثرت ہندو جنازہ کے ساتھ زاروقطار رو رہے تھے۔ مولانا کے ایک غیر مسلم معتقد نے جو جنازہ میں شریک تھے مجھے اس کی حیرت انگیز تفصیلات اپنی ڈائری سے پڑھ کر سنائیں، جن سے ان کی مقبولیت اور ہردلعزیز اور لوگوں کے تعلق و شیفتگی کا اندازہ ہوا۔

اس جلسہ میں ۶۰، ۷۰ ممتاز علماء شریک تھے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ مدرسہ کی مصروفیات کے پیش نظر جلسہ میں شریک نہ ہو سکے۔ اور معذرت کا خط لکھا۔

مولانا حالی کی مرسلہ تقریر

مولانا حالؔی اس جلسہ میں شریک نہ ہو سکے لیکن انہوں نے اپنی تقریر لکھ کر بھیج دی جو دوسرے وقت ارکان کے سامنے پڑھی گئی، اس میں انہوں نے تاریخ وجغرافیہ اور تبدیلی نصاب کی اہمیت وضرورت کے ساتھ عربی ادب کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی، اس جلسہ میں مولانا احمد رضا خاں (جو بعد میں ندوہ کے شدید مخالف ہو گئے) کا مقالہ بھی تھا، لیکن وہ وقت کی تنگی کے باعث پڑھا نہ جا سکا، اور فیض عام کی روئداد میں شائع ہوا۔

شکریہ کی رسمی کارروائی پر ندوۃ العلماء کا یہ تاریخی اجلاس ختم ہوا، لیکن اس کے ساتھ اس تحریک کا آغاز ہوا جس نے پورے ملک کی نگاہیں اس انجمن پر مرکوز کر دیں، اور جس نے مسلمانوں کو تعلیمی، اجتماعی اور فکری میدان میں ایک نیا تحفہ عطا کیا، اور اس کو ماحول کی اس کہر آلود رات میں امید کی ایک نئی کرن نظر آئی۔

مولانا محمد علیؒ کی فکری وعملی رہنمائی

اس جلسہ کے بعد مولاناؒ نے ایک نقشۂ مضامین تیار کیا، اس کا مقصد یہ تھا کہ آئندہ جلسوں کے لئے لوگ ان عنوانات پر مقالات تیار کریں، ندوۃ العلماء نے جو تخیل پیش کیا تھا اور جن بنیادوں پر ذہن وفکر کی تعمیر اس کے پیش نظر تھی اس لحاظ سے اس بات کی بڑی ضرورت تھی کہ لوگ اس نہج پر سوچیں، اور ان موضوعات پر غور کریں جن سے ان کے اندر صحیح شعور واحساس بیدار ہو، اور عالی دماغی اور بلند نظری کے اوصاف پیدا ہوں۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانیؒ کی مشہور کتاب ''علماء سلف'' اس رہنمائی کا نتیجہ ہے، یہ کتاب ندوہ کے اجلاس ہی کے لئے لکھی گئی، مولانا اس تاریخ کا ذکر اور کتاب کی وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''۱۳۱۱ھ کا ذکر ہے کہ ندوۃ العلماء کا اول اجلاس شہر کانپور میں ہوا تھا جس میں دیار ہند کے اکثر مشاہیر علماء رونق افروز تھے، بزم ان کے جمال کمال سے روشن تھی اور نگاہ ان کے کمال جمال سے منور، اور ایک ایسا پاکیزہ منظر پیش نظر تھا جو تاریخ ہندوستان میں اپنی آپ ہی نظیر تھا۔ میری آنکھیں جب ان نورانی شکلوں کے دیدار سے فیضیاب ہوئیں تو چشم بصیرت میں ایک نور پیدا ہوا جس کی روشنی میں وہ زمانہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا جو فضائے عالم میں صدہا برس کی راہ طے کر چکا ہے، یعنی متاخرین کا مجمع دیکھ کر متقدمین کا تصور بندھا اور ان کے حالات کے مطالعہ کا شوق دل میں پیدا ہوا، یہ شوق ہنوز دل میں قائم تھا کہ جناب مولانا سید محمد علیؒ صاحب ناظم ندوہ نے ایک نقشۂ مضامین شائع فرمایا جس میں چند عنوان اس غرض سے درج تھے کہ آئندہ جلسۂ ندوہ کے لئے ان پر مضامین لکھے جائیں، اتفاقاً ان میں ایک عنوان ''علماء سلف'' بھی تھا''۔(۱)

ندوہ کے تعارف کے لئے جدوجہد

اس اجلاس کے بعد ندوہ کے خاص ارکان اور دوسرے حضرات نے پوری توجہ کے ساتھ ندوہ کے تعارف جدوجہد کا آغاز کیا، اور اس میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، بالخصوص مولانا عبدالحق حقانیؒ نے بڑی دلسوزی اور ولولہ کے ساتھ یہ فریضہ انجام دیا۔ دہلی، بمبئی اور حیدرآباد میں انہوں نے ندوہ کی حمایت میں پرزور تقریریں کیں، اور لوگوں کو اس کی تائید پر آمادہ کیا۔ ان کی وجہ سے ندوہ کو مالی فوائد بھی حاصل ہوئے۔ ان کے علاوہ مولانا شاہ سلیمان پھلورویؒ، مولانا حکیم ظہور الاسلام فتحپوریؒ، اور مولانا فتح محمد تائب

(۱) علماء سلف: ص ۲ (۲) مولانا فتح محمد تائب لکھنوی ایک جید عالم تھے، مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ سے درسیات کی تکمیل کی، اور لکھنؤ میں ''رفاہ المسلمین'' کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا اور عرصہ تک تدریسی خدمت انجام دی، اور چار جلدوں میں ''خلاصۃ التفاسیر'' کے نام سے اردو میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی، اس کے علاوہ متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ ۱۳۲۷ھ میں انتقال ہوا۔ (نزہۃ الخواطر، جلد ۸)

لکھنویؒ (۲)، اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانیؒ بھی اس مہم میں پیش پیش رہے۔

اس تحریک نے مختصر سے عرصہ میں ڈھاکہ سے پشاور اور حیدرآباد تک نہ جانے کتنے سرد دلوں کو گرما دیا اور کتنے سینوں میں امید و یقین کی شمع روشن کر دی۔

مولانا محمد علیؒ ندوۃ العلماء کی اس مقبولیت اور ہردلعزیزی کا مسرت کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اس مبارک انجمن کی عمر ایک سال کی ہوئی اور اس ایک سالہ عمر میں اس نونہال نے کس قدر عالمگیر شہرت اور قابل قدر وقعت حاصل کی جس کو فضل ربانی اور تائید ایزدی کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے (۱)، غالباً ہندوستان کا کوئی شہر، کوئی قصبہ، کوئی قریہ ایسا نہیں جہاں اس کا ذکر خیر نہ پہونچا ہو۔ کوئی دانشمند ایسا نہ ہوگا جو امید کی نظروں سے اسے نہ دیکھتا ہو، کوئی مصلح اور بہی خواہ اسلام ایسا نہ ہوگا جو اس کی رفتار و گفتار پر ہمہ تن گوش نہ ہو، .... وہ علماء اور مشائخ اس جلسہ میں منزلیں طے کر کے آئے جو اپنے شہر میں بھی عام جلسوں میں شریک نہ ہوتے تھے۔ بعض علماء کی زبان سے یہ بھی سنا گیا کہا الٰہی! یہ کیسی مقناطیسی کشش ہے کہ بے اختیار اس قدر دور دراز سے لوگ چلے آتے ہیں، اگر کوئی بادشاہ بھی بلاتا تو اس مسرت کے ساتھ اپنا روپیہ صرف کر کے نہ آتے۔ الغرض یہ شہرت، یہ دلفریبی، اور یہ جذبہ مقناطیسی ضرور تائید غیبی کی خبر دیتی ہے۔" (۲)

درحقیقت یہ مولاناؒ کے اخلاص و روحانیت، اور ان کے رفقاء کے حسن نیت کا ثمرہ تھا کہ ایک ایسی تحریک جو ایک انقلابی تخیل لے کر اٹھی اور جس کا مخصوص تعلیمی طرز فکر علماء کے ایک بڑے طبقہ کے لئے بالکل نامانوس اور اجنبی تھا، اتنے مختصر عرصہ میں کامیابی سے

---

(۱) مولانا کے اس احساس اور تاثر کی تصدیق مولانا حاجی امداد اللہ کے ان بلند کلمات سے بھی ہوئی جو انہوں نے ندوۃ العلماء کے متعلق ارشاد فرمائے، اور ندوۃ العلماء کو تائید غیبی اور امداد غیبی بتایا۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ (۲) رپورٹ سال دوم۔

ہمکنار ہوئی اور ہر طبقہ اور گروہ اس سے دلچسپی لینے اور اس پر غور کرنے پر مجبور ہوا۔

ندوہ کا اجلاس لکھنؤ

ندوہ کا دوسرا سالانہ اجلاس خان بہادر منشی اطہر علی صاحب رئیس کاکوروی (۱) کی خواہش پر لکھنؤ میں ہوا، منشی اطہر علی صاحب کو اس وقت تک ندوۃ العلماء سے کچھ زیادہ واقفیت اور دلچسپی نہ تھی، ذمہ داران ندوہ سے دو ایک بار گفتگو بھی ہوئی لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا، مگر منشی اطہر علی صاحب کا بیان ہے کہ "یکبارگی منجانب اللہ اس جلسہ کی عظمت اور عمدگی میرے قلب میں آئی اور یہ خیال ہوا کہ یہ کشش معمولی نہیں ہے، اور اس خیال میں ایسا خوش ہوا کہ اسی وقت میں نے اس کی ذمہ داری کا خط لکھا"۔ (۲)

بہرحال ناظم ندوۃ العلماء نے ممبران ندوۃ العلماء، مخصوص علماء، روساء، مدارس کے منتظمین اور اسلامی انجمنوں کے رہنماؤں کو اطلاع روانہ کی، اور انتظامات شروع کر دیئے۔ اس مرتبہ بھی علماء نے بہت پر جوش طریقے پر اس صدا پر لبیک کہی، جو علماء کسی وجہ سے شرکت نہ کر سکے انہوں نے معذرت کے خطوط لکھے اور ندوۃ العلماء کی اہمیت اور ضرورت کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔

مولانا شاہ امانت اللہ فصیحی غازیپوری (جو ایک ممتاز عالم اور شیخ تھے، اور مولانا

---

(۱) خان بہادر منشی اطہر علی صاحب کاکوروی ایک بڑے تعلقہ دار، ایک ممتاز وکیل اور انجمن تعلقہ داران اودھ کے قانونی مشیر تھے، شاہ تقی علی قلندر کاکوروی سے بیعت تھے، اور مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی صاحبؒ سے بھی عقیدت و ارادت کا تعلق تھا۔ ندوہ کے اجلاس لکھنؤ کے سارے مصارف انہوں نے برداشت کئے۔ اور شرکاء جلسہ اور مدعوئین ان ہی کے مہمان رہے۔ گولہ گنج میں جب دارالعلوم قائم ہوا تو سب سے پہلے انہوں نے اپنے صاحبزادہ حاجی انور علی صاحب کو داخل کیا، یہ پہلے شخص ہیں جن کا نام ندوہ کے رجسٹر میں سب سے پہلے لکھا گیا۔ بہت باخدا اور وضعدار شخص تھے، عشق رسول ﷺ کی دولت جاوید حاصل تھی۔ جب سر انٹونی کڈانل کو ان سے کد اور بدگمانی پیدا ہوئی، تو انہوں نے اسی دامن عاطفت میں پناہ لی، اور مدینہ طیبہ پہونچ کر رخت سفر کھول ڈالا، تمام رفقاء اور خادم کو رخصت کیا، اور متوکلانہ پڑ گئے، اور وہیں ۱۹۰۷ء میں جنت البقیع میں حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پائیں مدفون ہو کر حیات جاودانی حاصل کی، ندوۃ العلماء کے نہایت مخلص و پرجوش معاون تھے۔ انہیں کی تحریک اور کشش سے دارالعلوم لکھنؤ میں قائم ہوا۔

(۲) روئداد سال دوم: ۱۸

ابراہیم آروی سے ان کا ایک قدیمی اور آبائی نزاع بھی چل رہا تھا) مولانا محمد علیؒ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"آپ نے از سرِ نو باغ اسلام کی جو عرصہ سے خشک ہو رہا تھا اور بے سر کی فوج مسلمان ہو رہے تھے، محض بتائید ربانی آبیاری فرمائی، اور خداوند حقیقی پر بھروسہ کر کے ندوۃ العلماء قائم کیا، اور جس قدر فکر و تدبیر مدبرانہ چاہئے فرمائی۔ ایک سال کے اندر کی سعی مشکور ہوئی اور فوائد اس کے ہر خاص و عام پر روز بروز ظاہر ہونے لگے، جس سے پوری امید کی جاتی ہے کہ آئندہ چل کر ندوہ کیا کیا کارنمایاں ترقی اسلام میں کرے گا، اور بہبودیٔ اسلام میں کیسے کیسے رنگ دکھائے گا، فقیر کو مذاق روحانی سے یہ جلسہ من اللہ تعالیٰ معلوم ہوتا ہے، إذا اراد اللّٰه شيئا هيأ اسبابه"۔(۱)

جلسہ گاہ میں جو قیصر باغ کی مشہور بارہ دری میں ہو رہا تھا، دوسری ضروری انتظامات کے علاوہ ایک دار المطالعہ بھی قائم کیا گیا، حکیموں، ڈاکٹروں پر مشتمل ایک جماعت کی تشکیل بھی کی گئی جو ضرورت کے وقت مہمانوں کو علاج و معالجہ کی فوری سہولتیں بہم پہونچا سکے۔ قیصر باغ کی بارہ دری جو کسی زمانہ میں عیش و عشرت کا گہوارہ رہی ہوگی، آج علماء اسلام کے روح پرور اجتماع کی وجہ سے اپنی قسمت پر نازاں تھی، حسن صورت سے حسن معنی کی آمیزش نے منظر کی دلفریبی اور لطافت کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا تھا۔

۱۶ر شوال ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۲ر اپریل ۱۸۹۵ء کو ۶ بجے صبح پہلا اجلاس ہوا، مولانا کی تحریک سے مولانا سید محمد شاہ محدث رامپوریؒ صدر جلسہ منتخب ہوئے، اور مولانا عبد المجید فرنگی محلیؒ نے تلاوت سے جلسہ کا آغاز کیا۔

مولانا محمد علیؒ اپنے ضعف و علالت (۲) کی وجہ سے سال گزشتہ کی طرح اس سال بھی رپورٹ نہ پیش کر سکے۔ اور قرعۂ فال مولانا شبلیؒ کے نام پڑا جنھوں نے یہ رپورٹ صدر کی اجازت سے پڑھ کر سنائی، اس روداد میں مولانا محمد علیؒ نے اس بات کا اظہار کیا کہ "اصلاح

(۱) روئداد سال اول: ۲۱ (۲) مولانا محمد علیؒ کو درد گردہ کی شکایت ہو جایا کرتی تھی، لیکن اس کے باوجود پوری تندہی و انہماک سے اپنے کاموں میں مشغول رہتے تھے۔

نصاب'' کے متعلق جو تجویز گزشتہ جلسہ میں منظور ہوئی تھی اس کے متعلق رائیں ابھی نہیں آسکی ہیں، ہاں ہمارے دوست مولانا محمد حسین الہ آبادی (۱) اور مولوی عبدالعلی مدراسی نے بہت تفصیل کے ساتھ اس میں رائے دی ہے، حقیقت یہ ہے کہ جو نصاب دوسو برس سے معمول بہ ہو اس کی ترمیم واصلاح ایک برس کا کام نہیں، تاہم اس امر کے بیان کرنے میں مجھ کو نہایت خوشی ہے کہ اس تحریک سے اکثر علماء ہندوستان کا خیال اصلاح نصاب کی طرف مائل ہو گیا ہے، اور اس امر کو کہ نصاب موجودہ میں فن ادب اور تفسیر کے متعلق نہایت کمی ہے، اور جدید علم کلام کی نہایت ضرورت ہے، اکثر تسلیم کرتے جاتے ہیں۔ (۲)

مولاناؒ کی رپورٹ کے بعد فرنگی محل کے مولانا افہام اللہ صاحبؒ (جو لکھنؤ کے ایک متبحر اور صاحب تصانیف عالم مولانا ولی اللہ لکھنویؒ کے پوتے ہیں) نے اپنا مقالہ پیش کیا۔

دوسری نشست میں مولانا شاہ سلیمان پھلوارویؒ نے ایسی پراثر تقریر کی کہ لوگوں کے دل گرم اور آنکھیں نم ہو گئیں، مجمع کے غیر معمولی تاثر کو دیکھ کر مولانا نے کہا کہ ندوہ نے جس عظیم الشان کام کی بنیاد ڈالی ہے اس کی کامیابی کچھ ہنسی کھیل نہیں، دو چار روز کا کام نہیں، کوئی بڑا کام خیال کرنے کے ساتھ ہی نہیں ہو جاتا بلکہ ہم کو ہمت بلند اور استقلال دیرپا کے ساتھ نہایت کوشش اور سعی بلیغ کرنا چاہئے، ان شاء اللہ ایک روز ندوہ کو کامیاب دیکھیں گے۔

دارالافتاء کے قیام پر مولانا کی تجویز

تیسری نشست میں مولانا محمد علیؒ نے تجویز پیش کی کہ ندوۃ العلماء کی طرف سے ایک محکمۂ افتاء قائم کیا جائے، مولانا کو اس مسئلہ سے بہت دلچسپی تھی اور وہ اس کو بہت ضروری اور اہم خیال کرتے تھے، اس لئے انہوں نے پوری قوت کے ساتھ یہ تجویز پیش کی۔ مولانا عبدالحق حقانیؒ اور مولانا شاہ سلیمان پھلوارویؒ نے اس کی تائید میں مختصر تقریریں کیں، لیکن

---

(۱) مولانا نے ''التنظیم لنظام التعلیم و التعلم'' کے نام سے ۷۵ اصفحے کا ایک مستقل رسالہ اصلاح نصاب پر لکھا ہے جس میں انہوں نے بہت سی مفید تجاویز پیش کی ہیں، اور کئی اہم امور پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

(۲) روئداد سال اول: ۳۷

دوسرے اصحاب نے فوری طور پر اس کی منظوری سے اتفاق نہیں کیا، اور یہ تجویز بالآخر ایک خصوصی جلسہ کے لئے ملتوی ہوگئی۔(۱)

اس کے بعد مولانا عبدالحق حقانیؒ نے تقریر کی، اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانیؒ نے اپنا مضمون پڑھا۔ اس جلسہ کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں ایک عربی قصیدہ پڑھا گیا اور ایک فارسی مثنوی سنائی گئی، ابوالقاسم صاحب عرشی (جو نظام حیدرآباد کے شاعر خاص تھے) نے ایرانی لب ولہجہ میں اپنی فارسی مثنوی پیش کی، اور سامعین کو محظوظ کیا۔ اس مثنوی میں بڑی روانی ہے، اور شاعر کی قادرالکلامی کی شان نظر آتی ہے۔ بعثت کے متعلق حسب ذیل بند پڑھے:۔

احمد مرسل کہ فلک بخت اوست　　تیغ و قلم کو کبۂ ورخت اوست
بادۂ توحید بساغر گرفت　　خامۂ وشمشیر بکف درگرفت
قطرہ ازاں بادہ چوایثار کرد　　ابر بدشت وگلزار کرد
گلشن اسلام ببہار آمدہ　　برچمن خشک بہار آمدہ

ندوۃ العلماء کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

انجمن ندوہ کہ نامش شدہ　　رحمت حق حامی کامش شدہ
رومی وبومی ہمہ گشتند جمع　　صورت پروانہ حوالی شمع
کارمریضاں بہ مسیحا رسید　　سلسلۂ قطرہ بدریا رسید

اور اس شعر پر مثنوی ختم کی:۔

کف بدہاں، مست شتابی ہنوز
قافلہا رفت وبخوابی ہنوز(۲)

۷ار شوال کو چوتھی نشست میں یہ بات طے ہوئی کہ نصاب تعلیم کے لئے ایک مخصوص کمیٹی کی تشکیل کردی جائے۔ نماز مغرب کے بعد ایک خصوصی جلسہ ہوا، اور اس میں یہ بات طے ہوگئی کہ موجودہ نصاب تعلیم میں مزید علوم کا اضافہ ضروری ہے۔ رجال واصول، تفسیر اور تاریخ وجغرافیہ کو متعین بھی کردیا گیا ہے۔ یہ بھی طے ہوا کہ یہ سب علوم

---

(۱) یہ تجویز ان ایام میں پیش نہ ہوسکی۔ محرم ۱۳۱۲ھ میں ایک خصوصی جلسہ میں مولانا محمد علیؒ نے بہت تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ پر روشنی ڈالی، اور خاصے مباحثہ کے بعد یہ تجویز منظور ہوئی۔(۲) روئداد سال دوم: ۸۰

عربی میں پڑھائے جائیں، مدت تحصیل دس برس قرار دی گئی۔

ندوۃ العلماء کا پہلا ثمرہ

پانچویں نشست کی سب سے خاص بات یہ تھی کہ مولانا شاہ امانت اللہ فصیحی غازیپوریؒ اور مولانا ابراہیم آرویؒ نے مل کر اعلان کیا کہ:۔ آج ہم دونوں فریقوں میں اتحاد ہوگیا، اب دو فریق کتنا بھی ٹھیک نہیں کہ اب تو ایک ہی ہو گئے، ہم دونوں مل کر قوم کی حالت پر آج بہت روئے اور یہ قرار پایا کہ ہم اپنے معاملات کو ندوہ کے سپرد کردیں۔(۱)

ان دونوں میں طویل عرصہ سے ایک نزاع چلا آرہا تھا (۲) اور کوئی کوشش کارگر نہ ہوتی تھی، ندوۃ العلماء کی یہ پہلی کامیابی اور پہلا ثمرہ تھا جو نمایاں صورت میں ظاہر ہوا، اس نزاع کو جو اہمیت حاصل تھی اس کی وجہ سے اس بات کا عام مسلمانوں پر بہت خوشگوار اثر پڑا اور لوگوں نے یہ بات محسوس کی کہ موجودہ اختلافات کو ختم کرنے اور علماء میں صحیح شعور پیدا کرنے کے لئے ندوۃ العلماء مؤثر ترین ذریعہ بن سکتا ہے۔

اس اجلاس کا اختتام عزیز لکھنوی کے فارسی قصیدہ پر ہوا جو مولانا شاہ سلیمان صاحبؒ نے پڑھ کر سنایا، قصیدہ کے آخر میں ندوہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

آب ازیں چشمۂ جاری برود تا پنجاب　　　فیض ایں ابر بہاری برسد تا بہ بہار
لکھنؤ یافتہ خوش برگ ونوائی از تو　　　مژدہ اے لکھنویاں مژدہ بہاراست بہار

مولانا محمد علیؒ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

داعی ندوہ بود قدوہ ارباب ہمم
زبدۂ اہل کرم، عمدۂ جمع احرار

ندوۃ العلماء کو دعا دیتے ہوئے قصیدہ ختم کیا:۔

یارب ایں ندوہ وایں نادی وایں بادی باد
شاد تا یوم تناد ایمن ازارباب عناد

اس اجلاس میں ۳۴ر افراد پر مشتمل ایک نئی مجلس انتظامی کی تشکیل بھی کی گئی، اور ترمیم

---

(۱) روئداد سال دوم: ۹۰　(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے "رفع نزاع باہمی"۔

شدہ دستور العمل منظور ہوا۔

فرنگی محل کے مولانا شاہ محمد عبدالوہابؒ خلف الرشید مولانا شاہ عبدالرزاقؒ نے ان تمام علماء کی دعوت کی جو جلسہ میں شرکت کے لئے آئے اور اس جگہ کھانا کھلایا جہاں استاذ الاساتذہ ملا نظام الدینؒ نشست کیا کرتے تھے۔ دوسرے وقت مولانا شاہ محمد نعیم صاحبؒ کی طرف سے دعوت تھی، اور عام اعلان تھا کہ علماء کے ساتھ اور جتنے حضرات بھی ہوں وہ دعوت میں شریک ہیں۔

جدید طبقہ کی طرف سے ندوہ کی پہلی حمایت

۱۸۹۴ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے ندوہ کی حمایت میں ایک ریزولیوشن منظور کیا، جسے نواب محسن الملک بہادر نے پیش کیا تھا اور آنریبل سید محمود نے اس کی تائید کی تھی۔ سرسید احمد خاں نے اس ریزولیوشن کی صدہا کاپیاں روئداد کانفرنس سے علیحدہ چھپوا کر مسلمانوں میں تقسیم کیں، جدید طبقہ کی طرف سے یہ ندوہ کی سب سے پہلی منظم اور مؤثر حمایت تھی۔

انجمن حمایت اسلام لاہور میں ندوہ کی تائید

اسی طرح انجمن حمایت اسلام لاہور نے بھی ندوہ کی تائید میں ریزولیوشن منظور کیا۔

مصروشام میں تحریک ندوۃ العلماء کا تعارف

ندوۃ العلماء کی روئدادوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دو سال کے اندر اندر صرف ہندوستان بلکہ مصروشام میں بھی ندوہ کا خاصا تعارف ہوگیا تھا۔ عرب علماء بلا تامل اس کے اغراض ومقاصد سے اتفاق کا اظہار کر رہے تھے۔ مصری اخبارات میں بھی اس کی تائید میں متعدد مضامین شائع ہوئے، خاص طور پر ''المؤید'' اور ''الرفیق'' نے اس کی پرزور حمایت کی، اصلاح نصاب اور اس میں علوم جدیدہ کا اضافہ یہ دو ایسی چیزیں تھیں جن کی وجہ سے عالم عرب کے علماء کو ندوہ سے غیر معمولی دلچسپی ہوگئی تھی، مغربی تہذیب کے اثر ونفوذ کی وجہ سے ان کے ہاں بھی اس قسم کے مسائل درپیش تھے جن سے ہندوستانی

مسلمانوں کو واسطہ تھا۔ مخلص اور روشن ضمیر علماء اس صورت حال کو دیکھ کر فکر مند تھے اور ان کو کوئی سبیل نظر نہ آ رہی تھی، نہ ان علوم اور ان کے پس منظر، اور ان کے محرکات و دواعی سے انکار تھا اور نہ وہ اس کو بجنسہٖ قبول کر سکتے تھے۔ ندوۃ العلماء کے قیام سے ان کو اپنی یہ مشکل آسان ہوتی نظر آئی، لیکن اسی زمانہ میں جب کہ اس تحریک کی پہلی کرن عالم عربی کے افق پر نظر آ رہی تھی خود اہل ہند نے اس کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا اس کی تفصیلات آپ کو آگے چل کر معلوم ہوں گی۔ ان معترضین اور نکتہ چینوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ دو سال ہو رہے ہیں ندوہ نے اب تک کیا کر کے دکھایا۔

ناقدین ندوہ کو مولاناؒ کا جواب

ان ناقدین کے جواب میں مولاناؒ نے خون جگر سے حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں، یہ الفاظ روئداد سال سوم کی تمہید میں موجود ہیں۔

''ابھی سے ہمارے بعض سادہ مزاج بھائیوں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ دو برس گزر جانے پر بھی ندوہ نے اب تک کیا کیا؟ لیکن افسوس ہے کہ ایسا کہنے والوں نے خود کبھی کوئی کام نہیں کیا، اس کی قدر وہی جانتے ہیں جنہوں نے دنیا میں رہ کر کبھی کوئی کام کیا ہے۔ کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام ایسا لیجیئے جس کی طرف سے عموماً لوگوں کو کم توجہی ہوگئی ہے، اس کے از سر نو جاری کرنے کے وقت آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ کیا کچھ دقتیں اور موانع پیش آتے ہیں۔ افسوس! انقلاب زمانہ سے جہاں ہم میں اور عیوب پیدا ہو گئے ہیں، ایک بڑا عیب (جو سب سے بڑھ کر ترقی کا سد راہ ہے) یہ پیدا ہو گیا ہے کہ ہم جس کام کو مفید بھی تصور کر لیتے ہیں غفلت اور کاہلی کی وجہ سے اس میں ہاتھ نہیں لگاتے، اور اگر کوئی خدا کا بندہ اس کے کرنے پر آمادہ بھی ہوتا ہے تو بجائے اس کے کہ اس کی اعانت کریں، اس کا پیر پھسل جائے تو خود آ کر سنبھال لیں، عیب چینی پر تل جاتے ہیں اور جس نے زیادہ

---

(۱) روئداد اجلاس دوم: ۵

صلاحیت سے کام لیا وہ دور سے کھڑے ہو کر نتیجہ کا انتظار کرتا ہے۔(۱)

اس طرح کے عیب جو اور نکتہ چیں حضرات کی کسی زمانہ میں کمی نہیں رہی ہے۔ مولانا محمد علیؒ نے ایک دوسری جگہ اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ایک سال گزرتے ہی لوگوں نے اعتراضات شروع کر دیئے تھے، باوجود ندوہ کے تاریخی اجلاس کے جس نے پورے ملک میں زندگی کی ایک لہر پیدا کر دی تھی اور ہر طبقہ اور جماعت کے لوگ اس میں ذوق وشوق کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔ ندوۃ العلماء کے نکتہ چینوں سے ایک سال بھی صبر نہ ہو سکا، حالانکہ مختلف مکاتب خیال کے نمائندوں کا یہ روح پرور اجتماع اور حیرت انگیز اتحاد بجائے خود ایک بہت نمایاں کامیابی اور تاریخی کارنامہ تھا۔

دارالافتاء کی ضرورت پر مولاناؒ کی تقریر

یکم محرم ۱۳۱۳ھ کو جلسۂ انتظامیہ میں مولانا محمد علیؒ نے بہت قوت کے ساتھ دارالافتاء پر زور دیا (یاد رہے کہ اس سے قبل اجلاس لکھنؤ میں مولانا یہ تجویز پیش کر چکے تھے) مولانا نے کہا کہ ایک سال میں جس قدر شہرت آپ کے ندوۃ العلماء کو ہوئی ہے، دوسرے جلسوں کو دس پندرہ برس میں بھی نہیں ہوئی ہوگی۔ پھر خاص وعام (۱) جانتے ہیں کہ علماء کی یہ انجمن ہے، اب بجز ان صاحبوں کے جو کسی خاص عالم سے خصوصیت رکھتے ہیں تمام ہند کے مسلمانوں کی توجہ اس جلسہ کی طرف ہے جب کوئی ضرورت انہیں پیش آئے گی اور جب کوئی مسئلہ متعلق اعتقادیات یا عملیات دریافت کرنا ہوگا تو ضرور ندوہ سے سوال کریں گے۔(۲)

فقہ میں اجتہاد اور وسیع النظری کی ضرورت

اس کے بعد محکمۂ افتاء کی ضرورت واہمیت پر علمی وشرعی نقطۂ نظر سے مفصل تبصرہ کرنے کے بعد مولانا نے فرمایا کہ:۔

''جو دقت میں نے فقہ میں بیان کی وہ علمی حیثیت سے تھی، مگر ایک اور دقت اس میں ہمارے علماء کے لئے یہ ہے کہ زمانہ کے حالات پر ان کی نظر نہیں، دنیا کے

---

(۱) غالباً مولانا کا اشارہ بریلوی حضرات اور اہل بدعت کی طرف ہے۔(۲) کارروائی جلسہ انتظامیہ (قلمی): ۷

معاملات سے اکثر ناواقف، ان کی پیچیدگیوں کا سلجھانا دشوار، جب فقہاء تصریح کرتے ہیں کہ زمانہ کے بدل جانے سے احکام بھی بدل جاتے ہیں تو ضروری ہوا کہ مفتی زمانہ کی حالت سے بھی واقف ہو، اور اس طرح جب تک معاملات سے واقف نہ ہوگا اور اس کی پیچیدگیوں پر مطلع نہ ہوگا تو صحیح جواب کیونکر دے گا، یہاں پر محکمۂ افتاء کی ضرورت دوسرے طور سے ثابت ہوتی ہے، کیونکہ بغیر اس کی خاص توجہ کے یہ مرحلہ طے نہ ہوگا، اور بنظر ہماری حالت کے غیر ممکن ہے، ہمارے علماء کو ادھر توجہ ہے نہیں کہ زمانہ کی حالت اور اس کی موجودہ اشیاء کو دریافت کریں، جب یہ حالت ہے تو انصاف کرنا چاہئے کہ دین کی حیثیت سے اس محکمہ کی کیسی ضرورت ہے''۔(۱)

اس کے بعد مولانا نے گیارہ دفعات پر مشتمل محکمۂ افتاء کا ایک خاکہ پیش کیا، جس کے مطالعہ سے مولانا کے تبحر علمی، وسیع النظری اور بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ منشی اطہر علی صاحب رئیس کاکوروی نے بڑی دیر تک اور جوش کے ساتھ اس کی حمایت میں تقریر کی، اور کہا کہ ''پیشتر میں اس کا مخالف تھا، لیکن مولانا صاحب کی تقریر نے میرا خیال بدل دیا''۔ آخر میں مشروط طور پر دارالافتاء کا قیام منظور ہوا۔

دارالعلوم کی تجویز اور مولاناؒ کا ذہنی خاکہ

ندوۃ العلماء کے ماتحت بڑے پیمانہ پر ایک دارالعلوم کے قیام کی تجویز سب سے پہلے مولانا کے ذہن میں آئی، اور مولانا نے اس کا ایک واضح خاکہ تیار کرکے ۱۲؍محرم الحرام ۱۳۱۳ھ کے جلسۂ انتظامی میں پیش کیا، یہ تجویز منظور ہوئی، اور اس کے بعد یہ خاکہ ''مسودۂ دارالعلوم'' کے نام سے شائع کرکے استصواب رائے کے لئے ممتاز علماء، اکابرین اور اہل علم حضرات کو ارسال کیا گیا، اس میں دارالعلوم کے مقاصد بیان کرتے ہوئے مولانا نے دو چیزوں پر خاص زور دیا ہے، لکھتے ہیں:۔

علوم دینیہ، فقہ اور علم کلام میں ملکۂ تام

سب سے مقدم یہ ہے کہ قوم میں ایسے علماء کی ایک جماعت موجود ہو جو علوم مذہبی میں

---

(۱) کارروائی جلسہ انتظامیہ (قلمی):۱۱

اعلیٰ درجہ کا کمال رکھتی ہو، خصوصاً علم کلام میں، تاکہ غیر مذہب والوں کے مقابلہ میں اسلام کی حقیت اور عمدگی ثابت ہو سکے، اور علم فقہ میں اس کو ملکہ تام حاصل ہو، تاکہ عبادت اور معاملات کے متعلق احکام اور فتاویٰ اس کے مستند اور واجب العمل سمجھے جائیں۔

دنیا کے حالات سے واقفیت

دوسری چیز جس کا مولانا نے بڑے اہتمام سے ذکر کیا ہے وہ دنیا کے حالات اور واقعات سے علماء کی واقفیت ہے، لکھتے ہیں:۔

''بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک جماعت علماء کی دنیا کے حالات اور واقعات سے بھی باخبر ہو، اس کو معلوم ہو کہ جس سلطنت میں وہ بسر کرتی ہے اس کے اصول سلطنت کیا ہیں، اس کو سلطنت سے کس قسم کا تعلق ہے، مسلمانوں کی دنیوی حالت کیا ہے، ان کو کیا ضرورتیں درپیش ہیں، سلطنت کے انتظامات میں جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ان سے مسلمانوں کی حالت پر کیا اثر پڑتا ہے؟ ملک میں علماء کا جو اثر کم ہوتا جارہا ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ خیال عام طور پر پھیلتا جاتا ہے کہ علماء حجروں میں معتکف ہیں، اور ان کو دنیا کے حال سے بالکل خبر نہیں، اس لئے دنیاوی معاملات میں ان کی ہدایت اور ان کا ارشاد بالکل ناقابل التفات ہے، بے شبہ جو علماء دنیا سے بالکل ہاتھ دھو بیٹھے ہیں، اور ان کو کثرت عبادت اور ذکر وفکر کی وجہ سے اپنے زن وفرزند کے ضروریات کی طرف بھی توجہ نہیں، اصحاب صفہؓ سے ان کو تشبیہ دی جاسکتی ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ کل صحابہ کرامؓ اصحاب صفہ نہیں تھے اور نہ ہو سکتے تھے، بے شبہ اصحاب صفہؓ کے مشابہ ایک گروہ ہمیشہ قوم میں موجود رہنا چاہئے، لیکن اس کے ساتھ نہایت ضرور ہے کہ ایک جماعت کثیر ایسی بھی موجود ہو جو واقفیت واطلاع، انتظام وتدبیر، حزم ومصلحت اندیشی میں حضرت عمرؓ، عمرو بن العاصؓ، خالد بن الولیدؓ، ابوعبیدہ امینؓ کے نقش قدم پر ہو۔'' (۱)

مسودۂ دار العلوم میں مولانا نے درجات، طریقۂ تعلیم، مدت تعلیم، ترتیب علوم، طلبہ

---

(۱) تجویز دار العلوم: ۳۱

واساتذہ کی رہائش اور نظام الاوقات وغیرہ کا بڑی تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ایک جامع اور علمی نقشہ پیش کیا ہے، اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی نظر اس شعبہ میں کتنی گہری، کتنی وسیع، کتنی جدید (UP TO DATE) اور کتنی دوراندیش اور وقت شناس تھی، یہ خاکہ زمانہ گزرنے کے باوجود اسی طرح تازہ اور نیا ہے، اور ندوہ کے ہر بہی خواہ ذمہ دار کے لئے اس کا مطالعہ مفید اور ضروری ہے۔ یہ مسودہ اس قابل تھا کہ پورا اس جگہ درج کیا جائے، لیکن طوالت کی وجہ سے اس کے بعد خیال انگیز اور لائق توجہ اجزاء یہاں لکھے جاتے ہیں، اس سے ہم کو اندازہ ہوگا کہ مولانا کے ذہن میں دارالعلوم کا کیا تصور اور نقشہ تھا، یہ ایک قلمی تصویر ہے جس کی مدد سے ہم مولانا کے افکار وخیالات کو گرفت میں لا سکتے ہیں، اور ان کے تصور تعلیم وتربیت وتعمیر شخصیت کو قابل وثوق ذریعہ سے سمجھ سکتے ہیں۔

اس مسودہ میں مولانا نے دارالعلوم کے احاطہ میں مدرسین اور نگراں ومربی حضرات کے مکانات کی تعمیر پر زور دیا ہے، طلبہ کے لئے ایک دارالاکل (ڈائننگ ہال) کی تجویز کی ہے، جہاں طلبہ واساتذہ یکجا ہوکر کھانا کھائیں گے۔ طلبہ کی رہائش کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ:۔

> ''ہر طالب علم کے لئے جدا کمرہ ہوگا اور بجز کسی خاص حالت کے دو طالب علم ایک حجرے میں نہ رہیں گے، طالب علموں کو تاکید ہوگی کہ وہ اپنے حجروں کو صاف اور پاکیزہ رکھیں، صبح سے شام تک جو اشغال ہیں مثلاً سو کر اٹھنا، نماز پڑھنا، مطالعہ کرنا، مدرسہ جانا، کھانا کھانا، ورزش کرنا، سب کے لئے اوقات متعین ہوں گے، اور تمام طالب علموں کو ان ہی اوقات میں سب کام کرنا ہوں گے''۔

ایک اسلامی لباس

ایک خاص بات جو اس مسودہ میں نظر آتی ہے وہ ایک اسلامی لباس (یونیفارم) ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ مولانا کا یہ نقطہ نظر اور خیال بڑی دوراندیشی اور فطرت شناسی پر مبنی ہے۔

گھوڑسواری اور نشانہ بازی

اسی کے ساتھ نماز عصر کے بعد تمام طلبہ گھوڑسواری اور بندوق چلانا، تیرا کی اور اس

قسم کی دوسری جسمانی ورزشوں میں حصہ لیں گے۔

کسب حلال کے لئے بعض فنون صناعیہ سکھائے جائیں گے، مگر اس کا تعین طالب علم کے رجحان اور مناسبت پر ہوگا۔

مہینہ میں دو یا تین مرتبہ طلبہ علمی واخلاقی مضامین پر مباحثہ (سمپوزیم) کریں گے، اور اس کے لئے ایک مخصوص ہال ہوگا۔

طرز رہائش اور لباس وخوراک وغیرہ کسی چیز میں غریب طلبہ اور دولت مند طلبہ میں مولانا نے کوئی امتیاز روا نہیں رکھا۔ مولانا کے الفاظ میں:۔ بس فرق اتنا ہوگا کہ دولت مند طلبہ تمام مصارف اپنے پاس سے ادا کریں گے، اور غریبوں کے لئے ان تمام مصارف کا انتظام مدرسہ کی طرف سے ہوگا۔

تہذیب اخلاق، اور تزکیۂ نفس

تہذیب نفس اور تزکیۂ باطن کو اس خالص عملی اور انتظامی خاکہ میں بھی مولانا نے فراموش نہیں کیا ہے اور نشانہ بازی، گھوڑ سواری اور جدید اسالیب تعلیم اور تربیت کے ساتھ اس پر بھی زور دیا ہے اور یہ مولانا کی وہ خصوصیت اور جامعیت ہے جو اس دور کے کم لوگوں میں نظر آتی ہے۔

اس شعبہ میں مولانا نے تصوف واخلاق کی دو مشہور کتابیں ''احیاء العلوم'' اور ''عوارف المعارف'' کے منتخب حصوں کی سفارش کی ہے، اور تفسیر وحدیث کے مطالعہ پر زور دیا ہے۔

عربی زبان کی مشق

مہینہ میں ایک بار عربی زبان میں مباحثہ ضروری قرار دیا ہے جس کی وجہ اور ضرورت بیان کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں کہ آج کل کے طلبہ بلکہ اکثر علماء کا حال یہ ہے کہ اگر کوئی عرب آجائے، اس سے پانچ منٹ تک محاورۂ عربی میں بات چیت نہیں کرسکتے۔

اسلامی ممالک کے جغرافیہ پر بھی مولانا نے زور دیا ہے، اور قرآن وحدیث کے مقامات سمجھنے کے لئے اس کی اہمیت واضح کی ہے۔

سیاسی اور تاریخی موضوعات پر تقریر

وعظ اور مناظرہ کے علاوہ کسی علمی، سیاسی یا تاریخی موضوع پر گھنٹے دو گھنٹے تقریر کی مشق کا خاص طور پر ذکر ہے۔

امتحانات کے سلسلہ میں مولانا نے سخت شرائط لکھے ہیں، اور فارغین کے لئے ''عبا'' کی تجویز کی ہے جو فراغت کے بعد رسمی طور پر مدرسہ کی طرف سے ان کو دیجائے۔

لباس و خوراک، اور طرز رہائش وغیرہ میں مولانا نے عربی ذوق کو ترجیح دی ہے، اور اس کو قابل تقلید حیثیت سے پیش کیا ہے۔

درسیات کے سلسلہ میں جو تجاویز تھیں ان کا ذکر اس جگہ میں نے قصداً نہیں کیا، اس کی تفصیل مسودۂ نصاب عربی کے سلسلہ میں آگے ملے گی۔ یہ خاکہ پیش کرنے کے بعد مولانا لکھتے ہیں:۔

> ''ان تجاویز کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ لڑکے ایسے مہذب اور پابند مذہب ہوں کہ دوسروں پر اپنا اثر ڈال سکیں، طالب علموں میں دلیری و بلند ہمتی و عالی نظری و فراخ حوصلگی پیدا ہو جو بغیر اس قسم کے دار العلوم کے جس میں تمام باتیں نہایت شان و شوکت کے ساتھ ہوں، حاصل نہیں ہوسکتی۔ علوم دینیہ خصوصاً علم کلام میں جس کی اس وقت نہایت ضرورت ہے، نہایت اعلیٰ درجہ کا کمال پیدا کیا جائے، تاکہ الحاد و دہریت کا مقابلہ پورے زور و قوت سے ہوسکے''۔

آخر میں مولانا نے اس منصوبہ کے مصارف کا تخمینہ دس لاکھ روپیہ لگایا ہے جس کو آج کے ۲۰، ۲۵ لاکھ روپیہ کے برابر سمجھنا چاہیئے۔

علماء کی طرف سے ہمت افزا خطوط

یہ مسودہ علماء اور اہل فکر کی ایک بڑی تعداد کو بھیجا گیا، اور اگرچہ بیشتر علماء اس وقت اتنا آگے بڑھ کر اور رسم و روایت سے بالاتر ہو کر سوچنے کے لئے تیار نہ تھے لیکن پھر بھی ایک خاصی تعداد نے اس کا بڑی گرمجوشی اور زندہ دلی کے ساتھ خیر مقدم کیا اور اپنی مکمل تائید کا اظہار کیا، اور اس کو ایک ایسا انقلابی قدم قرار دیا جس کے نتائج و ثمرات ملت اسلامی

کے حق میں بڑے دوررس اور حیات آفریں ثابت ہوسکتے ہیں۔

مولانا تھانویؒ کی رائے

مولانا تھانویؒ نے بھی (جواس وقت مدرسہ جامع العلوم کانپور میں مدرس اول تھے) مفصل طور پر اپنی رائے دی اور لکھا کہ:۔

"مسودۂ دار العلوم کی تجاویز کلہا صحیح اور مناسب ہیں، ایسے عظیم الشان اور جلیل القدر دار العلوم کا وجود ذہنی سے وجود خارجی میں آنا موجد الموجودات کی قدرت کاملہ کے سامنے کوئی مستبعد امر نہیں"۔

مولانا نے اس بیان میں مسلمانوں کو اس کی تائید اور اعانت کی طرف توجہ بھی دلائی، یہ مسودہ دار العلوم اجلاس بریلی میں پیش ہوا اور منظور کیا گیا۔

ندوۃ العلماء کا پہلا مجوزہ نصاب تعلیم

ندوۃ العلماء کے معمار اور بانی کے لئے یہ زمانہ عین ذہنی مشغولیت کا تھا، ندوہ کی فکری عمارت کی بنیادیں تیار ہو رہی تھیں، اس وقت ذراسی غفلت اور چوک تعمیر کو غلط رخ پر ڈال سکتی تھی۔ مولانا کا ذہن اس سلسلہ میں برابر کام کر رہا تھا، اور وہ اس اہم اور نازک مرحلہ پر پوری ہوشمندی اور بیدار مغزی کے ساتھ رہنمائی کر رہے تھے۔

۱۲/محرم ۱۳۱۳ھ کو مولانا نے مسودۂ دار العلوم پیش کیا تھا، اور اس کے ۵/ ماہ بعد ۱۴/ جمادی الاولیٰ ۱۳۱۳ھ کو مولانا نے "مسودۂ نصاب عربی" کے نام سے ندوۃ العلماء کے مجوزہ نصاب تعلیم کا نقشہ پیش کیا۔

اس رسالہ میں مولانا نے ہندوستان میں نصاب درس کے نشوونما اور ارتقاء کا ایک جامع اور مختصر جائزہ لینے کے بعد بدلے ہوئے حالات کی روشنی میں ایک نیا نصاب تجویز کیا ہے، یہ گویا ندوہ کا پہلا "مینی فیسٹو" ہے جس میں اس کی فکری بنیادیں اور مقاصد بہت نمایاں ہوکر سامنے آئے ہیں، اور ان فکری بنیادوں پر اٹھنے والی عمارت کی پوری تصویر کھینچ دی گئی ہے۔

اس میں مولانا نے ۲۰ علوم کا ذکر کیا ہے، اور ان علوم کی کتابیں انتخاب کی ہیں پھر

اس انتخاب کی وجوہات بیان کی ہیں، ان علوم میں بیشتر علوم متداولہ ہیں، ۶ علوم کا مولانا نے اضافہ کیا ہے:۔

(۱) تاریخ) (۲) اصول لغت (۳) تجوید۔ (۴) عروض۔ (۵) سلوک وتہذیب نفس (۶) اسرار احکام اور اس کے بعد اس اضافہ کی وجہ بیان کی ہے۔

تاریخ کی اہمیت

تاریخ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

(اس میں مولانا نے تاریخ الخلفاء اور مقدمہ ابن خلدون کا اضافہ کیا ہے)۔

''اس وقت اس کی سخت ضرورت ہے، اس کے دیکھنے سے اسلام کی شان وشوکت معلوم ہوتی ہے،..... دوسرے یہ کہ اس وقت اس کا بہت زور وشور ہے، مسلمانوں کو اس کے نہ جاننے سے بہت حقارت سے دیکھا جاتا ہے۔ ادنیٰ ادنیٰ شخص علماء کو تاریخی واقعات میں اپنے سامنے نابلد خیال کر کے بہت بے وقعتی کی نگاہ سے دیکھتا ہے، تھوڑی بے توجہی سے ابنائے اسلام کی نظروں میں حقیر ہونا خلاف شان اسلام ہے اور بہت سبکی کی بات ہے، خصوصاً وہ علم جس کے جاننے سے دین ودنیا دونوں کے فائدے ہوں''۔ (۱)

اسرار احکام

اسرار احکام کی ضرورت بیان کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:۔

''یہ وہ علم ہے جس سے ایمان تقلید سے تحقیق کے مرتبہ کو پہونچتا ہے، اطمینان قلب کامل درجہ ہو جاتا ہے، مخالفین دین کے جواب میں بہت کچھ اس سے اعانت ملتی ہے، اس وقت اس کی نہایت ضرورت ہے کیونکہ آزادی بڑھتی جاتی ہے، اور بغیر وجہ معلوم ہوئے لوگ کسی امر کو تسلیم نہیں کرتے، اس لئے اس کا داخل درس کرنا بہت ضروری ہے۔''

جن علوم میں کمی وبیشی اور ترمیم واضافہ کیا گیا ہے اُن میں فلسفہ، منطق، ہیئت، وغیرہ

---

(۱) مسودہ نصاب عربی:۲۵

ہیں۔ فلسفہ میں ایک آدھ کتاب ملتی ہے، جس کا مقصد مولانا نے یہ بیان کیا ہے کہ اصطلاحات کے سمجھنے اور بعض وقت مخالفین اسلام کے جواب میں اس سے مدد ملتی ہے، اور یہ بات ایک کتاب سے حاصل ہے۔ فلسفہ جدید کا اس میں اضافہ کیا ہے۔

ہیئت کی مشہور کتاب ''شرح چغمینی'' خارج کردی ہے اور جدید ہیئت کو مستحسن اور مناسب قرار دیا گیا ہے، لیکن کسی کتاب کی سفارش نہیں کی گئی۔

نصاب پر ایک نظر

مولانا کے تحریر کردہ نصاب واصولِ نصاب کا غیر جانبداری سے جائزہ لینے کے بعد ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں جدید فلسفہ، جدید ہیئت اور جدید تاریخ کی ضرورت کا اعتراف تو پورے طور پر موجود ہے، لیکن اس سلسلہ میں اہم اور قابل ذکر کتابیں کم نظر آتی ہیں، ریاضی اور جغرافیہ کی کسی کتاب کی سفارش نہیں کی گئی، حالانکہ دونوں چیزوں کی اہمیت کا مولانا کو پورا احساس ہے، سیاسیات واقتصادیات کا باضابطہ طور پر رسالہ میں ذکر نہیں، حالانکہ اس کے دواعی اور فوائد بیان کئے گئے ہیں۔

مسودہ دارالعلوم میں جو اس سے چند ماہ قبل لکھا گیا تھا اس میں مولانا نے سلطنت واصول سلطنت، اس کے تغیرات اور ان تغیرات کے اچھے برے اثرات، اور اس کے فوائد ونقصانات کا ذکر کیا ہے اور علماء کے لئے اس سے واقفیت بہت ضروری قرار دی ہے، اسی طرح ندوۃ العلماء کے روزِ اول ہی سے مولانا علماء کو معیشت کی طرف خاطر خواہ توجہ کرنے کی دعوت دیتے رہے، اور اقتصادی طور پر اس کے استحکام کی ضرورت واضح کرتے رہے پھر کیا وجہ ہے کہ اقتصادیات یا سیاسیات کی کوئی کتاب داخل نصاب نہیں کی گئی۔

مولاناؒ کی مجبوری

نکتہ چینوں کو شاید اس میں اعتراض وتنقید کا قیمتی مواد مل سکے لیکن میری نظر میں ہر وہ شخص جو اس موقف پر ہوتا اور ترتیب نصاب کی اہم ذمہ داری اس کے سپرد ہوتی اور خوش کن خیالات کی دنیا سے نکل کر اس کو عملی دنیا کی دقتوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا وہ

ان حالات میں اس سے زائد نہیں سوچ سکتا تھا، اس بات کو ہمیں اسی ماحول کے اندر رہ کر سوچنا چاہئے جس ماحول میں یہ اہم تعلیمی خاکہ مولانا نے پیش کیا ہے۔

اس زمانہ میں سیاسیات اور اقتصادیات جیسے علوم اتنے مدون، مرتب اور منقح شکل میں موجود نہ تھے جتنے آج نظر آتے ہیں، اور نہ ان سے فائدہ اٹھانا اس وقت اتنا آسان تھا جتنا آج ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ علوم اردو میں پورے طور پر منتقل نہ ہوئے تھے، اور تیسری چیز جو سب سے اہم ہے وہ یہ کہ اہل مغرب نے ان علوم کو (جو یقیناً مغربی نہیں کہے جاسکتے) اپنے خاص نقطۂ نظر سے مدون کیا تھا، اور اس میں تمام تر مغربی طرز فکر اور مادی روح (SPRIT) کارفرما تھی، مسلمانوں کے لئے ان کو جوں کا توں قبول کر لینا نہ مفید تھا نہ ممکن۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ان کو اسلامی نقطۂ نظر سے از سر نو مدون کیا جائے، مولانا نے بڑی سادگی اور صفائی کے ساتھ اس کمی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"افسوس یہ ہے کہ جس قسم کی تاریخ کی اس وقت ضرورت ہے ویسی دیکھی نہیں گئی، اگر خدا موجود کر دے تو ضرور داخل درس کر دی جائے"۔

علم کلام کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"ہمیں علم کلام جن کے لئے پڑھانا ہے وہ سب نئے فرقے ہیں، ان کے لئے نئے علم کلام کی ضرورت ہے، مگر میری، غرض نہیں کہ پہلے علم کلام کی کتابیں بالکل بیکار ہو گئیں، بلکہ بہت سی باتیں ان میں مفید ہیں، البتہ اس امر کی ضرورت ہے کہ وہ مفید باتیں لے کر کچھ اضافہ کی جائیں جو اس وقت کے لئے ضروری ہیں"۔ (۱)

فلسفۂ جدید کے سلسلہ میں مولانا ایک اہم ترین دشواری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"فلسفہ جدید کے رد کرنے کے لئے زبان انگریزی کا جاننا بھی ضرور ہے کیونکہ یہ فلسفہ زبان انگریزی میں ہے، اور ترجمہ کرا کے اس کا جواب دینا جیسا کہ ابتدائے اسلام میں فلسفۂ یونانی کے ساتھ کیا گیا، کافی نہیں ہو سکتا"۔

آگے لکھتے ہیں:۔

---

(۱) مسودہ نصاب عربی: ۲۶

''فلسفۂ جدید کے اصول وفروغ ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں، نئے نئے تحقیقات ہمیشہ اضافہ ہوتے رہتے ہیں، پھر ہمیشہ ان کا ترجمہ ہونا اور جواب لکھا جانا سخت دشواری کے سوا بعض وقت بے سود ہوگا کیونکہ جب تک ترجمہ ہو اور جواب لکھ کر شائع کیا جائے وہاں کچھ اور ہی ہوگا، اب ہمارا جواب ان کے روبرو فضول ٹھہرا''۔(۱)

ریاضی، تاریخ اور جغرافیہ کے متعلق مولانا نے لکھا ہے کہ:۔اس کی کتابیں میں اس وقت متعین نہیں کرتا، مشورہ کے بعد ہو جائیں گی۔

جدید علوم پر اردو کی ایسی کتابیں جو طلبہ کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہوں، اس زمانہ میں مفقود تھیں اس لئے ان کے انتخاب کا مسئلہ ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ جو کتابیں مصر وشام وبیروت میں شائع ہورہی تھیں وہ مغربی افکار وخیالات اور مادی طرز فکر کی آمیزش سے پاک نہیں تھیں بلکہ ہو بہو ان کا چربہ تھیں، اس کے علاوہ ان کا فنی معیار مدارس عربیہ کے ان طلبہ کی دسترس سے بہت بلند تھا جو اس فن کی ابجد سے بھی ناواقف تھے۔

دوسری دشواری

دوسری دشواری یہ تھی کہ انتخاب ان ہی کتابوں سے کرنا تھا جو اس وقت رائج تھیں۔(۲) نئے علوم کی تدریس کے لئے نئی کتابوں کی تالیف اور صرف ونحو وادب وبلاغت کے لئے نصاب کی ترتیب نہ اس وقت ممکن تھی، نہ ہر حلقہ کے لئے قابل قبول۔ اس اہم کام خاصا عرصہ درکار تھا، ان حالات میں زیادہ سے زیادہ یہ کیا جاسکتا تھا کہ جو کتابیں اس زمانہ میں رائج اور متداول تھیں اس میں زمانہ کے حالات، طلبہ کی استعداد، اور مستقبل کے خطرات کو پیش نظر رکھ کر بہتر سے بہتر انتخاب کیا جائے، جو نئی اور کامیاب کتابیں ان موضوعات پر لکھی گئی ہیں ان سے فائدہ اٹھایا جائے، وہ علوم جن کی اہمیت اس زمانہ میں بہت بڑھ گئی ہے اور جو ہمارے دین ودنیا

---

(۱) مسودہ نصاب عربی:۲۸ (۲) مولانا نے کتابوں کے انتخاب میں کسی خاص حلقہ یا کسی خاص ذوق کی پابندی نہیں کی۔ ہندوستان کے علاوہ مصر وشام کی درسیات کو بھی پیش نظر رکھا ہے، ایک آدھ جگہ مولانا نے اس بات کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔

دونوں کے لئے مفید اور ضروری ہیں، ان کو نصاب میں داخل کیا جائے۔ مثلاً جدید علم کلام، اسرارِ احکام، تاریخ وجغرافیہ وغیرہ، منطق وفلسفہ کے بڑے حصہ کو ترک کیا جائے اور صرف اس کے مفید، اور ضروری اجزاء پر اکتفاء کی جائے، قرآن وحدیث اور فقہ کی طرف زیادہ توجہ دی جائے اور اس کی کوشش کی جائے کہ طلبہ کو اس سے زیادہ سے زیادہ مناسبت ہو اور اس کی محبت وعظمت ان کے دل ودماغ پر نقش ہو اور وہ اس کو اپنی ساری جدوجہد اور اجتماعی وتعمیری کاموں کی روح سمجھیں۔

مولانا نے جو نصاب ترتیب دیا ہے وہ اس معیار پر پورا اترتا ہے، فراغت کے بعد تکمیل کا جو نصاب مولانا نے تجویز کیا ہے اس میں خاص بات یہ ہے کہ ہر فن کے ساتھ تفسیر، حدیث اور فقہ کی ایک منتخب کتاب لازمی کردی گئی ہے۔ اگر کوئی ادب یا تاریخ کی تکمیل کرنا چاہتا ہے تو اس کو اپنے خاص موضوع کے ساتھ ان مذکورہ بالا علوم کی ایک ایک کتاب بھی پڑھنی ہوگی تا کہ ان علوم سے جن پر اسلامی نظام کا دار ومدار ہے اس کا براہ راست تعلق قائم رہے اور ذوق ومناسبت میں اضافہ ہو، حقیقت یہ ہے کہ یہ رائے مولانا کی اصابت فہم اور نفسیات شناسی کی دلیل ہے اور بڑی حکمت اور حقیقت پسندی پر مبنی ہے۔

اس کے ساتھ تزکیہ نفس اور اصلاح اخلاق کے شعبہ میں مولانا نے بعض کتابوں کی سفارش کی ہے، خواہ درسیات کی حیثیت سے یا بطور مطالعہ کے۔

انقلاب انگیز نصاب

مروجہ درس نظامی اور شروح وحواشی کے کتب خانہ کے مقابلہ میں یہ نصاب ایک انقلاب انگیز نصاب کہلانے کا مستحق ہے، اور اس کے حامیوں کی نظر میں بغاوت سے کسی طرح کم نہیں، اس میں اس کے سارے نظام کو پہلی بار درہم برہم کردیا گیا ہے، اور ان بہت سے اصولوں اور روایتوں کو توڑ دیا گیا ہے جن پر اس کی بنیاد تھی۔ اس نصاب میں مولانا نے جن مقاصد کو پیش نظر رکھا ہے وہ ان مقاصد سے بہت زیادہ متنوع اور وسیع ہیں جو مقاصد اس درس کے بانیوں اور حامیوں کے پیش نظر تھے۔ کتابوں کے انتخاب وترتیب اور حذف واضافہ کے وقت اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ یہ کتابیں طلبہ میں وہ صلاحیت وقابلیت اور

وہ صفات وخصوصیات پیدا کرسکیں جو اس تغیر پذیر اور مادہ پرست دنیا کے لئے ضروری ہیں:۔

یہ نصاب تعلیم اور دار العلوم کا وہ خاکہ اور دستور العمل جس کے کچھ اشارے گزشتہ صفحات میں دیئے گئے ہیں، ندوۃ العلماء جیسے ادارے کے لئے اس وقت بلاشبہ موزوں ترین نصاب اور دستور العمل تھا، اور باوجود اس کے کہ اس پر نصف صدی سے زائد عرصہ گزر چکا ہے اور اب اس میں خاصے تغیر اور ترمیم واضافہ کی ضرورت ہے (۱) (اور جب تک زمانہ بدلتا رہے گا یہ ضرورت باقی رہے گی) اس کی اسپرٹ اور روح، اس کا مزاج اور مقصد آج بھی نیا اور تازہ ہے، اور اس کے بعض اجزاء اس مغربی، اشتراکی، لادینی اور مادہ پرست دنیا میں اب بھی قابل تقلید اور لائق استفادہ ہیں۔

مولانا کا یہ مجوزہ نصاب ۹/رجب ۱۳۱۳ھ کے جلسۂ انتظامیہ میں بحث کی غرض سے پیش ہوا، اس عرصہ میں مختلف علماء کی رائیں بھی آچکی تھیں اور کئی نصاب سامنے تھے۔ تین دن کی شبانہ روز گفتگوؤں اور مباحثوں کے بعد اس میں متعدد ترمیم واضافے کئے گئے لیکن کام کی تکمیل پھر بھی نہ ہوسکی، اور مختلف جلسوں میں اس پر اطمینان کے ساتھ غور ہوتا رہا، اور اس میں ایک خاصا عرصہ گزر گیا۔

استعفیٰ کی کوشش

۸/رجب ۱۳۱۳ھ کے جلسۂ انتظامیہ میں کام کی زیادتی اور اپنی علالت وضعف کے پیش نظر (خیال رہے کہ مولانا کو درد گردہ کی پرانی شکایت تھی، اور اس کی وجہ سے ضعف بہت ہوتا جاتا تھا) مولانا نے استعفیٰ پیش کرنا چاہا، لیکن صدر انجمن مولانا لطف اللہ صاحبؒ نے اس کو منظور نہ کیا، اور یہ تجویز رکھی کہ ناظم کی مدد کے لئے ایک مددگار ناظم کا تقرر کیا جائے، اس سے مولانا کا بار ہلکا ہو جائے گا۔ چنانچہ مولانا شاہ سلیمان پھلوارویؒ کا انتخاب عمل میں آیا، لیکن مصارف ماہانہ پر کچھ اختلاف ہوا، اور مولانا نے یہ عہدہ قبول کرنے سے معذرت کردی۔

---

(۱) مسرت کی بات ہے کہ اب دار العلوم اپنے نصاب کے معاملہ میں خاصی حد تک خود کفیل ہوگیا ہے، صرف ونحو، ادب وانشاء اور جغرافیہ پر خود فضلاء ندوہ نے بیش قیمت کتابیں تیار کی ہیں جن میں جدید تقاضوں کی رعایت کے ساتھ طلبہ کی استعداد اور ذوق ومناسبت کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے، طبعیات، معاشیات اور سیاسیات کے درس ومطالعہ کا بھی انتظام ہے، اگرچہ خاطر خواہ نہیں ہے۔

مولانا ظہور الاسلام فتحپوریؒ نے مولانا حکیم سید عبدالحیؒ (۱) کا نام پیش کیا۔ مولانا سید عبدالحیؒ صاحب نے بلا معاوضہ یہ خدمت قبول کی، اور جلسہ نے بالاتفاق یہ طے کیا کہ مولانا محمد علیؒ بدستور ناظم رہیں گے اور مولانا عبدالحیؒ مددگار ناظم کی حیثیت سے کام کریں گے۔

اہل تشیع سے ترک موالات

اسی جلسہ میں یہ فیصلہ ہوا کہ اہل تشیع کو آئندہ سے ندوہ کے جلسوں میں تقریر کرنے یا تجویز پیش کرنے کی اجازت نہ دی جائے (یاد رہے کہ ندوہ کے پہلے اجلاس میں ایک شیعہ مجتہد نے تقریر کی تھی اور اس کی وجہ سے خاصی تلخی اور بدمزگی پیدا ہوگئی تھی)۔

---

(۱) مولانا سید عبدالحیؒ اپنی طبع سلیم، روشن ضمیری اور جامعیت و اعتدال پسندی کی وجہ سے ندوہ سے شروع ہی میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ ان کے والد ماجد مولانا حکیم سید فخر الدینؒ مؤلف "مہر جہاں تاب" بھی ندوہ کے پرزور حامی اور مؤید تھے، انہوں نے تجویز دارالعلوم کی اپنے ایک بیان میں پرزور حمایت کی ہے جو ندوہ کی ابتدائی روئداد میں موجود ہے۔ روئداد اجلاس لکھنؤ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ندوہ کے جلسہ میں شریک تھے اور ندوہ کے ارکین قسم اول میں تھے، اس وقت وہ علوم دینیہ سے فراغت کے بعد جھوائی ٹولہ میں ہی طب کی تعلیم میں مشغول تھے، اور حکیم عبدالولی صاحب کے ہاں مطب بھی کر رہے تھے۔ ندوہ کے اجلاس لکھنؤ سے چند ماہ قبل رجب ۱۳۱۲ھ میں انہوں نے دہلی اور اس کے اطراف کا ایک اہم سفر کیا، اس وقت ان کی عمر ۲۶ سال تھی، "ارمغان احباب" کے نام سے انہوں نے اس سفر کا روزنامچہ بھی قلم بند کیا، اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ندوہ کے تخیل اور ثقافت سے بہت قریب تھے اور اسی ذوق و طرز فکر کے حامل تھے جو ندوہ کی خصوصیت اور دعوت ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس روزنامچہ کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔ یہ دیکھنے کی چیز ہے کہ نوجوان علماء پر اردو ادب کے انقلاب کا اثر کتنا جلد پڑ گیا تھا، اور پرانی طرز تحریر کے بجائے صاف اور سادہ لکھنے کی مشق کس حد تک ہو چکی تھی"، اس کے بعد وہ اجلاس لکھنؤ میں شریک ہوئے، سارا مسالہ اور مواد پہلے سے موجود تھا، اس نئی چنگاری نے اس استعداد و صلاحیت کو صحیح رخ اور مناسب میدان عطا کر دیا۔ اور یہ ابتدائی شرکت تاحیات رفاقت کا سبب بن گئی۔ اور مولانا نے اپنی ساری عمر ندوہ کی خدمت میں اس طرح گزار دی کہ نازک سے نازک موڑ اور سخت سے سخت مرحلہ میں بھی ان کے انداز عزیمت میں کوئی فرق اور پائے استقامت میں کوئی جنبش نظر نہ آئی، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے "یاد رفتگان" میں لکھا ہے کہ ندوہ پر کیا کیا انقلاب آئے، کتنے ارکان بدلے، کتنے منتظمین آئے اور کتنے گئے، مگر ان تمام حالات و حوادث کے طوفان میں ثبات و استقلال کی صرف ایک چٹان تھی جو اپنی جگہ پر تھی، اور مولانا سید عبدالحی صاحب مرحومؒ کی ذات تھی ۱۹۲۳ء میں وفات پائی۔

ندوہ کے تعارف کے لئے علماء کا وفد

اسی جلسہ میں یہ بات طے ہوئی کہ ندوہ کے تخیل اور اغراض و مقاصد کے تعارف نیز مدارس اور اسلامی انجمنوں کی نگرانی اور مسلمانوں کے حالات سے واقفیت کے لئے علماء کا ایک وفد ہندوستان کے مختلف علاقوں کا دورہ کرے، یہ بھی طے ہوا کہ جو لوگ ندوہ کے مقاصد سے دلچسپی لیں اور اس سے مکمل عملی تعاون کریں ان کو معین الندوہ کا خطاب دیا جائے۔

مولانا کی قیادت میں وفد ندوہ کی روانگی اور نمایاں کامیابی

۲۵ / رجب ۱۳۱۳ھ کو دفتر ندوۃ العلماء کانپور سے مولانا کی قیادت میں ایک وفد فتح پور ہنسوہ اور رائے بریلی کے دورہ پر روانہ ہوا، وہاں پہونچ کر مدارس کی حالت دیکھی، لوگوں کو نزاع باہمی سے خبردار کیا، اتحاد و محبت کی اہمیت واضح کی، یہ دورہ نتائج کے اعتبار سے کامیاب رہا، بہت سے لوگوں نے مراسم اور غیر ضروری تقریبات اور اسراف سے توبہ کی اور بالاتفاق تحریری معاہدہ دیا کہ وہ اتحاد و محبت کے ساتھ زندگی گزاریں گے۔ ان ظاہر فائدوں کے علاوہ ندوہ کے اغراض و مقاصد کی اچھی طرح اشاعت ہوئی۔ مدرسۂ اسلامیہ فتح پور (۱) جو اس علاقہ میں واحد دینی مدرسہ ہے، مالی دشواریوں کا شکار تھا، وفد کی آمد سے اس میں بھی بہار آئی۔ طلبہ کے کمروں کے لئے اکثر شرکاء جلسہ نے اپنی ایک روز کی آمدنی لکھوادی، بعض حضرات نے ایک ایک کمرہ کی تعمیر اپنے ذمہ لی۔ ایک رئیس نے ۲۵ بیگھہ کی آراضی اسی وقت مدرسہ کے لئے وقف کردی، ایک دوسرے صاحب نے ۶ بیگھہ، ایک اور صاحب نے ۲۵ روپیہ سالانہ لگان کی آراضی وقف کردی، چنانچہ اسی وقت اور سیر کو عمارت کا نقشہ تیار کرنے کی ہدایت کی گئی، مراسم کے خلاف ایک عہد نامہ تیار کیا گیا اور سب نے بالاتفاق اسے منظور کیا۔

مولانا محمد علی کو اس مدرسہ کی بڑی فکر تھی، ایک موقع پر معائنہ کے لئے وہاں تشریف لے گئے۔ اس وقت طلبہ کے لئے کچھ کمرے بن چکے تھے اور تعمیر جاری تھی۔

---

(۱) یہ مدرسہ مولانا سید ظہور الاسلام صاحب فتحپوریؒ نے ۱۳۰۱ھ میں قائم کیا تھا، ان کے عزائم بہت بلند تھے، یہ مدرسہ اب بھی شہر فتحپور میں دینی تعلیمی خدمت انجام دے رہا ہے۔

ایک قدیمی نزاع کا خاتمہ

رائے بریلی میں مدرسۂ اسلامیہ بہت کسمپرسی کی حالت میں تھا، یہ وفد اس کے حق میں بھی آب حیات ثابت ہوا، ٹاؤن ہال میں عام جلسہ ہوا، مولانا سید عبدالحیؒ نے اس موقع پر ایک مؤثر تقریر کی، اور اسی وقت مدرسہ کے لئے ایک معتد بہ رقم فراہم ہوگئی، ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ وہاں دو رئیسوں میں بہت زمانہ سے ایک نزاع چلا آرہا تھا، اور اس کی وجہ سے سخت فتنے برپا رہتے تھے، اس وفد کی بدولت یہ نزاع ختم ہوگیا۔

دوسرے علاقوں کے لئے مولانا مشتاق علی مقرر کئے گئے اور انہوں نے حسب توقع بہت جانفشانی اور محنت کے ساتھ کام کیا، ان کے سپرد یہ کام تھا کہ مختلف علاقوں میں ایسی انجمنیں قائم کریں جو مسلمانوں میں دینی و دنیاوی تعلیم کا انتظام کریں، اور رسوم وغیرہ کا انسداد کریں، اس میں مولانا مشتاق علی کو حیرت انگیز کامیابی حاصل ہوئی، چنانچہ کانپور، لکھنؤ، آنولہ، بریلی، رائے پور، سنبھل، مرادآباد، امروہہ، نگینہ، نجیب آباد، بجنور، شیرکوٹ، دھام پور، لٹور اور دوسرے مقامات پر ایسی انجمنیں قائم ہوگئیں۔ (۱)

کام کی رفتار

یہ زمانہ ندوۃ العلماء کی ترقی اور شباب کا تھا، کام کی رفتار خاصی تیز تھی، مولانا محمد علیؒ اپنی مشغولیتوں اور سلسلۂ علالت کے باوجود سارے دفتری کام کی دیکھ بھال کررہے تھے، رپورٹ سال سوم کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال جو خطوط دفتر کو موصول ہوئے، ان کی تعداد ۱۰۵۵ تھی، اور جو دفتر سے بھیجے گئے ان کی تعداد ۳۰۷۶ تھی، اس تعداد سے اندازہ ہوتا ہے کہ دفتری کام پوری محنت، مہارت اور بیدار مغزی کے ساتھ انجام پارہا تھا اور اس سے علماء سے رابطہ قائم کرنے اور ندوہ کے مقاصد کے تعارف و اشاعت میں بڑی مدد مل رہی تھی۔

حیدرآباد کی طرف سے وظیفہ اور مولانا کا استغناء

اسی زمانہ میں نواب وقار نواز جنگ بہادر کی کوششوں سے ۵۰ روپیہ ماہوار ندوہ کے

---

(۱) اس دورہ کی مزید تفصیل روئداد سال سوم میں موجود ہے۔

لئے اور ۵۰ ماہوار مولانا کے لئے مقرر کئے گئے، لیکن مولانا نے ضرورت کے باوجود اس کو قبول کرنا گوارا نہ کیا، اور اپنے حصے کی رقم بھی ندوہ ہی کے نام منتقل کر دی۔

اجلاس بریلی

۲۶ر شوال ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۱را پریل ۱۸۹۶ء کو بریلی میں ندوہ کا تیسرا سالانہ اجلاس شروع ہوا، اس تین سال کے عرصہ میں ندوۃ العلماء نے ملک کے ذہین اور حساس طبقہ کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا، اس کا اندازہ ان سپاسناموں سے ہوسکتا ہے، جو اس اجلاس میں پیش کیے گئے۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی اہم ادارہ یا انجمن ہو جس کی طرف سے سپاسنامہ پیش نہ کیا گیا ہو۔ علماء میں جو اس وقت مایوسی کا شکار تھے یا حالات سے نبرد آزما تھے یا زمانہ سے ساز باز کر کے اس خلش سے اپنے دل کو آزاد کر چکے تھے، اس تحریک نے نیا حوصلہ اور نشاط پیدا کر دیا۔

بریلی میں اس وقت ندوہ کے مخالفین کا ایک خاصا طبقہ موجود تھا، اگرچہ باد مخالف اس وقت تک تیز نہیں ہوئی تھی لیکن اس کے بعض تھپیڑے ندوہ کے لئے ناگوار ثابت ہونے لگے تھے، بایں ہمہ جب مہمانوں کے ٹھہرانے کے لئے جگہ تلاش ہوئی تو شہر کے سربرآوردہ حضرات اور روٴساء نے بے تکلف اپنے مکانات پیش کر دیئے۔ ان مخلصین ومعاونین کے پہلو بہ پہلو پنڈت ہیت رام صاحب سی، ایس آئی کا نام بھی نظر آتا ہے، جنہوں نے اس نیک کام کے لئے اپنا نام پیش کیا۔

مفتی لطف اللہ صاحبؒ نے (جو اس وقت حیدرآباد کے عدالت عالیہ کے مفتی تھے) اس بار بھی اجلاس کی صدارت کی۔

سب سے پہلے مولانا عبدالحق حقانیؒ نے ندوہ کے اغراض ومقاصد اور اس کے نصب العین پر ایک پرجوش اور موٴثر تقریر کی، مولانا عبدالوہاب بہاریؒ نے اپنا عربی قصیدہ پیش کیا، اس کے بعد مولانا سید عبدالحیؒ نے ناظم کے ضعف وعلالت کی بناء پر گزشتہ سال کی کارروائی پڑھ کر سنائی۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے بھی تقریر کی، اور خصوصیت سے ناظم ندوہ کا

شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے اپنی ذاتی مصالح کو نظر انداز کر کے اپنا وظیفہ بھی ندوہ کے نام منتقل کر دیا۔

اب مولانا شبلیؒ کی باری تھی، تاخیر بہت ہوگئی تھی، اس لئے مولانا نے معذرت چاہی لیکن شائقین کے اصرار سے کھڑے ہوئے اور مختصر اور مؤثر تقریر کی (وہ تقریر مولانا نے حسب معمول قلمبند نہیں کی، اس لئے روئداد میں اس کی تفصیل نہیں ہے)۔

مسودۂ دار العلوم کی منظوری

۳ بجے دن میں ایک جلسۂ خاص منعقد ہوا، اور اس میں مولانا کا مرتب کردہ دستور العمل (جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں تفصیل سے ہو چکا ہے) منظوری کے لئے پیش ہوا، اور سب علماء کے اتفاق رائے سے منظور ہو گیا، اس موقع پر ایک نکتہ اختلاف یہ اٹھایا گیا کہ دار العلوم کو ندوہ کے ماتحت کیوں رکھا جائے، ایک آزاد ادارہ کی حیثیت سے اس کو کیوں نہ قائم کیا جائے۔

مولاناؒ کی تقریر

مولانا اس تجویز کے سخت مخالف تھے، انہوں نے ایک مختصر تقریر کی، اور کہا:۔

''دار العلوم کے مفید اور ضروری ہونے میں کسی کو کلام نہیں، ہمارے دوست مولوی ابراہیم صاحب بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں، اگر گفتگو ہے تو اس میں کہ ندوہ کی طرف سے اس کا قائم ہونا مفید ہے یا غیر مفید۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ ندوہ اگر مفید اور ضروری کام کو خود نہ کرے تو اتنا بڑا عظیم الشان کام کس قوت سے انجام پا سکتا ہے؟ شخصی قوت سے اس کا پورا ہونا ناممکن ہے اور اگر بالفرض ہو بھی جائے تو جن مفاسد کی وجہ سے دار العلوم کی ضرورت تسلیم کی گئی ہے اس سے وہ بھی پاک وصاف نہیں ہو سکتا، اور اگر اس کے قائم کرنے کے واسطے ایک دوسری جماعت ہو تو یہ امر ضرور قابل لحاظ ہے کہ وہ ایسی ہی بارسوخ اور معتمد علیہ ہو جیسی کہ یہ مجلس ہے، ورنہ اس کے اثر سے اتنا بڑا کام انجام پانا مشکل ہوگا، لیکن اگر ایسا ہوا تو حالت موجودہ کے لحاظ سے مسلمانوں کی قوت کا منتشر کرنا کچھ بھی مفید نہ ہوگا،

اس لئے ندوۃ العلماء کی طرف سے دار العلوم کا قائم ہونا بہت قرین صواب ہے، ندوۃ العلماء اس کا اور نیز دیگر مدارس کا سرپرست رہے گا۔ آخر میں اس بات کا ظاہر کردینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ دار العلوم قائم ہونے پر بھی ندوہ کے اراکین اپنی اس حکمت عملی کو نہیں چھوڑیں گے جو اس وقت برت رہے ہیں، اور حتی الامکان اس دار العلوم میں بھی اس حکمت عملی کے موافق کارروائی کی جائے گی'' (۱)

اس کے بعد اس مسئلہ پر رائے لی گئی، اور فیصلہ مولانا کے موافق ہوا۔ (۲)

دوسری نشست میں نظام حیدرآباد کے شاعر خاص ابوالقاسم صاحب عرشیؔ نے اپنا فارسی قصیدہ پڑھا اور ندوہ کو خراج تحسین پیش کیا، اور کہا۔

زرچہ باشد سرا اگر خواہد ندوہ کن
ندوہ باشد نائب محبوب رب کردگار

آخری شعر یہ تھا:۔

یارب ایں تعمیر محکم تا ابد معمور باد
چشم بد از دامن جاہ ولالش دور باد

عرشیؔ صاحب جب اپنا طویل قصیدہ ختم کرکے بیٹھے تو اسٹیج پر کچھ دیر تک محویت طاری رہی، آخر مولانا شاہ سلیمان نے مہر سکوت توڑی اور ان کا شکریہ ادا کیا۔

مسودۂ دار العلوم مولانا عبد الحق حقانی نے پیش کیا، اور عام اجلاس نے اس کو منظور کرلیا، مولانا شبلی نے دار العلوم کی ضرورت پر تقریر کی۔

جلسۂ خاص

دستور العمل کی منظوری کے لئے جلسہ خاص منعقد ہوا۔ مولانا سید عبدالحیؒ ایک ایک دفعہ علیحدہ پڑھ کر سناتے تھے اور مباحثہ کے بعد اس میں اصلاح وترمیم ہوتی تھی، دستور العمل

۱۔ روائداد سال سوم۔ ص: ۴۶، ۴۷

۲۔ روائداد سال سوم۔ ص: ۴۷

کا بڑا حصہ اس جلسہ میں منظور ہو گیا، اور بقیہ دفعات جلسۂ انتظامیہ کے سپرد کر دی گئیں۔

اس کے بعد سپاسنامے پڑھے گئے جو ہندوستان کے مختلف اداروں، انجمنوں اور مدرسوں نے بھیجے تھے۔

تقرر واعظین

دوسری تجویز تقرر واعظین کے متعلق پیش کی گئی، اس کا مقصد یہ تھا کہ ندوہ کی طرف سے ہندوستان کے مختلف شہروں میں واعظین بھیجے جائیں، جو مسلمانوں کو دینی، اجتماعی اور معاشرتی اصلاح کی طرف متوجہ طرف متوجہ کریں، ان کو حلال وحرام سے آگاہ کریں، نیک و بد اور دوست دشمن کا فرق سمجھائیں، کسب حال اور تجارت کی اہمیت (۱) اور اس کے فوائد ومنافع سے ان کو آگاہ کریں، غرض ان میں وہ شعور پیدا کریں، جو ان کے دینی اور معاشی زندگی کے صحیح اور متوازن ارتقاء میں مدد دے سکے، رسوم وروایات اور ہم وطنوں کی پیروی واتباع کے رجحانات ختم ہوں اور اسلام کی جامع تعلیمات اور اپنی مکمل، واضح اور حقیقی شکل وصورت میں مسلمانوں کے سامنے آئیں۔

مخالفت کا طوفان

ندوہ کے خلاف جو تنقیدیں اب تک دبی زبان سے کی جاتی تھیں اس اجلاس کے بعد کھل کر کی جانے لگیں، اور مخالفت کا ایک طوفان کھڑا ہو گیا، شاید ان ناقدین نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ یہ احتیاط ان کی مقصد براری کے لئے مفید نہ ہوگی، اور یہ کارواں اسی طرح آگے بڑھتا رہے گا۔

اس مخالفت کا اصل مورچہ بریلی تھا، مولانا احمد رضا خاں (جو پہلے ہی ندوہ کے مخالف ہو چکے تھے) اجلاس بریلی میں شریک نہیں ہوئے اور باہر رہ کر انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے ندوہ کو بدنام کرنے کی پوری مہم شروع کر دی۔ حد یہ ہے کہ مولانا لطف اللہ صاحب کے متعلق

---

(۱) مولانا کو اس بات کا بہت خیال تھا کہ مسلمانوں کو تجارت کی طرف توجہ کم اور ملازمت کی طرف توجہ زیادہ ہے، وہ اس بات کو بہت مضر اور انحطاط کی علامت سمجھتے تھے۔ خود انھوں نے کسب حلال اور تجارت کی اہمیت اور فوائد پر مضامین لکھے اور دوسرں سے بھی لکھوائے۔

یہ مشہور کیا گیا کہ انہوں نے ندوہ کے خلاف فتویٰ پر دستخط کیے ہیں۔(۱) حالانکہ اجلاس بریلی کی صدارت مولانا لطف اللہ صاحبؒ ہی نے کی، اور نہ صرف صدارت کی بلکہ جلسہ کے اختتام پر صاف لفظوں میں اعلان کیا کہ جو کچھ اغراض و مقاصد بیان کیے جا چکے ہیں وہ سب درست و بجا ہیں، اور میں اس کے ساتھ بدل متفق ہوں۔(۲) اجلاس بریلی سے قبل مولانا احمد رضا خاں اور مولانا میں خط و کتابت ہوئی تھی، لیکن کوئی نتیجہ نہ نکل سکا۔ مولانا ایک خط میں جو ۱۱ر رمضان ۱۳۱۳ھ کو تحریر کیا گیا۔ مولانا احمد رضا خاں کو بڑے رنج و افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں:۔

''ذرا غور فرمایئے، ہماری سختی اور تشدد نے ہمارے فرقہ حقہ اہل سنت اور بالخصوص احناف کو کیسا سخت صدمہ پہونچایا ہے۔ ہندوستان میں تقریباً تمام اہل سنت حنفی تھے، غیر مقلد کا شاید نشان بھی ہو، ابتدا میں ایک دو شخصوں کی رائے نے غلطی کی یا جو باعث ہو، انہوں نے بعض مسائل میں اختلاف کیا، ہمارے بعض حضرات نے بنظر حمایت حق انہیں مخاطب بنایا اور انہیں روکا، اگرچہ ان کی نیت خیر تھی اور اس کا ثواب وہ پائیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ، مگر اتنی مدت کے تجربہ نے یہ معلوم کرادیا کہ یہ حمایت خلاف مصلحت ہوئی، اگر وہ بعضے کج رو مخاطب نہ بنائے جاتے، اور رد و کد کا اعلان نہ ہوتا تو وہ گوشۂ گمنامی میں پڑے رہتے، نہ انہیں اپنی حمایتیوں کے تلاش کی حاجت پڑتی نہ اپنی بات کے اعلان کا اس قدر احساس ہوتا، نہ ہمارے مقتداؤں پر یہ سب و طعن کی نوبت آتی، زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ دس بیس ان کے ہم خیال اور ہو جاتے، ہزاروں لاکھوں تک نوبت نہ پہونچتی، یہ محل تھا کہ ''من ابتلی ببلیتین فلیختر أهو نهما'' پر کیا جاتا، اب جیسے اخراج عن المساجد کا فتویٰ مشتہر ہوا جب سے ہمارے گروہ کو ذلت کا سامنا ہوا، کفار حاکموں کے روبرو ہم مجرموں کی طرح پکڑے ہوئے جاتے ہیں، ہمارے دین و ایمان کی کتابیں ان کے پیروں پر رکھی ہوتی ہیں، ہم اور ہمارے علماء کھڑے ہو کر دیکھتے ہیں اور ہمارے مخالفین کو ڈگریاں ملتی ہیں۔ افسوس صد افسوس! ہمیں اپنے پاک

---

(۱) اس استفتاء کی حقیقت یہ تھی کہ شیعہ سنی نزاع پر ایک فتویٰ مرتب کر کے علماء حیدرآباد اور مولانا لطف اللہ صاحب سے اس پر دستخط لئے گئے اور اس کے اوپر ندوۃ العلماء کا نام اس طرح لکھ دیا گیا کہ پڑھنے والا تمیز نہ کر سکے اور اس دھوکہ میں آجائے کہ مولانا ندوۃ العلماء کے خلاف ہیں (اتمام الحجہ:۳۰) (۲) اتمام الحجہ۔ ص:۳۰

مذہب کی اس ذلت پر ذرا نظر نہیں ہوتی، مولانا! خدا کے لئے غور کیجئے اور دشمنان دین کو ہم پر اور ہمارے پاک مذہب پر ہنسنے کا موقع نہ دیجئے۔‘‘(۱)

اس مراسلت کا کوئی نتیجہ نہ نکلا، بلکہ مخالفت کی آنچ تیز سے تیز ہوتی گئی، ندوۃ العلماء کے لئے ندوۃ الجہلاء کا لفظ وضع کیا گیا، ندوہ کے وزن پر طرح طرح کی مہذب گالیاں ایجاد کی گئیں، اوران پر رسالوں کے نام رکھے گئے، (۲) پنجاب، بہار اور دوسرے علاقوں کے علماء سے ندوہ کی غلط ترجمانی کر کے یا کسی فتویٰ پر ندوۃ العلماء کا لیبل لگا کر ندوہ کے خلاف فتوے حاصل کئے گئے اور ان کی خوب اشاعت کی گئی۔ ندوہ کے بعض علماء کی تکفیر بھی کی گئی، (۳) اس جنگ میں مولانا احمد رضا خاں کے علاوہ مولانا عبدالقادر بدایونی، مولان نذیر احمد خاں رامپوری سب سے پیش پیش تھے۔

بنائے اعتراض

جن چیزوں پر سب سے زیادہ اعتراض کیا گیا ہے ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مخالفین کی دماغی سطح کتنی پست تھی، اور ان کے سوچنے کا انداز کتنا عجیب وغریب تھا۔

ندوہ کے اجلاس دوم منعقدہ لکھنؤ میں مسلمانوں کے درمیان اتحاد واتفاق کے فوائد اور نزاع باہمی کے نقصانات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا محمد علیؒ نے مولانا محمد قاسم نانوتوی کے حوالہ سے یہ کہا تھا کہ:۔

’’اہل اسلام کے سب گناہ معاف ہوسکتے ہیں لیکن نا اتفاقی اور عداوت باہمی کا گناہ معاف نہ ہوگا۔‘‘

مولانا عبدالقادر بدایونی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ آیت لکھی کہ ’’یغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء‘‘ اور یہ دریافت کیا کہ مولانا نے یہ بات کیسے فرض کر لی کہ گناہ نا اتفاقی معاف نہ ہوگا۔

دوسری بات جو ندوہ کے اجلاس لکھنؤ میں کہی گئی تھی کہ مقلدین وغیر مقلدین کی اس

---

(۱) مراسلات سنت وندوہ۔ ص:۱۶ (۲) ان رسالوں میں بیشتر کے نام:۔ خثوہ، جذوہ، سطوہ، خدوہ، وغیرہ ہیں جن سے ان مصنفین کے ’’حسن ذوق‘‘ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔۱۲ (۳) اتمام الحجہ۔ از مولانا احمد حسنی رائے بریلوی۔ ص:۲۳

کشمکش کو ختم کر دینا چاہئے، حقیقت میں دونوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے، مقصد ایک ہے، اس بات پر یہ طبقہ خصوصیت سے بہت چراغ پا تھا، چنانچہ اکثر رسائل اور تحریروں میں ندوہ کے اجلاس لکھنؤ اور ان تقریروں اور تجاویز کا حوالہ بار بار ملتا ہے۔

ان حضرات کے نزدیک اس وقت تک ان دو فرقوں میں اتحاد نہیں ہوسکتا تھا جب تک وہ اپنے مخصوص خیالات اور اصولوں سے دستبردار نہ ہو جائیں، اور اپنے فقہی مذہب و مسلک کو ترک نہ کر دیں۔

مولانا احمد رضا خاں نے ایک خط میں جو اعتراضات کئے ہیں یا جو الزامات ندوہ پر لگائے ہیں، ان سے ان لوگوں کے طرز فکر اور تشدد پسندی کا اندازہ آسانی کے ساتھ ہو جائے گا۔ مولانا محمد علیؒ کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> ''اب تمام کتب ندوہ مفصلاً بالاستیعاب ملاحظہ ہوں، آپ پر خود عیاں ہو جائے گا کہ آشکارا و نہاں کس قدر مخالفات شدیدہ و اہل سنت سے کی گئیں، ترک مذہب و اختیار دہریت کی کھلی کھلی دعوتیں دی گئیں، مذہب سنت و ائمہ اہل سنت کی صریح توہین کی گئی۔'' (۱)

مخالفین کی بددیانتی

اس سلسلہ میں ایک بہت بڑی بددیانتی یہ کی گئی کہ علمائے حرمین سے ملحدین کے خلاف جن کو اس زمانہ میں نیچری کہتے تھے اور غیر مقلدین کے خلاف فتوے حاصل کئے گئے اور ان کو ہندوستان میں اس طرح شائع کیا گیا گویا وہ ندوہ اور اہل ندوہ کے خلاف ہیں۔ اس قسم کے پندرہ فتوے ''رفاه الكونين باتباع أهالي الحرمين'' کے نام سے ایک رسالہ کی صورت میں موجود ہیں۔

رسالہ بازی کی مہم

یہ مخالفت کس زور و شور سے ہو رہی تھی اس کا اندازہ صرف اس سے ہوسکتا ہے کہ پوسٹروں، اشتہارات، قصائد ہجو (۲) اور فتاوی وغیرہ کے علاوہ صرف ان رسائل اور

---

(۱) مراسلات سنت ندوہ۔ ص:۶ (۲) یہ قصائد ہجو کیسے ہوتے تھے، اس کے سمجھنے کے لئے دو شعر کافی ہیں:۔

۱۔ کیا زمانہ کو رہ راست پہ لائے ندوہ ۔۔۔ ۳۔ پیر نیچر کی یہ ہے کہ شعبدہ بازی ساری
۲۔ جو ہو خود عین ضلالت یہ بنائے ندوہ ۔۔۔ ۴۔ آگ لگ جائے لسے، بھاڑ میں جائے ندوہ

جذوہ لرجوم احزاب دار الندوہ۔ ص:۳۲

کتابوں کی تعداد جو ندوہ کے رد میں اس حلقہ کی طرف سے شائع ہوئیں، ۴۰ سے زائد تھی۔ یہ تو مولانا احمد رضا خاں کے علاوہ دوسرے حضرات کے رسائل کا ذکر تھا، خود مولانا احمد رضا خاں نے ندوہ کے خلاف جو رسائل لکھے ہیں ان کی کل تعداد دو سو تک بتائی جاتی ہے، مخالفت کی شدت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ.... نے ستر ہزار روپیہ کا وقف محض ندوہ کی مخالفت کے لئے کیا تھا۔ (۱)

اس طوفان بے تمیزی کے مقابلہ میں ندوہ نے خاموشی کو بہتر سمجھا، بعض مرتبہ اس خاموشی کو کمزوری پر محمول کر کے مخالفت کی آنچ تیز کر دی گئی، اور بعض مرتبہ اس کا خوشگوار اثر پڑا۔

رجب ۱۳۱۴ھ میں مولانا محمد حفیظ اللہ صاحب نے "ارشاد الکملاء" لکھی، اور اس میں تفسیر و حدیث، فقہ و تصوف اور سیر و تاریخ کی روشنی میں ان شبہات و اعتراضات کا جواب دیا جن کی آڑ لے کر مخالفین ندوہ اس تحریک کو ختم کر دینا چاہتے تھے، اس رسالہ نے سنجیدہ طبقہ کو ضرور متاثر کیا، لیکن ہوا و تعصب کی آگ بدستور بھڑکتی رہی۔

اس سے پہلے ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ میں مرزا حیرت دہلوی (مصنف سیرت محمدیہ وحیات طیبہ وحیات اعظم) نے "مقاصد ندوۃ العلماء اور اس کی مخالفت" کے نام سے ۱۳۱ صفحہ کا ایک رسالہ تصنیف کیا اور اس میں بہت طاقتور اور مؤثر طریقہ پر ندوہ کی پوری وکالت کی، تاریخ اور موجودہ حالات اور وقت کے تقاضوں کی روشنی میں ندوہ کی اہمیت وضرورت واضح کی اور مسلمانوں کو اس تفرقہ انگیزی پر غیرت دلائی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"دینی علوم سے بے بہرہ ہو گئے، ان کی مسجدیں، خانقاہیں ویران پڑی ہیں، چاروں طرف دھواں دھار اعتراضات آریہ و عیسائی کر رہے ہیں مگر کوئی خبر نہیں، اور خبر کہاں سے ہو، اسلام کی تردید سے انہیں فرصت ملے تو وہ دوسرے مذاہب کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہوں...... اگر مسلمان علماء کی کل تصانیف جمع کی جائیں گی تو فیصدی پانچ تو کسی اور قصوں کی نکلیں، پچانوے اسلام اور مسلمانوں کی تردید اور تکفیر میں نکلیں گی۔" (۲)

---

(۱) مخدومی مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ نے مؤخر الذکر بات مولانا مرتضیٰ حسن دیوبندی کے حوالہ سے بیان کی ہے

(۲) مقاصد ندوۃ العلماء ص: ۱۳۰

مولانا سید احمد الحسنی رائے بریلوی (۱) نے بھی ''اتمام الحجۃ'' کے نام سے مخالفین ندوہ کے جواب میں ایک رسالہ لکھا، اور بہت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ اعتراضات کا جواب دیا۔

مولاناؒ کا رویہ

مولانا کا رویہ اس سلسلہ میں یہ تھا کہ خاموشی مناسب ضرور ہے لیکن وہ کافی علاج نہیں ہے مسلمانوں میں اس سے غلط فہمیاں پھیل سکتی ہیں اور بہت سے سادہ دل اور مخلص مسلمان ان کے غلط پروپیگنڈے کا شکار ہو سکتے ہیں، اس لئے یہ ضروری ہے کہ ان کا جواب سنجیدگی، تحمل اور ہوشمندی کیساتھ برابر دیا جاتا رہے۔ ''ارشاد الکملاء'' مولانا ہی کی فرمائش اور تاکید پر لکھی گئی۔ مولانا سید عبدالحی کو انہوں نے اپنے خطوط میں بار بار اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے اور ان کو وہ ساری مناسب اور ضروری تدابیر اختیار کرنے کی ہدایت کی ہے جو اس سلسلہ میں مفید ہو سکیں۔

بہر حال مخالفت کے اس طوفان بلا خیز کے باوجود یہ نوخیز انجمن ترقی کی راہ پر گامزن رہی، علماء حق اور مشائخ وقت برابر اس کی حمایت کرتے رہے، جدید طبقہ کو اس میں فکر وبصیرت کی ایک نئی روشنی نظر آئی، بزرگان دین اور اہل دل نے اس کو امداد غیبی اور تائید ایزدی قرار دیا، غرض ہر اس طبقہ نے جس کو اخلاص اور سلامت فہم کا کچھ بھی حصہ ملا تھا اس کو اپنے درد کا درماں اور اپنے دل کی آواز سمجھا۔

جب یہ طوفان اپنے عروج پر تھا اس وقت مولانا ظہور الاسلام فتح پوری جن کا ذکر کتاب میں بار بار آیا ہے۔ حج وزیارت کی غرض سے حجاز میں تھے، انہوں نے حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ سے ایک تحریر حاصل کی، جس میں حاجی صاحبؒ نے ندوہ کے متعلق بہت بلند کلمات ارشاد فرمائے ہیں۔

ندوۃ العلماء مسلمانوں کے لئے لطیفۂ غیبی، حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی رائے

اس تحریر میں حاجی صاحبؒ لکھتے ہیں:۔

---

(۱) اس کے مصنف دراصل مولانا سید عبدالحیؒ تھے، ان کا اصل نام حضرت سید احمد شہیدؒ کے نام پر احمد تھا، اس کتاب میں مصلحتاً انہوں نے یہی نام استعمال کیا ہے۔

"مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے کہ عرصہ تین سال سے اس قسم کا جلسہ ہند میں قائم ہوا ہے جس کے تین جلسے بمقام کانپور، لکھنؤ، بریلی میں بڑی شان وشوکت سے ہوئے، علاوہ ہزارہا مسلمانوں کے صدہا علماء ومشائخ دور دور سے آکر شریک ہوئے، درحقیقت یہ تائید غیبی ہے۔ پروردگار عالم نے بفحوائے إذا أراد الله شيئا هيأ اسبابه کے مجلس ندوۃ العلماء کو اصلاح وترقی اہل اسلام کے واسطے اس آخر زمانہ میں بطور لطیفۂ غیبی ظاہر فرمادیا۔ ندوۃ العلماء کو مسلمانوں کے حق میں امداد غیبی سمجھنا چاہئے اور مسلمانوں کو خلوص کے ساتھ اس میں دامے، درمے، سخنے شرکت واعانت کرنی چاہئے"۔(۱)

مولانا منور علی جو حضرت حاجی صاحبؒ کے خلیفہ ہیں، جلسۂ بریلی میں شریک تھے، انہوں نے جلسہ کی پوری کارروائی اور اپنے تاثرات پانچ صفحے میں لکھ کر حاجی صاحبؒ کی خدمت میں بھیجے، اس کے جواب میں حاجی صاحبؒ ان کو لکھتے ہیں:۔

"جہاں تک حالات واغراض ندوہ گوش زد فقیر ہوئے ہیں وہ بیشک بہت ہی مفید ہیں، اور مسلمانوں کی صلاح وفلاح دارین کا ذریعہ ہوسکتے ہیں۔ فقیر کی ہر وقت یہی دعا ہے کہ جوامر مسلمانوں کی بہبودی کا باعث ہو اس میں اللہ تعالیٰ غیبی ترقی عطا فرمائے، اور اس کو حسدِ حاسدین اور شر مفسدین سے ہمیشہ مامون رکھے۔"(۲)

مولاناؒ کا سفر دہلی، اور انجمن "معین الندوۃ" کا قیام

اس زمانہ میں مولانا محمد علیؒ ندوہ کی شاخ کے قیام کے سلسلہ میں دہلی آئے اور حکیم غلام رضا خاں صاحب رئیس دہلی کے مہمان ہوئے۔ حکیم صاحب کی کوٹھی پر جلسہ منعقد ہوا، اور اس جلسہ میں (معین الندوۃ دہلی) کے نام سے ایک انجمن قائم ہوئی، حکیم صاحب موصوف صدر انجمن قرار دیئے گئے، اور نظامت کا بار خاں صاحب کے کاندھوں پر پڑا۔ شہر کے رؤساء انجمن میں شریک ہوئے، اور پوری دلچسپی لی۔

---

(۱) حامیان ومتبعان ندوۃ العلماء کے لئے مژدہ۔ ص:۲

(۲) ایضاً: ص ۴

مولاناؒ کا سفر غازی پور، اور ندوۃ العلماء کی شاخ کا قیام

۲۰/رجب ۱۳۱۷ھ کو مولانا محمد علیؒ ایک وفد کے ساتھ پورب کی طرف روانہ ہوئے۔ اس وفد میں مولانا سید عبدالحی مددگار ناظم، مولانا ظہور الاسلام فتحپوری، اور مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی وغیرہ شریک تھے، اس وفد کی جس طرح پذیرائی ہوئی، اور جس گرمجوشی، زندہ دلی اور محبت سے اس کا استقبال کیا گیا، خوش قسمتی سے اس کی کچھ تفصیلات تاریخ نے محفوظ کردی ہیں:۔

''روساء غازی پور نے جس تزک واحتشام سے وفد کا استقبال کیا، اور مولانا شاہ امانت اللہ غازی پوری نے جس خلوص ومحبت کا برتاؤ کیا اس کا بیان کرنا ایک قسم کی نمائش ہے۔(۱) مگر آپ اس سے اندازہ کرسکتے ہیں کہ غازی پور لب دریا آباد ہے، اور اس کا اسٹیشن دریا کے دوسری جانب ہے، اسٹیشن پر روساء کی ایک جماعت بسر کردگی مولانا ابوالبرکات صاحب فرزند اکبر مولانا ممدوح کے استقبال کے لئے موجود تھے.... دریا کے اس پار مولانا امانت اللہ صاحب خود مع ایک ہزار اہل اسلام کے استقبال کو آئے تھے۔ جب ارکان وفد کشتیوں سے اترے تو ان کو ایک شامیانے کے نیچے لے جاکر بٹھایا گیا، یہ شامیانہ نہایت وسیع اور شاندار تھا، اور شیشہ سے آراستہ کیا گیا تھا، روشنی کی کثرت سے رات کو دن معلوم ہوتا تھا، اس کے نیچے پا انداز کے لئے دری کاری کا فرش تھا، اس پر کرسیاں بچھائی گئی تھیں۔ وہاں پہونچ کر مولانا شاہ امانت اللہ صاحب نے روساء غازی پور سے تعارف کرایا، اس کے بعد فرودگاہ کو لے گئے، یہاں سے فرودگاہ تک برابر دورویہ روشنی کی بتیاں نصب تھیں اور ان میں گلاسوں کی روشنی کی گئی تھی، یہاں سے وہاں تک مسلمانوں کا ہجوم اور ان کا جوش اسلامی سے خیر مقدم عجیب پر اثر تھا، جس سے مسلمانوں کا اخلاص اور ان کی سچی محبت جو صرف باعتبار اتحاد قومی ومذہبی کے تھی، اندازہ کی جاسکتی ہے''۔(۲)

---

(۱) یہ خیال رہے کہ یہ فضا جو اس وقت وفد ندوہ کے حق میں نظر آرہی تھی کچھ عرصہ قبل سخت نزاع اور انتشار سے بھری ہوئی تھی۔ مولانا امانت اللہ صاحب اور مولانا ابراہیم کے اختلاف نے مسلمانوں کی رسوائی میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی تھی، ندوہ کے اثر سے ان دونوں میں مصالحت ہوئی، اور اس کا اثر قدرتی طور پر ہندوستان کے مختلف حصوں پر بالخصوص غازی پور اس کے اطراف پر پڑا، اس کا کچھ اندازہ آئندہ سطور سے ہوگا۔ (۲) روئداد سال چہارم: ۳۳و۳۴

دوسرے دن صبح کو جلسہ ہوا، اور عام اتفاق سے غازی پور میں ندوہ کی شاخ قائم کی گئی، اور مولانا شاہ امانت اللہ اس کے صدر منتخب ہوئے۔

ایثار کی قابل رشک مثال

اس دور میں ایک خاص بات یہ پیش آئی کہ مولوی شرف الدین صاحب وکیل غازی پور نے اپنی کوٹھی جو انہوں نے اپنی رہائش کے لئے بنوائی تھی، ندوہ کو پیش کر دی، اور جس طرح پیش کی، وہ ان کے انتہائی خلوص ومحبت اور عقیدت وتعلق کی دلیل ہے۔ مولانا محمد علیؒ اور مولانا شاہ سلیمان صاحب کو اپنی کوٹھی لے گئے، اور علیحدہ کھڑے ہو کر بہت ادب سے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا کہ:۔

"میں کسی لائق نہیں ہوں، یہ کوٹھی جو میں نے اپنے رہنے کے لئے بنوائی ہے، ندوۃ العلماء کی نذر ہے، اور میں آپ کو قبضہ کرانے کو لایا ہوں"۔ (۱)

غرض کہ کوٹھی ندوہ کے قبضہ میں آگئی، اور اللہ کے اس بندہ نے اپنے لئے کرایہ کے مکان میں رہنا بخوشی گوارا کیا۔

قدیم وجدید طبقہ کا پہلا نمائندہ اجتماع

اس کے بعد وفد پٹنہ روانہ ہوا، اس بار اس سفر میں مولانا شبلی بھی شریک تھے۔ (۲) پٹنہ میں متعدد جلسے ہوئے لیکن دو جلسے خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ایک جلسہ شاہ رشید الحق کی خانقاہ عمادیہ میں ہوا، دوسرا گورنمنٹ کالج بانکی پور میں، بانکی پور کے جلسہ میں چار ہزار مسلمان شریک تھے۔ یہ قدیم وجدید طبقہ کا پہلا نمائندہ اجتماع تھا، جہاں دونوں کو کھل کر بات کرنے اور ایک دوسرے کے زاویۂ نگاہ اور خیالات کو سمجھنے کا موقع ملا، اور وہ خلیج کم ہوئی جس نے دونوں طبقوں کو ایک مذہب کا پیرو ہونے کے باوجود فکری عقلی طور پر بہت دور اور ایک دوسرے سے بدظن اور متوحش بنا دیا تھا، اور جب دونوں کو معلوم ہوا کہ ان کے

---

(۱) روئداد سال چہارم۔ ص:۳۹ (۲) مولانا سید سلیمان ندویؒ نے حیات شبلی میں اس وفد کے ارکان کے جو نام درج کئے ہیں حیرت ہے کہ اس میں مولانا محمد علیؒ کا نام نہیں ہے۔ ندوہ کی روئداد اجلاس چہارم۔ ص:۳۴و۳۵ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو وفد غازی پور گیا تھا وہی پٹنہ بھی گیا تھا، البتہ اس میں مولانا شبلیؒ اور مولانا شاہ امانت اللہؒ کا اضافہ ہو گیا تھا۔

جذبات، مقاصد اور آرزوئیں ایک ہیں تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی، یہ چیز ان کے لئے ایک نئے انکشاف اور دریافت سے کسی طرح کم نہ تھی۔ مولانا شبلیؒ نے دار العلوم کی ضرورت پر ایک مؤثر اور برمحل تقریر کی، اس تقریر سے ان کے سامنے ایک نئی دنیا کا نقشہ آیا جس میں جدید وقدیم طبقہ کی کوئی تفریق نہ تھی، اور نہ علماء اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کے درمیان کسی قسم کی منافرت، اس منظر کی تصویر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے قلم نے خوب کھینچی ہے:۔

"جاڑے کی شب تھی، علماء پہلے سے رونق افروز تھے، جب سیاہ اور کوٹوں سے ہال میں تاریکی پیدا ہوئی تو چونکہ ہمارے محترموں کی نگاہ میں اول مرتبہ یہ سماں آیا تھا اس لئے کسی قدر منغص ہوئے مگر گفتگو نے جلد اصل حال سے پردہ اٹھا کر ظاہر کر دیا۔

کہ آب چشمۂ حیواں درون تاریکی است

تاریک کوٹوں کے اندر عقیدتمندی اور نور خلوص سے روشن دل چھپے ہوئے تھے۔ اس جلسہ میں اجلاس پٹنہ کی بنیاد پڑی۔ اس اجلاس نے خیالات قدیم وجدید کے دو دریاں اس طرح باہم ملتے دیکھے جس طرح گنگا اور سون کے سنگم پر یہ مشہور اور تاریخی شہر واقع ہے۔"(۱)

نواب سرفراز حسین خاں نے مولانا محمد علیؒ سے درخواست کی کہ اس سال جلسہ پٹنہ میں کیا جائے، لیکن چونکہ میرٹھ میں جلسہ کا انتظام پہلے ہی ہو چکا تھا، اس لئے اس کو آئندہ سال کے لئے ملتوی رکھا گیا۔

اس کے بعد رؤساء بہار کی تحریک پر مولانا ایک وفد لے کر بہار گئے، اس میں مولانا شبلی شریک نہ تھے، خان بہادر مولوی سید نصیر الدین صاحب اور خان بہادر مولوی سید امیر الدین صاحب کے یہاں وفد نے قیام کیا اور وہیں جلسہ منعقد ہوا، اس موقع پر شاہ سلیمان پھلواروی نے بہت مؤثر تقریر کی، اور مجمع پر اس کا بہت خوشگوار اثر پڑا۔

اسی سال ملک کے مزید حصوں میں ندوہ کی شاخیں یا ماتحت انجمنیں قائم ہوئیں، کرنال، لاہور، ریواڑی، پٹنہ، بانکی پوران سب جگہوں پر "معین الندوہ" کے نام سے انجمنیں قائم ہو گئیں۔

---

(۱) حیات شبلی۔ ص: ۳۱۴

ممالک غیر میں اشاعت کے لئے طلبہ کو وظائف

ان ابتدائی حالات میں جب کہ ندوہ کو مختلف مسائل اور مشکلات درپیش تھیں اور مخالفت کے طوفانوں سے گزرنا تھا ارباب ندوہ کے عزم اور حوصلہ میں کمزوری نظر آتی تھی، ۱۲؍شوال ۱۳۱۳ھ کے جلسۂ انتظامیہ میں یہ تجویز پیش ہوئی کہ ممالک غیر میں اشاعت اسلام کے لئے منتخب انگریزی خواں طلبہ کو مناسب وظائف دے کر عربی پڑھائی جائے اور اسلام کے اصول ومسائل سکھائے جائیں، اس کے بعد ان کو ندوہ دوسرے ملکوں میں اشاعت اسلام اور تبلیغ کے لئے روانہ کرے۔ لیکن رائے یہ ہوئی کہ اس بات کو طے کرنے سے پہلے جلسۂ عام کی منظوری لی جائے۔

مولانا شبلیؒ نے تحریک کی کہ ایک فارغ التحصیل طالب علم تکمیل کے لئے مصر بھیجا جائے۔ یہ تجویز بھی جلسۂ عام کے لئے ملتوی ہوگئی۔

اجلاس میرٹھ

۱۵؍شوال ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۹؍مارچ ۱۸۹۷ء میں ندوہ کا چوتھا سالانہ اجلاس میرٹھ میں ہوا مولانا لطف اللہ صاحبؒ نے صدارت کے فرائض انجام دیئے۔ مولانا محمد علیؒ کی علالت اور ضعف کی وجہ سے مولانا سید عبدالحی نے رپورٹ پڑھ کر سنائی، اس کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے رپورٹ پر تقریر کی۔

جلسۂ علماء

دوسری نشست علماء کے لئے مخصوص تھی، ہندوستان کے مستند اور مشہور علماء کی ایک معتد بہ تعداد اس میں شریک ہوئی۔ مولانا محمد علیؒ نے نصاب تعلیم کے مسئلہ پر گفتگو کی۔ اور یہ طے پایا کہ اس وقت تک جتنے نصاب اور جتنی رائیں آچکی ہیں، سب شائع کر دیجائیں۔ مولانا سید عبدالحی نے تجاویز پیش کی، پہلی تجویز یہ تھی کہ دار العلوم دہلی میں قائم کیا جائے، اور اگر وہاں نہ ہو تو لاہور میں۔ مولانا محمد علیؒ اور مولانا عبدالحی اس تجویز کے حق

میں تھے، لیکن مولانا شاہ سلیمان صاحبؒ نے اس سے اختلاف کیا، اور کہا کہ:۔ دہلی ہمیشہ سے فتنہ وفساد کا گھر ہے، ایسی جگہ دار العلوم کا قائم کرنا مناسب نہیں ہے۔ لیکن اس وقت کثرت آراء سے یہی فیصلہ ہوا، کہ دار العلوم دہلی میں قائم ہو۔

دوسری تجویز یہ تھی کہ اجلاس عام میں علماء کے لئے بلاضرورت کرسیوں کا انتظام نہ کیا جائے، فرش پر نشست ہو سکتی ہے اور یہی مناسب ہے۔

طرز نشست کے سلسلے میں مولاناؒ کی اہم رائے

مولانا نے اس طرز نشست کے اہتمام کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

"اب تک اجلاس عام میں علی العموم سب کے لئے داعیان ندوہ کرسیوں کا اہتمام کرتے تھے، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جلسہ عام سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ ہم کو ان حضرات کو فائدہ پہونچانے کا موقع بھی حاصل ہو جو مسجدوں میں جا کر ہمارا وعظ نہیں سنتے، اور وہ بالکل کرسیوں پر بیٹھنے کی عادی ہو گئے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی روزمرہ کی نشست وبرخاست اسی پر ہوتی ہے، اگر انکے لئے یہ اہتمام نہ ہو تو کلفت کی وجہ سے وہ جلسہ کی شرکت اور استفادہ سے بالکل محروم رہیں گے۔ اور چونکہ اس غرض سے ان کے لئے کرسیوں کی نشست تجویز ہوئی، تو یہ بالکل نامناسب سمجھا گیا کہ وہ کرسیوں پر بیٹھیں اور علماء ان سے نیچے فرش پر، اس لئے یہ اہتمام جائز رکھا گیا۔ اگر یہ مقصود نہ ہوتا تو صرف علماء کے لئے ان تکلفات کی بالکل حاجت نہ تھی۔" (۱)

تیسری تجویز یہ منظور ہوئی کہ جو اہل سنت والجماعت کا مخالف ہو وہ ندوہ کا رکن نہیں بن سکتا، اس کے جلسوں میں شرکت کر سکتا ہے، اس لئے شرکت پر پابندی لگانا نامناسب اور ندوہ کے مقصد کے خلاف ہے۔

گزشتہ جلسۂ انتظامیہ میں یہ تجویز پیش ہوئی تھی کہ انگریزی داں طلبہ کو عربی پڑھائی جائے تاکہ وہ ممالک غیر میں اشاعت اسلام کا فرض انجام دینے کے قابل ہو سکیں، جلسہ عام نے اس تجویز کو بھی منظور کیا۔

---

(۱) روئداد سال چہارم۔ ص:۵۲

اس کے بعد ندوہ کے مقاصد پر مولانا شبلی نے ایک ولولہ انگیز اور پراثر تقریر کی، جو ڈیڑھ گھنٹہ تک جاری رہی، ہر شخص محو حیرت اور مسرور تھا۔

مولانا عبدالجبار جبلپوری نے عربی کا ایک قصیدہ پڑھا، اور ندوہ کو یوں خراج عقیدت پیش کیا۔ ؎

اھلا وسھلا ندوۃ العلماء　　قد کنت آیۃ رحمۃ الرحمن

امتد ظللك فی الضواحی کلھا　　حتی تشیب مفارق الغربان

اس اجلاس میں ایک موقع پر مولانا شروانی نے اپنی مشہور کتاب ''علماء سلف'' کے جستہ جستہ مقامات پڑھ کر سنائے۔

عرشی نے اس بار بھی ایک پرزور قصیدہ پیش کیا، ان کی دلچسپی اور ہر جلسہ میں پابندی کے ساتھ شرکت نے کچھ ایسی شکل اختیار کر لی تھی کہ ان کو بجا طور پر ''شاعر ندوہ'' کہا جا سکتا ہے۔

اس اجلاس کی روئداد میں مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کا نام نامی ''سرپرست'' کی حیثیت سے نظر آتا ہے، اس کے بعد صدر انجمن و ارکان وعہدہ داران کے نام ہیں۔

قحط کے اثرات، اور ندوہ کی مشکلات

۱۸۹۵ء کا قحط جس نے ہزاروں گھر ویران اور بے چراغ کر دیئے تھے ختم بھی نہ ہوا تھا کہ طاعون نے سر اٹھایا، اور بمبئی سے آگے نکل کر اضلاع پنجاب پر حملے شروع کر دیئے۔ گورنمنٹ نے جگہ جگہ قرنطینے قائم کر دیئے تھے، جس کی وجہ سے سفر کی دشواریاں بڑھ گئی تھیں، اور لوگ سفر سے گھبرانے لگے تھے، انڈین نیشنل کانگریس بھی اس دشواری کا شکار تھی، اس کے اجلاس میں باوجود انتہائی کوشش اور اہتمام کے جو ڈیلی گیٹ آئے، ان کی تعداد بہت کم تھی۔ ان سب حالات کے پیش نظر اس بات کا خطرہ تھا کہ بڑے پیمانہ پر ندوہ کا اجلاس شاید کامیاب نہ ہو سکے، چنانچہ غور و خوض کے بعد یہ طے پایا کہ صرف ارکان کا جلسہ بلایا جائے۔

کانپور کا جلسۂ خاص

۱۴، ۱۵/ شوال ۱۳۱۵ھ کو ارکان ندوۃ العلماء کا یہ جلسہ دفتر ندوۃ العلماء میں (جو ایک وسیع اور عالیشان عمارت میں واقع تھا) دو دن تک ہوتا رہا، توقع کے خلاف اکثر ارکان بہت اہتمام کے ساتھ شریک جلسہ ہوئے۔

مولانا محمد علیؒ نے تحریک کی، کہ مولانا مسیح الزماں خاں استاد نظام حیدرآباد و رئیس شاہ جہان پور اس جلسہ کی صدارت کریں، خاں بہادر منشی اطہر علی صاحب کی تائید سے مولانا کرسی صدارت پر جلوہ افروز ہوئے، مولانا سید عبدالحی نے مولانا کی طرف سے رپورٹ پیش کی جس کا بیشتر حصہ ناقدین اور معترضین کے جواب پر مشتمل تھا، مولانا نے اس میں بہت تفصیل سے ثابت کیا کہ رفع نزاع باہمی، اتحاد و اخوت، جدید طبقہ کی عربی کی طرف توجہ، اور علماء میں بیداری اور احساس کے جو مناظر اس وقت نظر آرہے ہیں وہ اس ندوۃ العلماء کے نتائج ہیں جو ان مقاصد کے علمبردار ہے، اور ساری مخالفتوں کے باوجود اس کے لئے سینہ سپر ہے۔

دارالافتاء کی کارکردگی

دارالافتاء کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے کہا کہ اس سال ۵۶۵ استفتاء کے جواب دیئے گئے جن میں ۴۷ فتوے نہایت مشکل اور پیچیدہ تھے، ان کے علاوہ ۲۳ مسئلوں کی بطور خود تحقیقات کی گئی۔

یتیم خانہ کانپور

یتیم خانہ کانپور جو ندوۃ العلماء کی نگرانی میں چل رہا ہے، اس میں اس وقت ۴۳ بچے ہیں جن میں ۲۵ لڑکے اور ۱۸ لڑکیاں ہیں، انکی تعلیم تربیت کے لئے اتالیق اور مدرس مقرر ہیں، اور صنعت وحرفت سکھانے کا بھی انتظام کیا گیا ہے، بعض بچوں کو چمڑے کا کام بھی سکھایا جاتا ہے اور بعض کو پریس کا۔

ایک ہزار باضابطہ ارکان

ارکان کی تعداد میں بھی اس سال بہت اضافہ ہوا چنانچہ اس سال ارکان کی تعداد ۱۰۱۵ تک پہونچ گئی۔

دارالعلوم کے لئے لکھنؤ کی تجویز

مولاناؒ کی رپورٹ کے بعد مولانا حبیب الرحماں خاں شروانیؒ نے تجویز پیش کی کہ دارالعلوم لکھنؤ میں قائم کیا جائے، مولانا محمد غلام ہوشیار پوری نے اس سے اختلاف کیا، لیکن مولانا عبدالحی (چندوسی) نے جو پہلے اس کے حامی تھے دوسری رائے پیش کی، مولانا نے کہا اس وقت ایک تجویز میں ردوبدل کرنا آسان ہے، پھر بعد کو اس غیر ضروری پابندی کے نتائج بد کو گوارا کرنا مشکل ہے، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مولانا سید محمد علیؒ صاحب ناظم ندوۃ العلماء جن سے زیادہ کسی کو اس کے ساتھ دلسوزی نہیں ہے جہاں رہ کر اس کام کو کرسکیں وہیں یہ دارالعلوم قائم کیا جائے، کیونکہ یہ کوئی فرضی اور خیالی تجویز نہیں ہے کہ یو ہوگیا یوں ہی سہی، نہ شاعرانہ مضمون ہے جس کا موزوں ہو جانا کافی سمجھا جائے، اس کے بعد ایک تجویز یہ پیش کی گئی کہ اس بات کو ایک ماہ کے لئے ملتوی رکھا جائے۔

مولانا محمد علیؒ کی رائے

مولانا محمد علیؒ جو پہلے دہلی کی حمایت میں تھے، اب اپنی رائے میں کچھ نرم پڑ چکے تھے، انھوں نے دہلی کے لئے کوئی زور نہیں دیا، بلکہ یہ کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ دارالعلوم کے لئے اسی وقت کوئی مقام طے کیا جائے خواہ دہلی ہو یا لکھنؤ پھر بلا انتظار اس کی عملی کارروائی شروع کردی جائے۔

بالآخر کثرت نے یہ فیصلہ کردیا کہ سعادت لکھنؤ کے حصہ میں آئے، اور یہ مرکزیت اور مرجعیت لکھنؤ کو حاصل ہو، مولانا مسیح الزماں خاں صاحب صدر انجمن نے کہا کہ خدا کو اسی میں کچھ بہتری منظور ہے، اب ارکان ندوۃ العلماء کو نہایت محنت اور کوشش کے ساتھ اس کام کو شروع کردینا چاہیے۔

ابتدائی درجات کی منظوری

مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے تجویز پیش کی کہ ابتدائی درجات کھولنے میں تاخیر نہ کی جائے، مولانا عبدالحیؒ نے پرزور طریقے پر اس کی تائید کی، اور کہا کہ اس وقت جو تحریک پیش ہوئی ہے وہ بہت قابل لحاظ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس تحریک سے اگر قطع نظر کر لی جائے تو دارالعلوم کے عملی کام شروع کرنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

اتفاق اراء سے یہ تجویز بھی منظور ہوئی۔

مولاناؒ کی تجویز

مولانا نے یہ تجویز کی کہ ندوۃ العلماء کی طرف سے ایک وفد رؤساء لکھنؤ کے پاس بھیجا جائے اور دارالعلوم کیلیے مناسب زمین حاصل کرنے کی کوشش کر دی جائے۔

عملی اسپرٹ اور کام کی تیز رفتاری

اسی جلسہ میں مولانا نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ دارالعلوم کے ابتدائی یکسالہ مصارف کا اسی وقت انتظام ہونا چاہیے، منشی اطہر علی صاحب رئیس کاکوری نے اس کی تائید کی، اور یہ تجویز بھی فوراً منظور ہوگئی، مولانا شبلیؒ نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ علماء پر یہ الزام ہے کہ وہ اپنے روپیہ سے کوئی کام نہیں کرتے، اس لئے میری تجویز ہے کہ ان مصارف کے متکفل ارکان انتظامیہ ہوں، چنانچہ اسی وقت چندہ ہوا، اور خاصی رقم فراہم ہوگئی، اور اعلان کر دیا گیا کہ اور لوگ جو اس کار خیر میں حصہ لینا چاہیں ان کے لئے بھی یہ دروازہ کھلا ہے۔

مولانا سید عبدالحی نے یہ تجویز رکھی کہ گورنمنٹ اسکول کانپور کے طلبہ کو دینیات کی تعلیم دلانے کا ندوۃ العلماء کی جانب سے انتظام کیا جائے، انہوں نے کہا کہ گورنمنٹ نے یہ درخواست منظور کر لی ہے، اور کانپور کے انگریزی خواں طلبہ کی ایک درخواست بھی آئی ہے، جس میں انہوں نے اس بات کی خواہش ظاہر کی ہے، اس لئے مناسب ہے کہ ندوۃ العلماء اپنے اہتمام سے کانپور میں اس تجویز کو عمل میں لائے، تاکہ دوسرے اضلاع

کے مسلمانوں کے لئے نظیر ہو، اور اس پر عملدرآمد شروع ہوجائے۔

مولانا شبلی نے اس تجویز کی پرزور حمایت کرتے ہوئے کہا کہ:۔ میرا قیام اگر کانپور میں ہوتا تو میں نہایت خوشی سے اس کو قبول کرلیتا۔ انہوں نے مولوی عبداللطیف صاحبؒ مفتی ندوۃ العلماء سے درخواست کی کہ وہ یہ خدمت انجام دیں۔ مفتی صاحب نے بہت مسرت کے ساتھ اس کو منظور کیا۔

۱۵ر شوال کو تیسری نشست ہوئی، سب سے پہلے مولانا شبلیؒ نے شاہ امانت اللہ فصیحی غازی پوری کی وفات پر بہت مناسب الفاظ میں تعزیتی تقریر کی، اور ان کی تقریر کے بعد تعزیتی تجویز منظور ہوئی، اور مولانا مرحوم کے لئے دعاء مغفرت کی گئی اس کے بعد مولانا سید عبدالحی نے یتیم خانہ اسلامیہ کی مختصر رپورٹ پیش کی۔

انگریزی خواں طلبہ اور دارالعلوم

مولانا محمد علیؒ نے تجویز پیش کی کہ انگریزی خواں طلبہ کو اسلامی مدارس میں دینیات اور عربی کی تعلیم دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا، لیکن اس کا انتظام نہیں ہوسکا، اس لئے مناسب ہے کہ دارالعلوم میں اس کا بھی انتظام کیا جائے، یہ تجویز بالاتفاق منظور ہوئی۔ آخر میں مولانا سید عبدالحی نے بجٹ پیش کیا۔ جلسہ کے اختتام پر علماء وحاضرین نے مسلمانوں کی اصلاح وترقی اور ندوۃ العلماء کی کامیابی کے لئے نہایت خلوص سے دعا مانگی۔

انگریزی زبان کے سلسلہ میں مولانا کا اعلان حق

مولاناؒ کو اس بات کی بڑی فکر تھی کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو دینی علوم اور عربی زبان کی طرف توجہ ہو، اور ان کے دل میں ان علوم کی وقعت اور احترام پیدا ہو، لیکن اسی کے ساتھ بلکہ اس سے کہیں زیادہ مولانا کو اس کی فکر تھی کہ ہمارے طلبہ اور علماء جن کے ہاتھ میں امت کی زمام قیادت ہے، انگریزی زبان اور جدید علوم سے بہرہ مند ہوں، اور اس کو اسلام کی ترجمانی کا ذریعہ بنائیں، اور نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے مغرب زدہ طبقہ پر اثر انداز ہوں بلکہ یورپ میں جاکر اسلام کا پیغام پھیلائیں، اور اس کو جدید مادی تہذیب کے

نقصانات سے آگاہ کریں۔ منشی سعید الدین صاحب انسپکٹر کانپور کے نام ایک طویل اور مفصل خط میں (جو ان کے خط کے جواب میں لکھا گیا تھا) مولاناؒ نے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے، اور پوری قوت کے ساتھ انگریزی زبان کی تعلیم اور جدید علوم کے حصول پر زور دیا ہے، لیکن اس کے حدود اور فوائد ونقصانات کی رعایت کرتے ہوئے۔

جدید نظام تعلیم پر مولاناؒ کی تنقید

اس خط میں مولانا نے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نظام تعلیم پر نکتہ چینی بھی کی ہے، اور جدید علوم مثلاً جغرافیہ اور تاریخ کی جو ضرورت سے زائد مقدار طلبہ کے دل ودماغ میں اتارنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس پر صحیح گرفت کی ہے، چنانچہ ایک جگہ بہت صراحت کے ساتھ مولانا نے لکھا ہے کہ:۔

> ''تاریخ اور جغرافیہ کا جاننا بہت ضرور ہے، مگر جس قدر انگریزی مدارس میں پڑھایا جاتا ہے اس سے کوئی معتد بہ نفع نہیں ہے''۔

مولانا کی یہ رائے بڑی بصیرت اور عالمانہ تجزیہ پر مبنی ہے، اور ان کے فکری توازن اور گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم کا بڑا حصہ جو آج کل کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھا جاتا ہے خواہ اس کا تعلق جغرافیہ وتاریخ سے ہو یا ریاضی سے یا ادبیات سے، اکثر ضائع ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ غیر ضروری تفصیلات میں پڑ کر طالب علم کا ذہن ایسا الجھتا ہے کہ ضروری اور مفید باتیں بھی اس کے ذہن میں محفوظ نہیں رہتیں، اور اس کے وقت اور دماغ کا بڑا حصہ ان غیر عملی، بعید الوقوع اور امکانی مسائل اور جزئیات کی نذر ہو جاتا ہے۔(۱)

انہوں نے اس زمانہ میں جب علماء انگریزی کی مخالفت کر رہے تھے، اور انگریزی تو بہت آگے کی چیز ہے خود اپنی مقرر کردہ درسیات میں معمولی تغیر واضافہ اور ردوبدل کے

---

(۱) احادیث میں ''علم غیر نافع'' سے پناہ مانگی گئی ہے۔ یہ علم ''غیر نافع'' شاید یہی لاطائل مباحث ہیں جن کی ضرورت زندگی میں بہت کم پیش آتی ہے، یا کبھی پیش نہیں آتی، لیکن ہماری زندگی کا اہم ترین حصہ جس میں فکری نشوونما ہوتا ہے، اس میں بڑی بے دردی کے ساتھ ضائع کیا جاتا ہے۔

روادار نہ تھے، بہت صاف اور واشگاف طریقے پر علماء کو انگریزی پر عبور حاصل کرنے کی دعوت دی، اور جغرافیہ و تاریخ اور دوسرے ضروری علوم کی اہمیت بتائی۔ یہ اعلان اس زمانہ میں ایسا آسان نہ تھا جیسا ہم اس وقت سمجھتے ہیں۔ جو لوگ اس زمانہ سے واقف ہیں وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ مولانا کی حق پرستی اور اخلاقی جرأت کا ایک بڑا ثبوت ہے۔

پھر دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اگر یہ آواز کسی ایسے شخص کی طرف سے بلند ہوتی جو تصوف سے ناآشنا اور اہل تصوف سے بیگانہ ہوتا تو کچھ زیادہ تعجب کی بات نہ تھی، لیکن مولانا نے اس کو مرتبۂ ارشاد و اصلاح اور روحانی کمال کے منافی نہ سمجھا، بلکہ

نوارا تلخ ترمی زن چو ذوق نغمہ کم یابی

پر عمل کرتے ہوئے اس تلخ نوائی کا فرض پوری طرح انجام دیا، جس کی ہر دور جمود وانحطاط میں ہمیشہ ضرورت رہی ہے۔

نامناسب نہ ہوگا، اگر اس مکتوب کے جستہ جستہ ٹکڑے اس موقع پر پیش کر دیئے جائیں، ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

> ''اس زمانہ میں حالت بدل گئی ہے، وہ اعتراضات جو پہلے فلسفہ میں کیئے گئے اب انہیں کوئی نہیں پوچھتا، اور نہ وہ فرقے اعتراضات کرنے والے باقی رہے اب ان کے اعتراضات اور جوابات سیکھنے کی ضرورت نہ رہی، اب نیا عالم، نیا دانہ، نیا پانی ہے، جدید فلسفہ کی بناء پر اس زمانہ کے مخالفین اسلام نے نئے نئے قسم کے اعتراضات کیئے ہیں جو پہلے نہ تھے، جن کا کافی طور سے جواب دینا قدیم فلسفہ کے جاننے سے نہیں ہوسکتا، اگر چہ کوئی کیسا ہی دعوی کرے، وجہ اس کی یہ ہے کہ معترض کا جواب شافی اس وقت ہوسکتا ہے جب اس کے منتہائے اعتراض کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ کس بناء پر اس نے اعتراض کیا ہے۔''

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

> ''یہ امر قدیم فلسفہ سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ کوئی عالم کیسی ہی تقریر کرے، مگر جب تک وہ اس بات کو نہ اکھیڑے گا جو ان کے دل میں جمی ہے، ہرگز ان کا

جواب شافی نہ دے گا اور وہ علوم انگریزی میں ہیں، اس لئے انہیں انگریزی کا جاننا ضرور ہے۔''

یورپ میں اسلام کی تبلیغ کے لئے انگریزی کی ضرورت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''الغرض اس زمانہ میں دینی و دنیاوی ضرورتیں ایسی درپیش ہیں کہ انگریزی زبان کا سیکھنا ضرور ہے، اگر چند ہمارے علماء اس قدر انگریزی سے واقف ہوں کہ یورپ میں جا کر اسلام کے فضائل ان کی زبان میں بیان کریں تو بہت کچھ اسلام کی اشاعت ہو۔ اسی طرح اگر انگریزی میں رسائل لکھ کر مشتہر کرائے جائیں تو بھی بہت نفع ہو۔ غرض اس وقت دنیا میں بہت بڑا فرقہ جو اپنی سلطنت کے اعتبار سے اکثر روئے زمین پر حاوی ہے۔ اس کی زبان انگریزی ہے۔ لہٰذا تبلیغ اسلام کے لئے ضروری ہے کہ انگریزی زبان سیکھی جائے، کیونکہ اب ان کو غلبہ ہے اور مسلمان مغلوب ہیں، اور غالب مغلوب کی زبان سیکھنے پر مجبور نہیں ہوسکتا، لہٰذا اگر مغلوب کو اس سے ضرورت پیش آئے تو بالضرور اسے غالب کی زبان سیکھنی ہوگی۔ یہ تو دینی ضرورت تھی، اور دنیاوی ضرورتیں تو ہر کہ ومہ پر ظاہر ہیں، پھر کیسے ہوسکتا ہے کہ سب تارک الدنیا ہو جائیں، کسی قسم کا برتاؤ اہل دنیا سے نہ رکھیں۔''

زبان کچھ نہیں، اللہ ورسول ﷺ کی محبت اصل ہے

یہ خیال کہ انگریزی پڑھنے والے اکثر موت کے وقت ڈیم فول (۱) کہتے کہتے مرجاتے ہیں، نافہمی کا خیال ہے جس کسی کو اللہ ورسول ﷺ... کی محبت سے واسطہ نہیں وہ خواہ انگریزی پڑھنے والا ہو یا فارسی، عربی پڑھنے والا سب برابر ہیں، اگر عربی پڑھنے والے جو شب روز کلی و جزئی کی بحث میں رہتے ہیں، یا ہیولیٰ اور صورت ان کے دماغ میں بسا ہے تو لامحالہ دم اخیر تک یہی ان کی زبان پر جاری رہے گا پھر اس وقت زبان پر ڈیم فول جاری ہو یا کلی جزئی دونوں برابر ہیں۔

اب ذرا غور کیجئے کہ انگریزی بھی ایک زبان ہے جس طرح فارسی وترکی وغیرہ، جس طرح فارسی وترکی اولاً کفار کی زبان تھی جب اس زبان والے اسلام لائے تو مسلمانوں

۱۔ DAMNED FOOL

میں وہ زبان شائع ہوئی، اسی طرح اگر خدا کا فضل ہو جس کے ہونے کی امید کی جاتی ہے اور انگریزی زبان والے اسلام لائیں تو ان کا حال بھی فارسی ترکی زبان کا سا ہو جائے گا، اور جس طرح آپ فارسی میں کتب دینیہ دیکھتے ہیں ان شاء اللہ انگریزی زبان بھی دیکھیں گے۔ باقی رہا سرکاری اسکول کی تعلیم پر جو آپ کا اعتراض ہے، وہ اکثر صحیح ہے۔

اب دانشمندی کا مقتضا یہ ہے کہ جب ضرورت نے اس کے سیکھنے پر مجبور کیا ہے تو چاہیئے کہ اس خارجی مضرت کے دفع میں کوشش کی جائے، نہ یہ کہ ان ضرورتوں پر خاک ڈالیں جو غیر ممکن ہے۔ سیاسی امور میں مہارت پیدا کرنے اور ملکی مصلحتوں سے واقف ہونے کے لئے تاریخ اور جغرافیہ کا جاننا بہت ضرور ہے، مگر جس قدر انگریزی مدارس میں پڑھا جاتا ہے اس سے کوئی معتد بہ نفع نہیں ہے۔ حاصل یہ کہ اس وقت مضرتوں کی اصلاح کر کے عربی و انگریزی دونوں حاصل کرنا چاہیئے تا کہ اپنے بھائیوں کو فائدہ پہونچا سکے، اور اپنے دین کو بھی محفوظ رکھ سکے۔

عربی و انگریزی کی تحصیل کا طریقہ

اس بناء پر ایسا کالج ہونا چاہیئے جس میں عربی و انگریزی دونوں ہوں، اب جو انگریزی سے تعلق پیدا کرنا چاہے وہ ضروری علم عربی تحصیل کر کے انگریزی حاصل کرے اور جو دین کی غرض سے پڑھے یا تجارت وصنعت سے اپنی گزر اوقات کرنا چاہے وہ انگریزی کا صرف انشا حاصل کرے (جدید زبان میں ART SIDE سے تعلیم حاصل کرے) اور عربی میں جہاں تک ہو کمال پیدا کرے۔(۱)

عربی مدارس میں تحصیل کے بعد کالج و یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کو مولانا صحیح نہیں سمجھتے تھے، بلکہ یہ چاہتے تھے کہ ایسے مدارس اور کالج قائم کئے جائیں جہاں ہم اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق تعلیمی نظام قائم کر سکیں، اس کی وجہ مولانا نے دو بیان کی ہیں:۔

(۱) ایک ماحول کی خرابی

(۲) دوسرے وہ زہریلے افکار و نظریات اور ملحدانہ خیالات جو اس تعلیم کے ذریعہ

۱۔ مکتوبات۔ جلد دوم: ۲۳ و ۲۷

نوجوانوں کے دل ودماغ میں سرایت کر جاتے ہیں۔

اس کا حل مولانا کے نزدیک یہی تھا کہ یہ مضر اور غیر مفید اجزاء اس نظام تعلیم سے خارج کردیئے جائیں، اور صرف صالح اور نافع اجزاء باقی رکھے جائیں، لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہوسکے گا جب یہ تعلیمی نظام ہمارے مکمل اختیار میں ہو، اور ہم اس کو اپنے مصالح اور فوائد کو سامنے رکھ کر مرتب کریں۔

جہاں تک دوسری صورت کا تعلق ہے یعنی عربی کے ساتھ ادب کی حد تک انگریزی کی اتنی تعلیم کہ طالب علم اس کے ذریعہ دین کی کوئی خدمت انجام دینے کے قابل ہوسکے، نیز اس کی مدد سے معاش کی کوئی سبیل پیدا کرسکے۔ یہ صورت غالباً مولانا کے ذہن میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لئے زیادہ مناسب اور ایک حد تک قابل عمل تھی، جو قیام دار العلوم کے ایک عرصہ کے بعد محدود پیمانہ پر ظاہر ہوئی۔

دارالعلوم کے لئے زمین کی تلاش

۱۴؍شوال ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۰؍مارچ ۱۸۹۸ء کو مولانا محمد علیؒ ایک وفد لے کر کانپور سے لکھنؤ روانہ ہوئے، اس وفد میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولانا ظہور الاسلام فتحپوری، مولانا خلیل الرحمٰن سہارنپوری، مولانا مسیح الزمان خاں صاحب رئیس شاہجہاں پور بھی شامل تھے، استقبال کے لئے منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوروی (۱) پہلے سے موجود تھے۔ وفد نے ان کو دارالعلوم کی تجویز اور مقصد سفر سے آگاہ کیا۔ منشی احتشام علی صاحب نے بہت کشادہ دلی کے ساتھ کہا کہ شہر سے متصل میری مقبوضہ زمین دو ہیں۔ ایک بروره حسن باڑی (۲) جو شہر کے مغربی جانب واقع ہے، دوسری زمین جو آفاق باغ کے ملحق ہے، ان کے دیکھنے کے بعد جو پسند آئے اس کو میں حسبۃً للہ دارالعلوم کے لئے نذر کرتا ہوں۔

نماز عصر کے بعد وفد زمین دیکھنے کے لئے روانہ ہوا، نظر انتخاب اس قطعہ پر پڑی جو بروره حسن باڑی میں واقع ہے۔

(۱و۲) بروره حسن باڑی لکھنؤ کاکوری کی پختہ سڑک پر ایک موضع ہے۔ آفاق باغ محلہ ٹکیٹ گنج لکھنؤ میں ہے اس کے ساتھ ٹکیٹ رائے کا تالاب بھی تھا۔

لکھنؤ میں دفتر ندوۃ کی منتقلی

اس موقع پر بھی منشی احتشام علی صاحب (۱) نے پوری عالی ہمتی کا مظاہر کیا، اور جب تک دار العلوم کی اپنی عمارت تیار نہیں ہو جاتی اس وقت تک کے لئے انہوں نے گولہ گنج میں (خاتون منزل کے نام سے) نو ہزار روپیہ کی مالیت کا ایک مکان خرید کر ندوۃ العلماء کے حوالہ کیا، اور ۱۵ / ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ مطابق ۴ / ستمبر ۱۸۹۸ء کو ندوہ کا دفتر کانپور سے لکھنؤ منتقل ہو گیا۔

ایک ضعیفہ کا گراں قدر عطیہ

لکھنؤ کی ایک ضعیف اور سن رسیدہ علیل مسلمان خاتون نے دار العلوم قائم ہونے کی شہرت سنی تو انھوں نے اپنی کل جائداد کیلئے ایک وصیت نامہ لکھا کہ ۵، ۶ ہزار روپے ان کے متوسلین اور متعلقین کو دینے کے بعد کل جائداد اس جسکی مالیت ۱۵، ۲۰ ہزار روپیہ سے کم نہ تھی، دار العلوم یا دیگر کار خیر کے لئے وقف کر دی جائے۔ انتقال کے وقت انھوں نے مولانا محمد نعیم فرنگی محلیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی، اور دعائے توبہ کرائی۔ (۲)

درجہ ابتدائی کا آغاز اور جلسۂ افتتاح۔

۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۱۶ھ مطابق ۲۶ / ستمبر ۱۸۹۸ء کو درجہ ابتدائی کھول دیا گیا، (۳) اور یہ

---

(۱) منشی احتشام صاحب اودھ کے ایک مردم خیز قصبہ کاکوری سے تعلق رکھتے تھے اور بہت صاحب اوصاف شخص تھے، ان کے والد منشی امتیاز علی صاحب وزیر ریاست بھوپال پاکیزگی اخلاق اور وضعداری میں بھی بہت ممتاز تھے، اور حضرت مولانا فضل رحمٰنؒ سے بیعت تھے۔ منشی احتشام علی صاحب کو بھی مولاناؒ ہی سے بیعت کا شرف حاصل تھا۔ منشی احتشام علی صاحب نماز روزہ کے علاوہ اوراد و وظائف کے بھی بہت پابند تھے، اور خفیہ طور پر غرباء و مساکین، و اہل حاجت کی امداد ان کا خاص ذوق تھا، اور دور آخر میں شرافت و وضعداری کا نمونہ اور اودھ کی پرانی تہذیب و شائستگی کی یادگار تھے۔ (استفادہ از مکاتیب شروانی) ندوہ کے ابتدائی زمانہ میں انہوں نے جس فراخ دلی اور فیاضی کے ساتھ اس کی مدد کی، اور اس کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اور متعدد نازک اور سخت ترین مرحلوں میں بھی اس سے وابستہ رہے، وہ ندوہ سے ان کی سچی محبت کا ایک روشن ثبوت ہے۔ آخر تک ندوہ کے مجلس انتظامی کے رکن رکین اور معتمد مال رہے۔ ۱۳۶۲ھ میں وفات پائی۔ آپ کے دو صاحبزادے منشی انعام علی صاحب اور منشی احترام علی صاحب اپنے والد کی یادگار ہیں۔ منشی احترام علی صاحب ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے رکن اور ندوہ کے معتمد مال ہیں۔ (۲) اجلاس ششم: ۵۲۔ (۳) مولانا سید عبد الحیؒ نے "نزہۃ الخواطر" (جلد ۷) میں لکھا ہے کہ درجات کا آغاز ۱۳۱۷ھ میں ہوا، لیکن روئداد میں ۱۳۱۶ھ ہے۔

قرار پایا کہ اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں اس تقریب کے لئے جلسۂ افتتاح منعقد کیا جائے، بالآخر اسی نئے مکان میں یہ شاندار جلسہ شروع ہوا۔ اس جلسہ میں ممتاز اہل علم اور سربرآوردہ طبقہ کی بہت بڑی تعداد شریک ہوئی، مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ، مولانا عین القضاۃؒ، مولانا محمد نعیم فرنگی محلیؒ، مولانا فتح محمد تائب لکھنوی، حکیم عبدالعزیز، حکیم عبدالولی، محمد نسیم صاحب وکیل ہائی کورٹ، خان بہادر ڈاکٹر عبدالرحیم، شیخ اصغر علی تاجر عطر لکھنؤ کے علاوہ شہر کے اور بہت سے ممتاز حضرات اس تاریخی جلسہ میں شریک تھے، مسٹر ہارڈی کمشنر، اور مسٹر گری بھی موجود تھے، یہ پہلا موقع تھا کہ انگریز حکام ندوہ کے کسی اجلاس میں شریک ہئے ہوں۔

عجیب بات ہے کہ مولانا محمد علیؒ اپنی علالت (۱) کی بناپر اور مولانا عبدالحیؒ بھی کسی وجہ سے (جس کا علم ہمیں نہیں ہوسکا) اس اہم جلسہ میں شریک نہ ہوسکے۔ چنانچہ مولانا کی تحریر کردہ رپورٹ منشی اطہر علی نے پیش کی۔

اس رپورٹ میں مولانا نے قیام دارالعلوم کے چار مقاصد بیان کیے ہیں، جو مولانا کے الفاظ میں درج کئے جاتے ہیں:۔

(۱) علوم فنون کی تکمیل

(۲) علوم دینیہ خصوصاً علم کلام میں جسکی اس وقت نہایت ضرورت ہے، اعلیٰ درجہ کا کمال پیدا کرنا، تاکہ دہریت اور الحاد کا پوری قوت سے مقابلہ کیا جاسکے، علم فقہ میں تبحر پیدا کرنا، تاکہ عبادات ومعاملات میں ان کے فتاوے مستند اور واجب العمل ہوں۔

(۳) مسلمانوں میں اسلامی اخلاق اور شائستگی پیدا کرنا، اور ان کو عمدہ اطوار اور عادتوں کا خوگر بنانا۔

(۴) طالب علموں میں عالی نظری وفراخ حوصلگی پیدا کرنا، جو بغیر اس قسم کے دارالعلوم کے جس میں یہ تمام باتیں شان وشوکت کے ساتھ ہوں اور طلبہ کو پست حوصلگی اور بے توقیری کے ساتھ بسراوقات کرنے سے مستغنی کردیا جائے، حاصل نہیں ہوسکتیں۔

اس کے بعد مولانا مسیح الزماں خاں اور مولانا حفیظ اللہ صاحب نے جو اس دارالعلوم

(۱) ہوسکتا ہے کہ مولانا کی علالت اور ناسازی کے ساتھ اس غیر حاضری کا سبب ''صاحب بہادروں'' کی حاضری بھی ہو۔

کے پہلے مہتمم قرار دیے گئے تھے، ان طلبہ کو یکے بعد دیگرے نام بنام پیش کیا جو اس وقت تک مدرسہ میں داخل ہو چکے تھے، یہ سب طلبہ ایک لباس میں تھے، اور بہت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ سلام کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔

مولانا عبدالعلی آسی مدراسی نے فارسی، عربی، اور اردو میں چار تاریخی قطعہ تہنیت پیش کیے، اسکے بعد مولانا شاہ سلیمان شاہ پھلواری نے تقریر کی، ان کی تقریر کے دوران بغیر کسی تحریک کے لوگوں نے خود بخود چندہ دینا شروع کیا، اور جو لوگ اس وقت نہ دے سکے انھوں نے اپنا نام لکھوا دیا اور اسی کارروائی میں سارا وقت گزر گیا، دوسرے دن پھر جلسہ ہوا اور مولانا نے اپنی تقریر مکمل کی۔

سب سے آخر میں ایک کمسن بچے نے بغیر کسی تحریک کے اپنے شوق سے ایک مناجات پڑھی، اور اسی پر جلسہ برخاست ہو گیا۔

مدرسین

اس وقت سر دست جن لوگوں پر تدریس کا بار ڈالا گیا، وہ خود مولانا حفیظ اللہ (مدرس اعلیٰ) مفتی عبدالطیف صاحب، (۱) مولانا عبدالشکور کاکورویؒ، اور مولانا سید عبدالحیؒ تھے، تعلیم شروع ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد مولانا حفیظ اللہ صاحبؒ بغیر کسی باضابطہ اطلاع اور درخواست کے باہر چلے گئے، اور تعلیم کا نقصان ہوتا رہا، خاصے سلسلہ جنبانی اور انتظار کے بعد جب ان کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا تو بالآخر مولانا محمد فاروق چڑیاکوٹی کو ان کی جگہ مدرس مقرر کیا گیا تا کہ تعلیم میں زیادہ حرج نہ ہو۔

---

(۱) مفتی عبداللطیف صاحب موضع افضل گڑھ ضلع بجنور کے رہنے والے تھے، معقول و منقول میں مولانا احمد حسن کانپوری، اور مولانا لطف اللہ علی گڑھی سے تلمذ حاصل تھا، ندوۃ العلماء کے قیام کے بعد ندوہ کے مفتی مقرر ہوئے، اور عرصہ تک یہ خدمت انجام دی، جب مولانا محمد علی مونگیریؒ نے مونگیر میں مستقل اقامت اختیار کی تو یہ بھی ان کے ساتھ آگئے اور بیعت سے مشرف ہوئے۔ ۱۳۲۴ھ میں مولانا کے ساتھ حج کو تشریف لے گئے، اور مہتمم مدرسہ صولتیہ کے اصرار اور التجا اور مولانا کے حکم سے دو سال تک وہاں درس دیا۔ واپسی کے بعد خانقاہ رحمانیہ میں تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہے۔ ۱۹۱۷ء میں جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں صدر شعبۂ دینیات مقرر ہوئے۔ تعلیم و تفہیم کا بہت اچھا سلیقہ تھا، فقہ و حدیث پر اچھی نظر تھی اور دونوں میں صاحب تصنیف تھے۔ وہاں سے سبکدوش ہونے کے بعد کچھ عرصہ تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے صدر شعبۂ دینیات رہے، اور علی گڑھ ہی میں سکونت اختیار کی اور وہیں وفات پائی۔

طلبہ کیلئے نظام الاوقات

طلبہ کیلئے جو نظا الاوقات عملی طور پر نافذ تھا، اس میں ڈسپلن، پابندی وقت، اصول پسندی، شائستگی اور صفائی اور تہذیب واخلاق کا پورا خیال رکھا گیا رتھا، نماز، مطالعہ، ورزش جسمانی، کھانا، استراحت، اور تفریح، غرض ہر چیز کیلئے اوقات مقرر تھے، اور اس کا لحاظ رکھا گیا تھا کہ ہر کام اجتماعی طریقے پر ہو، کمرے کی صفائی اور آداب نشست وبرخاست کا بہت اہتمام کیا جاتا تھا، اور اس کیلئے مربی اور اتالیق مقرر تھے، کوشش کی جارہی تھی کہ دو عملی زبان معلم Demonstrator) حاصل کئے جائیں، تاکہ طلبہ کو اہل زبان کی طرح عربی وفارسی بولنے کا ملکہ پیدا ہو۔

معترضین کی روش

گزشتہ سال مختلف اسباب کی بناپر جسکا ذکر گزر چکا ہے، سالانہ جلسہ محدود پیانہ پرکیا گیا تھا ،اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف ندوہ کے مقاصد کی اچھی طرح اشاعت نہ ہوسکی، (۱) دوسری طرف اسکو وہ مالی فائدہ حاصل نہ ہوسکا جو عام جلسوں کی وجہ سے ہونا تھا، اور تیسری طرف معترضین اور ناقدین کو فضا کے اس سکوت اور خوابیدگی سے غلط فائدہ اٹھانے کا موقع ہاتھ آگیا بعض لوگوں نے یہاں تک کہنا شروع کردیا کہ "ندوہ ٹوٹ گیا ہے"۔

یہ اعتراض بھی کیا گیا کہ ندوہ کے دینی جلسوں اور عام کانفرنسوں میں کوئی فرق نہیں، اور اس کے سامنے سوائے شہرت اور ناموری کے اور کوئی مقصد نہیں، ان سب اسباب کی بناپر یہ طے کیا گیا کہ سالانہ جلسہ اسی پیانہ پر کیا جاتا رہے۔

مزید شاخوں کا قیام

مخالفت کی اس نئی کوشش کے باوجود جس کے پیچھے قدیم مخالفت وہ دشمنی کا بہت بڑا اندوختہ اور سرمایہ تھا، انجمن ندوۃ العلماء کے اس گوہر شب چراغ سے دوسرا چراغ برابر روشن ہوتے رہے۔

---

(۱) ندوہ کے سالانہ جلسے، ندوہ کے تخیل کی اشاعت اور مقبولیت کا بہت بڑا ذریعہ تھے، اور ندوہ کی زیادہ تر کامیابی ان ہی جلسوں کی رہین منت ہے، اور آج بھی اس کی ضرورت وافادیت اس طرح قائم اور مسلم ہے، بلکہ شاید پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔

یک چراغیست دریں بزم کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

اور مخالفت کے اس آغاز کے ساتھ ہی ندوہ نے تخیل کی حسین اور زرنگار وادی سے عمل کی خارزار میدان میں قدم رکھا اور دار العلوم کی ابتدائی درجات کا آغاز ہوا جس کا ذکر ابھی گزرا ہے۔

اس کے علاوہ اس سال اس کو عملی میدانوں میں متعدد کامیابیاں نصیب ہوئیں، اور کئی شہروں میں شاخیں قائم ہوگئیں، ایک شاخ پانی پت میں قائم ہوئی، اس کے صدر خواجہ الطاف حسین حالی منتخب ہوئے، دوسری شاخ اسلام پور پٹنہ میں قائم ہوئی، اور وہاں کے اکثر علماء و مشائخ ورؤسا نے اس کی ممبری قبول کی، اس کے علاوہ شاہجہاں پور، جالندھر، گجرانوالہ اور بعض دوسرے شہروں میں بھی ندوہ کی شاخیں قائم ہوگئیں۔

مولانا شبلیؒ سے اختلاف

مولانا اور ذمہ داران ندوہ کے اختلافات کے آغاز کی صحیح تاریخ تو نہیں بتائی جاسکتی، لیکن اس افسوس ناک حقیقت کا عملی مظاہرہ اس وقت ہوا جب ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۱۶ھ کے جلسۂ انتظامیہ میں جس میں کئی ضروری اور اہم مسائل طے ہوئے، مولانا شریک نہ ہوسکے۔ اس کے بعد جمادی الثانیہ ۱۳۱۷ھ تک انتظامیہ کے متعدد اہم ترین جلسے ہوئے، اور کسی ایک جلسہ میں مولانا کی شرکت نہ ہوسکی، یہاں تک کہ دار العلوم کے درجات کا قیام اور اس کا افتتاحی جلسہ بھی مولانا کے بغیر منعقد ہوا اور جلسہ شاہجہانپور میں بھی (جس کا ذکر آگے آئے گا) ان کی شرکت نہ ہوسکی، یہاں تک کہ جن تاریخوں میں (۱۰ / مارچ ۱۸۹۸ء مولانا محمد علیؒ ایک وفد کے ساتھ دار العلوم کیلئے زمین کی تلاش میں لکھنؤ روانہ ہو رہے تھے اسی زمانہ میں مولانا شبلی بھوپال کی ''نظارۃ المعارف'' (جو نواب صاحب نے بھوپال نے عربی مدارس کی تنظیم جدید اور دستور العمل کی ترتیب کی غرض سے قائم کی تھی) کی مجلس شوریٰ میں میں شرکت کے بعد دستور العمل مرتب کر رہے تھے۔ ۲۷ / فروری اور ۲ / مارچ کو مولانا اس کام میں مشغول رہے، اور ۲ / اپریل کو ایک مفصل یادداشت تیار کی، اس میں نصاب کا خاکہ اور تقسیم اوقات کا نقشہ

،مدرسین کی حاضری ورخصت کے قواعد،طلبہ کے امتحان اور وظیفوں کے قواعد درج تھے۔
حقیقت میں یہ ایک بڑی بدقسمتی تھی ،اور اس اختلاف نے اس امتزاج واتحاد کے ان اہم اور رس نتائج کو(جو مولانا محمد علی کے ذہن ونظر کی وسعت ،مجتہدانہ بصیرت ومنصب ارشاد وتربیت ،اور مولانا شبلی کی مرتبۂ علمی ،عالی دماغی وقوت فکریہ کے دو بازوؤں پر قائم ہورہا تھا) بہت نقصان پہنچایا،جن کی توقع اتنے طویل عرصے کے بعد ایک مؤرخ یا تذکرہ نویس کرسکتا ہے۔

مولانا شبلیؒ کی علمی مصروفیات اور علالت

یہ زمانہ مولانا کے سخت ذہنی انتشار اور قلبی اذیت کا تھا،سید محمود کی بدمزاجی اور مسٹر بک کی طرز سیاست سے پریشان ہوکر (جس کا سلسلہ عرصہ سے چل رہا تھا) آخر کار مئی ۱۸۹۸ء میں مولانا نے علی گڑھ سے چھ مہینہ کی رخصت لی ،پھر استعفیٰ بھیج دیا۔ جون ۱۸۹۸ء میں اعظم گڑھ واپس ہوئے ،اور ''الفاروق'' کے ناتمام کی حصہ کی تکمیل شروع کی۔
ستمبر ۱۸۹۸ء میں وہ اعظم گڈھ سے الہٰ آباد گئے ،اور اسی ماہ علیل ہوکر لکھنؤ آگئے ، اور گولہ گنج میں ندوہ ہی کے دفتر میں ٹھرے ،اور یہاں کے مشہور طبیب حکیم عبدالعزیز صاحب بانی مدرسہ تکمیل الطب لکھنؤ کے زیر علاج رہے ،۱۹ر ستمبر تک وہ لکھنؤ ہی میں مقیم تھے۔(۱) اسکے بعد ان کی نقل وحرکت اور سرگرمیوں کا پتہ نہیں چلتا،ہاں اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اعظم گڈھ واپس آگئے ،کچھ نہ کچھ علاج ہوتا رہا مگر طبیعت راہ پر نہ آتی تھی۔(۲)
۲۶ر ستمبر ندوہ کا درجہ ابتدائی کھولا گیا،اور اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں غالباً تیسری یا چوتھی تاریخ کو اس کا تاریخی جلسہ افتتاح ہوا،لیکن ان تمام کارروائیوں میں مولانا شبلی کا نام کہیں نہیں ملتا،بہر حال ان کی علمی مصروفیات کے ساتھ علالت کا سلسلہ بھی چلتا رہا،کبھی طبیعت بہتر ہوتی ،کبھی بیماری زور کرتی اور کبھی کامل انبساط اور صحت معلوم ہوتی ،مجلس انتظامیہ کے آگے آنے والی ایک تجویز سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سلسلہ علالت تقریباً فروری ۱۸۹۹ء تک چلتا رہا۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی اس طویل غیر حاضری میں ان کی ذہنی انتشار ،علالت

---

(۱) حیات شبلی بحوالہ مہدی افادی ۳۳۴ (۲) حیات شبلی:۳۳۶

اور علمی مصروفیات کو بڑا دخل تھا، لیکن صرف اس بات کو اس کا سبب قرار نہیں دیا جا سکتا، در حقیقت ان اختلافات کی جڑیں بہت گہری تھیں اور ان کا ایک خاص پس منظر تھا، جس پر اس باب کے آخر میں کسی قدر تفصیل اور صراحت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

سالانہ جلسہ میں شرکت کی دعوت

فروری ۱۸۹۹ء میں انتظامیہ کی طرف سے یہ تجویز منظور ہوئی کہ مولانا کو جلسہ سالانہ کی شرکت کا دعوت نامہ بھیجا جائے، یہ تجویز رجسٹر کارروائی انتظامیہ محفوظہ دفتر نظامت ندوۃ العلماء میں مندرج ہے، اور اسکے الفاظ یہ ہیں:۔

> ”چونکہ مولوی شبلی صاحب بوجہ علالت کے جلسہ میں شریک نہیں ہوئے، اس لئے ان کی خدمت میں جلسہ انتظامیہ کی طرف سے خط بھیجا جائے، اور انکی علالت پر اظہار افسوس کے ساتھ لکھا جائے کہ آپ جلسہ سالانہ میں شریک ہوں، اور دارالعلوم کے متعلق بیان کرنے کے لئے تیار رہیں، اور اگر طبیعت ابھی درست نہیں ہوئی ہو تو علاج اور تبدیل آب و ہوا کی غرض سے لکھنؤ آئیں، نیز انکی (ارکان کی) رائے ہے کہ آپ کے نام کا اعلان بزمرۂ معتمدین شائع کر دیا جائے“۔

اس خط کا مولانا شبلی نے کیا جواب دیا اس کا ہمیں کوئی علم نہیں، البتہ مولانا کی علالت اور انکی علمی مصروفیات ان دونوں کا سلسلہ برابر چلتا رہا، اور اس پر ایک عرصہ گزر گیا۔

سبب اختلاف

مولانا کو ارباب ندوہ سے جو بنیادی اختلاف تھا، اس میں اور وجوہ کے ساتھ نصاب تعلیم اور انگریزی کا مسئلہ خاص طور پر شامل تھا، مولانا چاہتے تھے کہ قدیم نصاب میں جن تبدیلیوں کہ ضرورت ہے وہ سب کی سب قبول کر لی جائیں، قدیم تعلیمی ڈھانچہ یک قلم منسوخ کر دیا جائے اور انگریزی کی باقاعدہ تعلیم کا پورا انتظام کیا جائے، لیکن مولانا محمد علیؒ اس عجلت کو نہ مفید سمجھتے تھے نہ ممکن، وہ تدریجی طور پر، اور نرم روی کے ساتھ تبدیلیوں کے حامی تھے۔ ان کے ساتھ اور دوسرے مدرسین اور عہدہ داران بھی اس عجلت اور انتہا پسندی کے حق میں نہ تھے۔

اس اجمال کی تفسیر ہم اس طرح کر سکتے ہیں کہ مولانا منطق، فلسفہ اور فن مناظرہ کی تعلیم قطعاً ختم کر دینا چاہتے تھے، لیکن مولانا محمد علیؒ اور ان کے دوسرے رفقاء کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ چونکہ ایک طویل عرصہ سے اس فنون کا اثر علماء کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے، اس لئے اس کو حرف غلط کی طرح مٹا دینے سے بہت سی دشواریاں اور مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں، موجودہ صورت حال میں یہ زیادہ مناسب ہے کہ ان فنون کی بھی کچھ کتابیں بالخصوص ان کے مفید اور منتخب اجزا باقی رکھے جائیں۔

مولانا محمد علیؒ نے اپنے نصاب میں رشیدیہ (جو فن مناظرہ پر مشہور کتاب ہے (۱) رکھی تھی، لیکن مولانا شبلی اس کے مخالف تھے، اور انھوں نے اپنے نصاب میں جو انھوں نے نظارۃ المعارف کے لئے مرتب کیا تھا، اس کتاب پر سخت گرفت کی ہے۔

پالیسی کا یہ اختلاف انداز فکر اور ذہن و مزاج کے اختلاف سے مل کر رفتہ رفتہ شدت اختیار کرتا گیا، اور یہ خلیج آہستہ آہستہ وسیع ہوتی گئی۔

اجلاس شاہجہانپور

چھٹا اجلاس شاہجہانپور میں ہوا، اس اجلاس کی روئداد میں مولانا ندوۃ العلماء کی ضرورت اور اس کے منصب و کردار پر تاریخی حیثیت سے روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔ اس تحریر میں مولانا کے اسلوب بیان اور طرز فکر کا رنگ بہت نکھر کر سامنے آ گیا ہے:

"سلسلۂ ارشاد و ہدایت کو دیکھو! ابنائے زمانہ پر اثر ڈالنے کے لئے، اور میلان طبیعت کے لحاظ سے سامان جدا جدا نظر آتے ہیں۔ کسی زمانہ میں جادو کا زور ہے اور

---

(۱) اس کتاب کو داخل نصاب رکھنے کا اس سے زیادہ اہم سبب یہ تھا کہ عیسائیت اور دوسرے فتنوں کے مقابلہ کے لئے بعض اوقات مناظرہ کی بھی ضرورت پیش آتی تھی، اس لئے اس سے کچھ نہ کچھ مناسبت ہر مسلمان عالم اور طالب علم کے لئے ضروری تھی، "پیغام محمدیؐ" میں مولانا نے اس بات کی طرف بہت وضاحت کے ساتھ اشارہ کیا ہے۔ صفحہ ۳۱۸ پر لکھتے ہیں:۔ "تعجب اور افسوس ان بزرگ علماء پر ہے جو اس نازک وقت میں اس ضرورت شدید کی طرف توجہ نہیں فرماتے اور اس فن کو اور اس فن کے شغل کو حقارت کی نظر سے دیکھتے اور لغو و بیکار سمجھتے ہیں"۔ اس مقصد کے لئے وہ طرز بھی بے حد مفید اور ضروری ہے جو مولانا شبلی نے "الجزیۃ فی الاسلام" وغیرہ میں اختیار کیا ہے، لیکن محض اس پر اکتفاء کرنا درست نہ تھا، کم از کم اس زمانہ میں اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا جس زمانہ میں ندوہ قائم ہوا ہے۔

عصاوید بیضا سے ان کوگرویدہ کیا جاتا ہے، کبھی طبابت کوترقی ہے تو "ابرئی الاکمہ والابرص واحی الموتٰی" کے آیات بیانات سے گردنیں جھکائی جاتی ہیں۔ ہمارے حضرت (روحی فداہ) کے عہد سعادت مہد میں فصاحت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا، اور تمام عرب اس کے نشہ میں بدمست ہو رہا تھا، اس واسطے آپکو ایسا معجزہ عطا ہوا جس نے سب کا ناطقہ بند کردیا، ارشاد ہوا۔ "لو اجتمعت الانس والجن علی ان ایاتو ا بمثل ھذالقران لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا"۔ ختم نبوت کے بعض مجتہدین اور مجددین کے ذریعہ ہدایت کا سلسلہ جاری ہوا، اور ہر زمانہ میں موافق عادت مستمرہ اہل زمانہ کے ہدایت مختلف طریقوں سے کی گئی۔ جب فلسفۂ یونان کا زور ہوا تو مجتہدین نے اس کے مقابلہ میں اسلام کا فلسفہ قائم کردیا اور اس میں ایسی ایسی موشگافیاں کیں کہ اہل زمانہ دنگ رہ گئے، اور ان کو یہ جلد معلوم ہوگیا کہ فلسفۂ اسلام کے سامنے فلسفۂ یونان محض بے حقیقت ہے۔ پس جبکہ اس زمانہ میں فلسفۂ جدید نے عام طور پر دلوں میں اپنا سکہ جمالیا ہے اور دہریت والحاد کا زور بڑھتا جارہا ہے اور وہ تمام کوششیں بیکار ہو چکی ہیں جو اس کے روکنے میں صرف کی گئیں جیسا کہ عہد قدیم میں فلسفۂ یونان کے روکنے کی تدبیریں رائیگاں ہو چکی ہیں، اور اس روک ٹوک کا نتیجہ یہ پیدا ہوا کہ ضرورت زمانہ نے علماء اور عامہ مسلمین کے ارتباط باہمی کو توڑ دیا ہے اور ان دونوں گروہوں میں ایسی نفرت و وحشت کی حد فاصل قائم ہوگئی ہے جس سے مغائرت اور بے گانگی روز بروز بڑھتی جارہی ہے، علماء انکو منہ لگانے کے قابل نہیں سمجھتے اور عامہ مسلمین ان کے علم و فضل کو تسلیم نہیں کرتے، دور سے بیٹھے ردوقدح ہوتی ہے، اور غلط بیانیوں کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے ایک کی نظر میں دوسرا بے اعتبار ہو گیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ علماء کے وعظ و بیان سے نئی روشنی والے مستفید ہوتے ہیں نہ ان کے خیالات سے علماء واقف ہوتے ہیں جس سے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک و مقدس شریعت جنگ وجدل اور نفرت و وحشت کا تختۂ مشق بن رہی ہے"۔(۱)

یہ جلاس ۱۳/۱۴/۱۵/ ذیقعدہ ۱۳۱۶ھ کو منعقد ہوا، اور اس کی صدارت مولانا احمد حسن

---

(۱) روئداد اجلاس ششم: ۲۳

کانپوریؒ خلیفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ نے کی ،مولانا احمد حسنؒ نے ایک مختصر اور مناسب تقریر کی ،اور اس کے بعد آداب جلسہ پڑھ کر سنائے گئے ،جس میں سے چند یہ تھے:۔

(۱) زمرۂ علماء میں جو حضرات بیٹھیں گے ان کو اس بات کی پابندی کرنا ہوگی کہ ان کی وضع علماء کے شان کے خلاف نہ ہو۔

(۲) جلسہ میں کسی امیر و رئیس کی تعظیم کے واسطے علماء نہیں اٹھیں گے، جلسہ میں اشتہار تقسیم کرنے کی کسی کو اجازت نہیں ،بجز ان اشتہاروں کے جو ندوۃ العلماء کی جانب سے تقسیم کئے جائیں۔

اسکے بعد مولانا سید عبد الحیؒ نے سالانہ روئداد پیش کی ۔مولانا شروانی اور مولانا شاہ سلیمان پھلواری کی تقریروں کے بعد پہلی نشست ختم ہوئی۔

۵۔ بجے شام کو جلسہ عام ہوا، ہجوم کا یہ عالم تھا کہ میدان کی وسعت کے باوجود تین طرف کی سڑکیں دور دور تک لوگوں سے بھر گئیں تھیں ۔اس جلسہ میں مختلف لوگوں نے تقریریں کیں، ۸ بجے سے ۱۰ بجے رات تک علماء کا ایک مخصوص جلسہ باہمی تعارف کیلئے ہوا۔

دوسرا اجلاس ۱۴ ارذیقعدہ کو ہوا، مولانا سید عبد الحیؒ نے دار العلوم کی پہلی رپورٹ پیش کی ،اس اور اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی ۔عربی مدارس کے طلبہ کا ذکر کرتے ہوئے دار العلوم کا مقصد بیان کرتے ہیں:۔

> ''ہم نہیں چاہتے کہ وہ متنبّی یا حریری پڑھ جائیں مگر دو سطریں عربی کی نہ لکھ سکیں ،یا لکھنا آجائے مگر پانچ منٹ عربی میں گفتگو نہ کرسکیں ،یا منطق میں علامہ ہوجائیں مگر حساب وہندسہ سے ناآشنا رہیں، یا بایں ہمہ علم وفضل قرآن مجید کو تجوید وقرأت سے نہ پڑھ سکیں ،ہم چاہتے ہیں کہ بہت زیادہ قرآن مجید اور حدیث کے ساتھ اعتنا کیا جائے ،اس کے بعد درجہ ابتدائی میں عربیت پر زور دیا جائے کیونکہ یہ درجہ مدارج مافوق کا زینہ ہے ،اگر بنیاد ناقص ہوگی تو مکان ہمیشہ متزلزل رہے گا، اسکے بعد طبیعت میں جدت پیدا کرنے کیلئے ہم منطق پڑھائیں ،اور ضرورت کے لحاظ سے حساب وہندسہ کی تعلیم دیں''۔

مولانا نے آخر میں ایک بڑے اور وسیع کتب خانہ کے قیام پر بھی بہت زور دیا اور اسی پر

اپنی رپورٹ ختم کی۔اس کے بعد مولانا شروانی نے اپنا لکھا ہوا مقالہ پیش کیا پھر خان بہادر منشی اطہر علی صاحب نے ایک مؤثر تقریر کرنے کے بعد سرمایہ کی اپیل کی،اور ایک ضعیفہ کا ذکر کیا جنہوں نے دارالعلوم کا ذکر سن کر ۱۵، ۲۰ ہزار روپیہ کی جائداد ندوہ کے لئے وقف کردی۔

چندہ کے لئے اژدھام

اس تقریر اور اس مثال کا حاضرین جلسہ پر اتنا اثر پڑا کہ جب مولانا شاہ سلیمان تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو چندہ دینے والوں کے ہجوم اور وفود جذبات سے مولانا کی تقریر ممکن نہ ہوسکی، کئی بار کوشش کی لیکن درمیان میں روک دینی پڑی۔مولانا شروانی اور مولانا عبدالحی چندہ دہندگان کا نام و پتہ لکھ رہے تھے،مولانا مسیح الزماں خاں نام لکھوا رہے تھے اور مولانا خلیل الرحماں سہارنپوری روپیہ وصول کرتے تھے،پھر بھی ہجوم اس قدر تھا کہ کارروائی بار بار رکنی پڑی جس کے پاس جو کچھ تھا، نذر کر رہا تھا،روپیہ پیسہ، کپڑے، گھڑیاں رومال،دوشالے،گاؤں زمین،غرض جس سے جو ہوسکتا تھا،وہ پیش کر رہا تھا۔

عجیب نظارہ

مولانا عبدالواحد خان صاحب نقشبندی رئیس شاہ جہاں پور اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے نصف موضع خمرہ پور جو انکے ملک میں تھا، ندوہ کو دینے کا اعلان کیا،حافظ محمد اسمٰعیل صاحب وکیل نے اس عطیہ کا اعلان کرتے وقت کہا کہ امید ہے کہ اس بقیہ نصف بھی جلد ہی ندوہ کو مل جائے گا۔چند منٹ بھی نہ گزرے ہونگے کہ مولانا مسیح الزماں خاں صاحب کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ اس موضع کا نصف آخر جو ان کی ملک تصرف میں ہے،دارالعلوم کے لئے حاضر ہے۔اس وقت مجمع پر عجیب تاثر تھا،ہر طرف یہی آوازیں آرہی تھیں،ایک دوسرے رئیس احمد حسن خاں صاحب نے مصری پور کی معافی جو ۵۰۰ روپیہ کی مالیت کی تھی،ندوہ کو دیدی۔محمود خاں صاحب نے ایک کھیت وقف کیا،اس کے بعد نقد رقم کی شکل میں بکثرت عطیات وصول ہونے شروع ہوئے۔

مسٹر محمد سلیمان بیرسٹرایٹ لا نے جو انجمن الندوہ بانکی پور کی طرف سے اس انجمن

ا۔

میں نمائندہ تھے، اس موقع پر درد واثر میں ڈوبی ہوئی ایک مختصر تقریر کی اور کہا کہ مجھے پہلے ندوہ کے مقاصد اور فوائد سے زیادہ واقفیت اور دلچسپی نہ تھی، لیکن دو دن سے جو نظارہ میں دیکھ رہا ہوں، اس سے میرے دل کی عجیب کیفیت ہو رہی ہے، میں اپنی زندگی کو ندوہ کی مقاصد کیلئے وقف کرتا ہوں جو کام میرے لائق ہو، مجھ سے لیا جائے۔

وقت کی تنگی کیوجہ سے اگرچہ چندہ کا سلسلہ ختم کرنے کا اعلان کر دیا گیا، لیکن پھر بھی دینے والے ٹوٹے پڑتے تھے۔

جلسۂ عام

۵ بجے شام کو پھر جلسۂ عام ہوا، اور اس روز بھی پورا میدان آدمیوں سے بھرا گیا، چاروں سڑکوں پر آدمیوں کی کثرت کی وجہ سے ٹریفک بند کر دینا پڑا، سڑکوں پر یہ حال تھا کہ ایک طرف سے دوسری طرف جانا ناممکن معلوم ہوتا تھا، مولانا محمد علیؒ اس مجمع کے بارے میں اپنا تاثر اس طرح ظاہر کرتے ہیں:۔

> ”اس قدر مسلمانوں کو ایک مجمع میں دیکھ کر جس قدر مسرت اور خوشی ہوتی تھی، اس کا اندازہ اس سے پوچھنا چاہیئے جس نے اسے دیکھا ہے“(۱)

جلسۂ خاص

۸ بجے سے ۱۱ بجے رات تک جلسۂ خاص ہوا جس میں مختلف مسائل پر گفتگو ہوئی، اس میں علماء کے علاوہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے جنرل سکریٹری اور بعض دوسرے معزز اور نامور حضرات بھی شریک تھے۔

۱۵/ذیقعدہ ۲۸/مارچ کو تیسری نشست ہوئی، اور تقریروں کے بعد یہ تجویز سامنے آئی کہ شاہ جہاں پور گورنمنٹ کالج میں دینیات کی تعلیم کا بندوبست کیا جائے اور غور وخوض کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ معین الندوہ شاہ جہاں پور اس کام کو اپنے ذمہ لے، یہ تجویز منظور ہوئی۔

---

(۱) اجلاس ششم:۵۶

مدرسہ کی پیشکش

اس سے قبل جلسہ میں چندہ دینے والوں نے سیم وزر اور نقد واملاک پیش کرنے پر اکتفا کی تھی، لیکن اس جلسہ میں ایک خاص بات یہ ہوئی کہ ایک ''مدرسہ'' بھی ندوہ کو بطور عطیہ پیش کیا گیا۔

ایک باہمت شخص احمد زماں خاں مہتمم مدرسہ اسلامیہ بلرام پور نے اعلان کیا کہ وہ اپنا مدرسہ ندوہ کی تحویل وانتظام میں دیدینا چاہتے ہیں (اس مدرسہ میں سو سے زائد طلبہ زیر تعلیم تھے، اور دینیات کے علاوہ انجمن حمایت اسلام کا نصاب اس میں جاری تھا) ان کی یہ درخواست ارباب ندوہ نے منظور کی، اور اس مدرسہ کی ملکیت شکریہ کے ساتھ قبول کی۔

آخر میں مولانا عبدالجبار عمر پوری نے نہایت عمدہ لہجہ میں اپنا عربی قصیدہ سنایا، اور ندوہ اور مولانا محمد علیؒ کا ذکر کرتے ہوئے اشعار پر اپنا قصیدہ ختم کیا:

الـلـه يسقيها و يعصم عزها ویزید فیها حیـرة العقلاء
وادام عظمتها وضاعف نورها واقا مها فی رونق وبهاء
واعزنا ظمها الجليل بفضله واراحه من كربة و عناء
واطال مدة عمره و حياته عافاه في الدنيا و دار بقاء

اس کے بعد حکیم شیخ احمد صاحب رئیس بمبئی کا عربی قصیدہ قاضی علی احمد صاحب بدایونی نے پڑھا، نظامی بدایونی نے اپنی نظم سنائی، جس کے چند بند یہ ہیں۔

شاید بہار آئی اسلام کے چمن میں پھولے نہیں سماتے مومن جو پیرہن میں
انصاف سے جو دیکھیں ان پر ابھی ہو روشن کیا فائدے ہیں پنہاں اس پاک انجمن میں

ندوہ کے بانی اور انکے رفقاء کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

ڈالی بنائے ندوہ جس نے بحسن نیت برکت اسے خدا دے اس کوشش حسن میں
فرزانہ و یگانہ، عبدالحی، دانا عالم علوم دیں کے، کامل ہر ایک فن میں
یہ قوم کے معالج حضرت مسیح دوراں ہیں شمع انجمن میں، اور پھول ہیں چمن میں

روپیہ کی بارش

قصیدہ ختم ہوا تو مولانا شاہ سلیمان پھلواریؒ کل کی ناتمام تقریر پوری کرنے کھڑے

ہوئے، مسلمانوں کا جوش وخروش سرد نہیں ہوا تھا اور اسی موقع کے منتظر تھے، چنانچہ تقریر شروع ہوتے ہی روپیہ کی بارش بھی شروع ہوگئی، مولانا گل محمد پیش امام جامع مسجد نے پیش قدمی کرتے ہوئے اپنی جیبی گھڑی اسٹیج پر رکھ دی، اور بڑے جوش کے ساتھ ایک تقریر کی۔ حافظ غفورالدین صاحب ڈپٹی انسپکٹر بریلی نے اپنی قیمتی شال اتار کر ندوہ کو پیش کر دی، اور اس کے بعد عطیات کا سلسلہ شروع ہوا۔

مزدوروں کا تعلق و ایثار

مجمع کا تاثر اور جذبات کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس مجمع میں جو لوگ مزدور پیشہ تھے، انھوں نے اپنی ایک روز کی مزدوری ندوہ کو دیدی۔

ایک واعظ کا انقلاب حال

مولوی عبدالرحیم نامی ایک شخص واعظ تھے اور ندوہ کے سخت مخالف بلکہ مخالفین کے سر گروہ تھے، اور اس غرض سے جلسہ میں شریک ہوئے تھے کہ ندوہ کے رد میں رسائل تقسیم کریں، اور جلسہ میں انتشار پیدا کریں، انھوں نے جب یہ حال دیکھا تو ان کی آنکھیں کھل گئیں، چنانچہ وہ ان کتابوں اور رسالوں کا ایک پشتارہ بنا کر صدر انجمن کے پاس لے گئے اور ان میں سے کتابیں نکال کر چاک کرنا شروع کیا، لوگوں نے مزاحمت کی تو یہ واقعہ معلوم ہوا، اس کے بعد انھوں نے تقریر کی، اور اپنے سابقہ خیالات سے رجوع کا اعلان کیا۔

آفتاب کی تمازت اور گرمی کی شدت کے باوجود کوئی شخص نہ چاہتا تھا کہ چندہ کی کارروائی کی ختم ہو، بالآخر ساری تجاویز منسوخ کر کے کارروائی بند کر دی گئی، اور بہت الحاح وزاری سے دعا مانگی گئی، ۵ بجے شام آخری عام جلسہ ہوا اور سالانہ جلسہ ختم ہوا۔

شہر میں جلسے اور سرگرمیاں

جلسہ ختم ہونا تھا کہ شہر سے مجالس وعظ کی درخواستیں آنے لگیں، رؤسائے شاہ جہاں پور اس بات پر مصر تھے کے ایک دن اور جلسہ کیا جائے، لیکن جب یہ جلسہ ختم ہوا تو ان کا

اصرار ہوا کہ ان کے مکانوں پر جدا جدا جلسے منعقد ہوں، تا کہ خواتین بھی مستفید ہوسکیں۔

خواتین کی دریادلی

سب سے پہلے مولوی عبدالواجد خاں صاحب کے ہاں جلسہ ہوا، شاہ سلیمان پھلواروی نے وعظ کہا، وعظ ختم ہوتے ہی خواتین نے نقد اور زیور وغیرہ چندہ میں دینا شروع کردیئے، صاحب خانہ کی بیوی نے ۷ ہزار کی مالیت کی جائداد دارالعلوم کیلئے وقف کی، اس موقع پر عبدالرافع صاحب ڈپٹی کلکٹر گونڈہ نے اپنا نفیس کتب خانہ جس کی قیمت کا اندازہ ۱۰ ہزار روپیہ کیا گیا، دارالعلوم کو دینے کا اعلان کیا۔

بریلی کے لئے ندوہ کا وفد

رؤسائے بریلی نے خواہش ظاہر کی تھی کہ ندوہ کے تعارف کیلئے ایک وفد خصوصی طور پر اس علاقہ کا دورہ کرے، چنانچہ ۲۶ ذیقعدہ ۱۳۱۶ء کو مولانا سید محمد علیؒ، مولانا شاہ سلیمانؒ، مولانا سید عبدالحیؒ، اور دوسرے حضرات پر مشتمل ایک وفد بریلی گیا، اور وہاں کئی جلسے ہوئے۔ لوگوں نے بہت توجہ سے ندوہ کے اغراض ومقاصد کو سنا، اور اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔

ایک رئیس کا جذبۂ اعانت

۴ ذی الحجہ کو یہی وفد چندوسی (مراد آباد) پہنچا، ۵ ذی الحجہ کو دو جلسے ہوئے، شام کے وقت تقریروں کے بعد لوگوں نے چندہ دینا شروع کیا، اگرچہ چندہ کی رقم اس مرتبہ کچھ زیادہ نہ تھی، لیکن جس جوش وخروش اور ولولہ کے ساتھ چندہ دینے والے چندہ دیتے تھے، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ نواب حسن خاں صاحب رئیس مراد آباد جو جلسہ میں شرکت کیلئے اپنے گھوڑے پر آئے تھے، ان پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ اپنا گھوڑا ندوہ کے لئے نذر کردیا، جلسہ کے اختتام پر یہ پتہ چلا کہ نواب صاحب گھوڑے کو کسا کسایا چھوڑ کر پیادہ پا چلے گئے۔

مولانا عبدالحیؒ کی خدمات کا اعتراف

اس پورے عرصہ میں جو ندوہ کی عمر کا اہم ترین حصہ ہے، مولانا سید عبدالحیؒ، مولانا محمد علیؒ کے دست بازو تھے، انھوں نے ہر نازک اور مشکل وقت میں ان کی رفاقت کی، اور مولانا کو ان سے بڑی تقویت حاصل ہوئی۔

۲۵ رشوال ۱۳۱۷ھ کو مولاناؒ نے ارکان انتظامیہ کو ایک مراسلہ بھیجا اور اس میں مولانا سید عبدالحیؒ کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا، اور جن بلند کلمات کے ساتھ ان کا ذکر کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ان کے فہم و تدبر اور لیاقت کے بے حد معترف تھے۔

انھوں نے کچھ دنوں بغیر معاوضہ کے کام کیا تھا، اس کے بعد ان کے لئے ۳۰ روپیہ مشاہرہ مقرر کیا گیا، مولانا اس میں اضافہ کی سفارش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ''مولوی سید عبدالحی مددگار ناظم نے پہلے تو کچھ دنوں بغیر اجرت کے کام کیا، جب ان کی لیاقت و کارگزاری سے ناظم اور اراکین خوش ہوئے تو ۳۰ ماہوار ان کے لئے مقرر کئے گئے، انکے حلم اور کم سخنی سے انکی حالت پورے طور پر معلوم نہیں ہوتی تھی، کئی سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ ہمارے علماء کے زمرہ میں اس لیاقت کا آدمی ملنا مشکل ہے۔ علم، فہم اور حلم و لیاقت و کارگزاری قابل تعریف ہے''۔

آگے لکھتے ہیں:۔

> ''جب سے میں اپنے ضعف اور خرابی طبیعت کی وجہ سے کام نہیں کرتا، میرا کل کام وہی کرتے ہیں اور عمدگی سے انجام دے رہے ہیں، اور ان کو اس سے بہت دلچسپی ہے، میرے نزدیک بہت ضرور ہے کہ ان کی تنخواہ میں ترقی کی جائے، اور پچاس روپیہ ماہانہ دیا جائے''۔ (۱)

نئے مہتمم

۲۱ رمحرم ۱۳۱۸ھ کے جلسہ انتظامیہ میں مولانا محمد فاروق چریا کوٹی دارالعلوم کے نئے مہتمم اور مدرس اول مقرر کئے گئے، مولانا حفیظ اللہ صاحب کا نام نائب کی حیثیت سے

(۱) مجموعہ خطوط قلمی

پیش کیا گیا، لیکن انھوں نے ایک دن غور کرنے کے بعد معذرت کر دی۔

مولانا شروانی کی رپورٹ

۷/و۸/ جمادی الثانیہ ۱۳۱۷ھ کے جلسہ انتظامیہ میں ایک عرصہ کے بعد مولانا شبلی نے بھی شرکت کی، مولانا شروانی نے مولانا شبلی اور مولانا مسیح الزماں (۱) کے اشتراک سے دارالعلوم کے معائنہ کے بعد ایک رپورٹ تیار کی تھی، جس میں مدرسین کی بدنظمی اور سستی پر گرفت کی گئی تھی، یہ رپورٹ اس جلسہ میں پیش ہوئی، اور یہ طے ہوا کہ جن مدرسین سے یہ بدنظمی ہو رہی ہے۔ ان کے پاس ارکان وانتظامیہ کے دستخط سے ایک یادداشت بھیجی جائے اور اس پر تنبیہ کی جائے۔

انگریزی کا داخلہ

۱۴/شعبان ۱۳۱۷ھ کے جلسہ انتظامیہ میں پہلی بار مولانا شبلیؒ نے مولانا غلام محمد ہوشیار پوری کی تائید سے یہ تجویز پیش کی۔ کہ زبان انگریزی کی تعلیم بھی دارالعلوم میں شروع کیا جائے، اس سے پہلے انگریزی کے سلسلہ میں مولانا محمد علی کی رائے گزر چکی ہے، وہ انگریزی کی نہ صرف حامی اور مؤید تھے بلکہ داعی بھی تھے، لیکن تدریجی طور پر، اور اس حد تک کہ اس سے اصل درسیات کو کوئی نقصان نہ پہونچے، یہ تجویز بالاتفاق منظور ہوئی اور اس کے ساتھ یہ سوال بھی سامنے آیا، کہ درسیات کے ساتھ ساتھ جو طالب علم کے وقت کا بیشتر حصہ لے لیتی ہیں، انگریزی تعلیم کا انتظام اس طرح کیونکر ہو کہ درسیات کا نقصان بھی نہ ہو، اور انگریزی میں متوسط درجہ کی قابلیت بھی پیدا ہو سکے، یہ ایک پیچیدہ مسئلہ تھا جس کا حل کرنا علمی طور پر اتنا آسان نہ تھا جتنا نظری طور پر معلوم ہوتا ہے، اس لئے طے ہوا کہ

---

(۱) مولانا مسیح الزماں خاں اس زمانہ کے مشہور رئیس علماء میں تھے، نظام حیدر آباد کے استاد اور اتالیق بھی تھے، آخر عمر میں فالج کا حملہ ہوا، اور اسی میں وفات پائی لیکن اس حالت میں بھی نماز کا بے حد اہتمام تھا، مولانا اخلاق وتواضع، حلم وبردباری، وضعداری اور عالی حوصلگی میں ایک مثال تھے۔ دربار میں ان کو جو اثر ورسوخ حاصل تھا، اس کو ہمیشہ دوسروں کے لئے استعمال کیا۔ ۱۹۱۰ میں وفات پائی۔

پہلے اس کا ایک نقشہ یا خاکہ مرتب کیا جائے، اور اس پر دوسرے جلسہ میں غور خوض ہو۔

ندوہ کے اجلاس ہفتم منعقدہ پٹنہ میں مولانا سید عبدالحیؒ نے جو سالانہ رپورٹ پیش کی، اس میں مولانا نے اعلان کیا کہ دارالعلوم میں انگریزی تعلیم کا فیصلہ ہو چکا ہے، لیکن اس کی تعلیم کیونکر ہو اور کیا نصاب تعلیم مقرر کیا جائے اس کا فیصلہ ابھی باقی ہے، اور جب تک کوئی متعین صورت سامنے نہیں آجاتی اس وقت تک اس سلسلہ میں کچھ مزید کہنا مشکل ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک سال تک کاس سلسلہ میں کوئی نصاب طے نہیں ہو سکا تھا۔

دارالافتاء بند

یکم ربیع الثانی ۱۳۱۸ھ مطابق ۲۹ / جولائی ۱۹۰۰ء کو مجلس انتظامیہ نے جس میں مولانا شبلیؒ بھی شریک تھے، مولانا مسیح الزماں خاں کی ایک تحریک اور مولانا شبلی کی تائید سے یہ فیصلہ کیا کہ چونکہ اکثر علماء خود فتوے لکھتے ہیں، اور بعض مخصوص انجمنیں اس کام کے لئے قائم ہو گئیں ہیں، لہٰذا دارالافتاء کے مصارف برداشت کرنے کی حاجت نہیں، اس جلسہ میں مولانا فاروق چریا کوٹی کا استعفی پیش ہو، اور وہ اس خدمت سے سبکدوش کر دیے گئے، مولانا خلیل الرحمان سہارنپوری نئے مہتمم مقرر ہوئے، تربیت ونگرانی کا کام مولانا عبداللطیف صاحب کے سپرد ہوا۔

ندوہ کا اجلاس ہفتم منعقدہ عظیم آباد پٹنہ رجب ۱۳۱۸ھ نومبر ۱۹۰۰ء

پٹنہ میں اجلاس کی تحریک تو ۱۳۱۳ھ ہی میں ہوئی تھی، لیکن اس پر عمل درآمد کی نوبت اب آئی، شاہجہاپور کے اجلاس کے بعد مولانا رشید الحق عمادی نے یہ آواز پھر بلند کی، اور باقاعدہ طور پر رسمی دعوت ناظم ندوۃ العلماء کو ارسال کی، جو منظور ہوئی، ان داعیوں کے خلوص اور دلچسپی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے بہار کے مسلمانوں کو ندوۃ العلماء سے روشناش کرانے کیلئے پوری جدوجہد کی، انہیں حضرات کی کوششوں سے مظفر پور، دربھنگہ، مونگیر، اور بھاگلپور میں ندوۃ العلماء کی شاخیں قائم ہو گئیں۔

اجلاس کی قلمی تصویر

یہ اجلاس بڑی شان وشوکت کے ساتھ اور بڑے منظّم طریقہ پر ہوا، یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ندوہ کے اجلاس بھی ان کے تخیل کی طرح منفرد اور مخصوص حیثیت رکھتے تھے، وہ نہ عام مجالس ووعظ کی طرح ہوتے تھے اور نہ جدید کانفرنسوں کی طرح، اس میں مشرقی تہذیب کے حسن وجمال کے ساتھ جدید تہذیب کے مفید اور صالح ذرائع اور وسائل بھی نظر آتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان جلسوں کی افادیت بہت بڑھ گئی تھی، اور وہ مسلمانوں میں زندگی اور حوصلہ پیدا کرنے کا ایک طاقتور ذریعہ بن گئے تھے۔

اپنے مخصوص طرز کی وجہ سے مسلمانوں کے تمام طبقات اور مکاتب خیال سے تعلق رکھنے والے حضرات اس سے یکساں دلچسپی لے رہے تھے، علماء، عقلاء، بیرسٹر، اخبار نویس، ادیب، تاجر، طلبہ سب اس میں دوش بدوش حصہ لیتے تھے، یہ ندوۃ العلماء کی بڑی کامیابی تھی۔

مسلمانوں میں عام طور پر اور علماء میں خاص طور پر احساس وشعور، اور حوصلہ وولولہ پیدا کرنے اور ان کے اختلافات کو ختم کرنے میں ندوہ نے جو اہم کارنامہ انجام دیا ہے، اس میں اس جلسوں کی مخصوص نوعیت کو بڑا دخل ہے۔

روئداد اجلاس ہفتم میں انتظام جلسہ پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے کہ اس کی قلمی تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے، اس دور میں اسکا مطالعہ ہمارے اندر ایک نئی تحریک اور قوت عمل پیدا کرتا ہے:۔

> ''مکان جلسہ کو جو سڑکیں آئی تھیں ان کے موڑوں پر جابجا محرابیں بنائی گئی تھیں، جو پھول اور سبز پتیوں سے آراستہ تھیں، کسی محراب پر جلی حرفوں میں ''جلسہ ہفتم ندوۃ العلماء'' لکھا ہوا تھا، اور کسی میں مرحبا مرحبا کی گل کاری تھی، قریب کے محرابوں میں بہت ہی سنہرے جلی حرفوں میں ''مرحبا مرحبا تعال تعال'' لکھا ہوا تھا، مکان جلسہ کے قریب ہی ''دارالتفکہ'' (اسلامی ہوٹل) کھولا گیا تھا، جس میں چائے بسکٹ، امرود، سیب، انار، تازے میوے موجود رہتے تھے، اس چار پانچ قدم آگے چل بڑھ کر جلسہ کی شاندار عمارت تھی جس کے صدر پھاٹک پر ایک

نہایت خوشنما محراب بنائی گئی تھی، اس محراب میں سنہرے کار چوبی حروف میں "سلام علیکم طبتم فادخلوھا" لکھا تھا، بانکی پور کا مطبع بائیں جانب تھا، جو جلسہ کا پروگرام چھاپنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا تھا، جلسہ میں داخل ہوتے ہی پہلے بنچوں کی نشست تھی جس پر سرخ یک رنگہ بندھا ہوا تھا، بنچوں کے آگے تقریباً پانچ سو کرسیوں کی نشست تھی، بائیں جانب صدر چبوترہ کے قریب ایک فٹ بلند ایک اور چبوترہ تھا، جس کے تین طرف سرخ یک رنگے کا احاطہ تھا اور فرش پر ایرانی قالین بچھا ہوا تھا"۔

آگے لکھتے ہیں:۔

"ایک بڑی میز تھی جس کے ہر چار طرف ایڈیٹران اخبار کی نشست تھی، امرت بازار پتریکا، بہار نیوز بھاگلپور، وکیل امرتسر، پنجاب آبزرور وغیرہ کے لائق وفائق ایڈیٹر اور رپورٹر بیٹھ کر کارروائیاں قلم بند کرتے تھے"۔(۱)

ان انتظامات میں بعض چیزیں ضرورت سے زائد اور بعض بے ضرورت بھی تھیں، اور کفایت واعتدال کو زیادہ ملحوظ نہیں رکھا گیا تھا، جیسا کہ اس رپورٹ کے آخر میں اعتراف کیا گیا ہے، لیکن ندوۃ العلماء کے اور جلسے ان غیر ضروری مظاہر سے عموماً پاک ہوتے تھے، پھر بھی بعض اوقات مخالفین اس چیز کو بہانہ بنا کر ندوہ کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے، لیکن ان موہوم نقصانات کے مقابلہ میں اس کے ٹھوس فوائد اور اثرات زیادہ قیمتی اور قابل ترجیح تھے۔

ان جلسوں نے علماء و جمہور اور قدیم وجدید طبقوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے نیز ندوہ کے اغراض ومقاصد اور اس کے نصب العین اور تخیل کی ترجمانی اور تبلیغ کے سلسلہ میں جو اہم پارٹ ادا کیا ہے اسکی قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

پہلا اجلاس

۱۰ ررجب کی صبح کو پہلا اجلاس منعقد ہوا، مولانا احمد حسن کانپوری نے صدارت کی، اور مولانا شاہ سلیمان نے ان کی نیابت کرتے ہوئے جلسہ کا افتتاح کیا، مغربی تعلیم اور

---

(۱) اجلاس ششم:۸

مشرقی تعلیم کے حامیوں اور نمائندوں کی طرف مخاطب ہوکر انھوں نے کہا کہ:۔الحمد للہ! اس جلسہ میں اور ہمارے اس شہر میں دونوں قسم کے حضرات مجتمع ہیں، اور نہایت صلح صفائی کے ساتھ ایک دوسرے کی تقریر سننے پر آمادہ ہیں، لہٰذا میں کہوں گا کہ مدت کے بچھڑے ہوئے مل گئے، اور آج دونوں میں صلح ہوگئی۔

للہ الحمد میان من او صلح فتاد

حوریان رقص کناں نعرۂ مستانہ زدند

اس کے بعد صوبہ کے مشہور حکیم عبدالحمید صاحب عظیم آبادی کا عربی قصیدہ جو ندوۃ العلماء کے خیر مقدم میں انھوں نے لکھا تھا، شاہ سلیمان نے پڑھ کر سنایا، مولانا سید عبدالحی نے ندوۃ العلماء کی سالانہ رپورٹ پیش کی، مولانا شروانی نے ندوۃ العلماء اور اس کی ضرورت پر اپنا مقالہ پیش کیا۔

طلبہ کا امتحان

اس جلسہ کی ایک خاص بات یہ تھی کہ سید شرف الدین صاحب بیرسٹر (بانکی پور) کی خواہش پر دارالعلوم کے ان اولین طلبہ کا امتحان لیا گیا جو سال ڈیڑھ سال کی تعلیم کے بعد اس جلسہ میں شریک ہوئے تھے۔

دیکھتے دیکھتے یہ جلسہ امتحان ہال میں تبدیل ہو چکا تھا، سب سے پہلے ایک طالب علم نے چند آیات کی اس خوش الحانی سے تلاوت کی کہ ساری فضا مرحبا اور جزاک اللہ کی آوازوں سے گونج اٹھی۔ سید شرف الدین نے اس کے بعد ہی کسور مرکب کا ایک سوال دے دیا۔ اس موقع پر غلطی کا احتمال بہت تھا لیکن روئداد نویس کا قلم لکھتا ہے:۔

”پھر دیر کیا تھی، سلیٹ پر کھٹا کھٹ پنسلیں چلنے لگیں، اور بات کی بات میں سبھوں نے جواب لکھ کر رکھ دیا، اور لطف یہ کہ سب کا جواب صحیح“۔

اس کے بعد ہر طرف تحسین و آفریں کی صدا کی آواز بلند ہوئی، اس پر بس نہ کی گئی، شاہ محمد سلیمان نے اردو کی ایک عبارت جو اسی جلسے سے متعلق تھی عربی میں ترجمہ کرنے کو دیدی، اس وقت درجہ ابتدائی کے سال دوم کے سات طالب علم موجود تھے، طلبہ نے بہت

عجلت کے ساتھ ترجمہ کر کے واپس کر دیا، بیشتر کا ترجمہ اچھا تھا۔

محمد خالد نے اپنا عربی مضمون سنایا، یہ مضمون انھوں نے خود لکھا تھا، کسی سے اصلاح نہ لی تھی، اس میں صلات کی غلطیاں تو کافی تھیں، لیکن مجموعی طور پر مضمون کا معیار قابل تعریف تھا۔

شام کو ۵ بجے رات تک جامع مسجد میں جلسۂ عام ہوا جو گنگا کے کنارے بلندی پر واقع تھی، جامع مسجد کے آس پاس حجروں کے پرانے کھنڈر اس بات کو ظاہر کر رہے تھے کہ کسی زمانہ میں مشہور درسگاہ تھی، بعض اہل علم نے یہ لکھا ہے کہ علامہ محبّ اللہ بہاریؒ صاحب سلم و مسلم نے عرصہ تک اس مدرسہ میں درس دیا ہے، (۱) یہ مسجد بھی مدرسہ کے ساتھ ویران ہو گئی، مولانا شاہ امانت اللہ کی کوششوں سے اس کی دوبارہ تعمیر ہوئی، منظر کی دلفریبی کا نقشہ کھینچتے ہوئے روئداد نویس کا قلم لکھتا ہے:۔

> ''جھاڑ فانوس کی جگمگاہٹ سے تمام مسجد بقعہ نور ہو رہی تھی، رات کا عالم، روشنی کی چمک، دریا کا موجیں مارنا، اسٹیمر اور اگنبوٹ کا چلنا، واعظین کا مؤثر اور دل گداز آواز میں وعظ و ہدایت فرمانا، کچھ ایسا منظر تھا جس کو ہم بیان نہیں کر سکتے''۔ (۲)

دوسرا اجلاس

۱۱؍رجب کو دوسرا اجلاس ہوا، اس بار بھی حافظ واجد علی طالب علم دارالعلوم نے تلاوت کی، اتنی خوش الحانی کے ساتھ کہ حاضرین پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی، حافظ محمد احسن صاحب رئیس بنارس نے بے ساختہ اپنا شال رومال ان کو اڑھا دیا، جب دوسرے وقت چندہ شروع ہوا، تو حافظ واجد علی نے اس رومال کو ندوہ کے نذر کر دیا۔

سید فضل حق آزاد نے اس موقع پر بڑے جوش کے ساتھ اپنی نظم سنائی، اور جلسہ کی تصویر کھینچ کر رکھ دی، اس کے چند شعر یہ ہیں:۔

زمانہ جس کے روشن چشم بد دور ایسے منظر سے
فروغ رونق اسلام ہے ہر سو، جدھر دیکھو

---

(۱) روئداد اجلاس پٹنہ: ۲۴ (۲) ایضاً: ۲۴

وحید عصر و یکتائے زماں ہے فرد فرد اس کا
جسے دیکھو ،اسے گنجینۂ علم وہنر دیکھو
جنیدؒ، شبلیؒ وعطارؒ دیکھو یہ وہ مجمع ہے
جو سالک ہو تو اس حلقہ میں آجاؤ ،خضر دیکھو
نکل آئیں نہ باہر پتلیاں مشتاق آنکھوں سے
غضب ہے دیکھنے والو ،نہ اتنا ٹوٹ کر دیکھو

عظیم آباد میں ندوہ کے اس تاریخی اور شاندار جلسہ کے استقبال کی کیفیت ،اور اہل عظیم آباد کی گرم جوشی اور زندہ دلی کی تصویر کھینچتے ہوئے کہتے ہیں:۔

کنول دل کے کھلے گل سے شگفتہ ہو گئے عارض
رخ احباب پردہ رنگ اڑاتی فرحتیں ائیں
دلوں میں بہر استقبال دینی ولولے آئے
کمر باندھے پئے مہماں نوازی ہمتیں آئیں
عرق افشانیاں کہتی ہیں نورانی جبینوں کی
حمیت کو حیا ،مہر وفا کو غیرتیں آئیں
عظیم آباد میں اے دوستو :ندوہ نہیں آیا
خدارا اوج پر اسلامیوں کی قسمتیں آئیں

اس نشست میں سید شرف الدین بیرسٹرایٹ لانے مفصل تقریر کی ،انھوں نے دارالعلوم کا جن الفاظ میں ذکر کیا اس سے ہمارے سامنے اس زمانہ کا دارالعلوم روشنی میں آجاتا ہے ،اور حیرت ہوتی ہے کہ ڈیڑھ برس کی مدت میں دارالعلوم نے اتنا بلند مقام کس طرح حاصل کرلیا تھا کہ کوئی حساس ،دردمند ،اور مخلص شخص اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔

یہ جدید طبقہ کی طرف سے دارالعلوم پر پہلا مستند اظہار خیال ہے ،اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا چیزیں تھیں جس سے اس طبقہ کو ندوہ کی طرف متوجہ کیا جاتا ،کہتے ہیں:۔

''ایک مہینہ ہوتا ہے میں لکھنؤ گیا اور دارالعلوم کو دیکھا ،لکھنؤ جانے سے پہلے ہمیں خیال تھا کہ دارالعلوم کا مکان کوئی معمولی جھونپڑا ہوگا ،اور کثافت تو یقینی

ہوگی، مگر ماشاء اللہ! وہاں تو دس ہزار کا ایک وسیع مکان خرید ا گیا، جس میں طلبہ کی ورزش، خورد نوش، تعلیم و تعلم کے ہر قسم کے سامان عمدگی سے مہیا کئے گئے ہیں، درسگاہ دیکھی، بورڈنگ ہاؤس دیکھا، جس کی نگرامی علماء کرتے ہیں، دارالاقامہ کے ہر کمرہ میں دیوار میں الماریاں بنی ہوئی ہیں کہ طلبہ اپنی کتاب الگ الگ رکھیں اور ایک جگہ دوائیاں رکھی ہوئی ہیں، اور یہ سب اس پانچ روپیہ میں (۱)، اور تعلیم کا یہ عالم جس کا نمونہ کل آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں، حق یہ ہے کہ ان اللہ والوں نے یہ دارالعلوم نہیں کھولا ہے، علم کا ایک تعویذ نکالا ہے جس کو گھول کر پلا دیتے ہیں، دارالعلوم کے بچوں کو نہایت تندرست ہشاش بشاش پایا، یہ خرق عادت اور کرامت نہیں تو اور کیا ہے"۔ (۲)

سید شرف الدین صاحب نے اپنی تقریر میں چندہ کی تحریک کی، اور اتنے پرزور طریقے پر، کہ مولانا وارث حسن صاحب مدرس مدرسہ اسلامیہ (بنارس) نے اپنا عمامہ (جو مولانا حاجی امداد اللہ صاحبؒ کا تھا، اور ان کے ایک مسترشد کے ذریعہ مولانا وارث حسن کو ملا تھا، سر سے اتار کر رکھ دیا، اور مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی نے اس کو اسی وقت ۵۰ روپیہ میں خرید لیا، بس پھر کیا تھا، ہر طرف سے چندہ ہونا شروع ہوا، اور لوگ ذوق وشوق کے ساتھ اپنا نام لکھوانے لگے۔

اس جوش وخروش کے عالم میں مولانا شاہ سلیمان پھلواریؒ نے (جن کو بجا طور پر سحبان ندوہ کہا جاسکتا ہے) للکارا:۔

وقت آں آمد کہ من عریاں شدم

لیکن سید شرف الدین صاحب کی رائے یہ ہوئی کہ چونکہ لوگ چندہ کیلئے تیار ہوکر نہیں آئے ہیں، اس لئے زیادہ کوشش کرنا مفید نہ ہوگا۔ چنانچہ چندہ کی کارروائی روک دی گئی۔

---

(۱) مصارف خورد ونوش وقیام وغیرہ کے لئے طلبہ سے پانچ روپیہ لئے جاتے تھے۔

(۲) روئداد اجلاس پٹنہ: ۴۴

ایک نوجوان بیرسٹر کی تقریر

اس کے بعد ایک نوجوان مولوی نصیر الدین بیرسٹرایٹ لا (بانکی پور) تقریر کرنے کھڑے ہوئے اور انھوں نے اتنی مؤثر تقریر کی کہ لوگوں کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔

رئداد نویس اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

''جس شان سے یہ پر جوش نوجوان تقریر کرنے کھڑا ہوا وہ سماں ہم کبھی نہیں بھولیں گے، ہر طرف سے رونے اور سسکیاں لینے کی آواز آرہی تھی، جو تھا بے چین اور بے قرار تھا، الفاظ تو سیدھے اور سادے تھے، مگر جس سچے جوش اور سچے دل سے نکلتے تھے اس کا منشا ہی یہی تھا کہ ہر دل میں گھر کرلے۔

''آنچہ از دل خیزد بر دل ریزد''

چند سیدھے سادے الفاظ نے سارے جلسہ کو بے چین کردیا، سارا جلسہ پر جوش اور جان فدا کرنے پر آمادہ تھا، علماء کے طبقہ کا حال نہ پوچھئے رومال تر، آنکھیں سرخ، فرط گریہ سے سب از خود رفتہ'' (۱)۔

اس نوجوان نے تقریر کرنے کے چند منٹ ہی بعد وفور جذبات سے بے قابو ہوکر اپنی سنہری گھڑی جس کی مالیت ساڑھے تین سو روپے کی تھی، ندوہ کو پیش کردی

یہ نوجوان انصاری تھے، تقریر میں انھوں نے کہا:۔

''میں انھیں انصاریوں کی اولاد ہوں جو اپنی جانیں اور اپنے مال ہمیشہ اسلام پر فدا کرتے رہے''۔

تقریر کے ہی دوران انھوں نے اپنا کوٹ اور جاکٹ بھی اتار کر اس وقت ندوہ کو دیدیا، اور پر جوش الفاظ میں کہا کہ:۔

''ہم جلسہ کو مشاعرہ بنانے نہیں آئے ہیں، ہم یہ دکھانے آئے ہیں کہ ہم میں اسلام کی کتنی محبت اور کتنی وقعت باقی ہے''۔

انہوں نے کہا:۔

---

(۱) روئداد اجلاس پٹنہ: ۴۸

''ہمارے معزز علماء کی پگڑیاں اتر جائیں، اور ہم کپڑے پہنے رہیں''۔

پھر کچھ دیر تقریر کرنے کے بعد کہا کہ:۔

''ہمارے پیشوا گدائی کیلئے نکلیں اور ہم کھڑے دیکھتے رہیں، بھائیو! اب بھی سنبھلو، اب بھی اٹھو، ان قومی بھکاریوں کی جھولیاں کو بھر دو، ان اسلامی گداؤں کا دامن بھر دو، کہ پھر انھیں دوسرے در تک نہ جانا پڑے، ہائے ہم مدینہ سے ملک کو فتح کرنے نکلے تھے کاسہ گدائی سے کر نہیں، ہم اسلامی شان وشوکت لے کر چلے تھے، بھیک مانگنے کو نہیں''۔

اور جب انھوں نے یہ کہا کہ:۔

''ہم سے یہ دیکھا نہیں جاتا کہ یہ نورانی صورتیں ہمارے دروازے پر گدائی کریں اور پھر ہمارے ہی لئے:۔

تو جلسہ میں کہرام سا مچ گیا، اور کوئی اپنے ہوش میں نہ رہا۔ روداد نویس کے الفاظ یہ ہیں کہ:۔

''عبائیں، عمامے، کپڑے، گھڑیاں، روپے مینہ کی طرح برسنے لگے، ایک عفت مآب خاتون نے اپنے پاؤں کے کڑے اتار کر دے دئے''۔

اس کے بعد مرزا کمال الدین سنجر طہرانی نے اپنا فارسی قصیدہ ایرانی لہجہ میں خوش الحانی کے ساتھ پڑھا، اور ندوہ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا:۔

خوشا بر حال ایں دانشوران ندوہ اے مردم
کہ وارا نید جملہ دانش وعرفان وایقاں را
نہ ہر کس دعوی دانش تو اند کرد در گیتی
سلیمانی نہ زیبد در جہاں البتہ دیواں را
الٰہی زندہ وخرسندہ ماند ناظم ندوہ
اسد ایں خدمت او با ہزار اں مجد پایاں را

اس کے بعد شیخ عبد القادر بیرسٹر ایٹ لا (۱) نے اہل لاہور کی طرف سے بہار والوں کا مناسب اور مؤثر الفاظ میں شکریہ ادا کیا۔

---

(۱) جو بعد میں سر عبد القادر ہو گئے

اجلاس سوم میں شیخ عبدالقادر نے کتب خانہ کی ضرورت واہمیت پر ایک مبسوط اور پرمغز علمی تقریر کی، اور پوری تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا:۔

"کہاں ہیں وہ مردان باہمت کہ اپنے دفینوں کو کھود کر نکالنے کے لئے تیشہ فرہاد میں لے لیں، وہ مجموعے کتب اسلامی کے جو فی الحقیقت ہر پہلو سے زر وجواہر سے زیادہ مرتبت رکھتے ہیں، دنیا کو دکھائیں، اپنی پرانی کتابوں کو طاق نسیاں سے اتار کران کی گردوغبار جھاڑیں، ان کی بوسیدہ جلدیں گو کتاب کے اصلی نشان سے کچھ واسطہ نہیں رکھتیں، لیکن ایسی ہی ضروری ہیں جیسے انسان کیلئے موزوں اور مناسب لباس"۔(۱)

اس جلسہ سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ جدید وقدیم طبقہ کی یہ تفریق محض وہم کا نتیجہ ہے، حقیقت میں یہ ختلاف مصنوعی اور ظاہری ہے، دونوں کے خیالات اور جذبات میں کوئی اختلاف نہیں، غلط فہمیوں اور تعلیم وماحول نے دونوں کے درمیان ایسے دبیز پردے ڈال دئے ہیں جس کی وجہ سے انتہائی قرب کے باوجود انتہائی بعد معلوم ہوتا ہے، اگر پردے ہٹ جائیں تو نظر آئے کہ دونوں کس قدر قریب ہیں۔

علماء اور سید شرف الدین، مولوی نصیر الدین صاحبان کی تقریر نے یہ بات صاف کر دی تھی کہ علماء جدید طبقہ کیلئے کتنے فراخ دل اور روادار ہیں اور جدید طبقہ کے دل میں علماء کی کتنی وقعت اور محبت ہے، یہ بات جلسہ کے ہر فرد نے بخوبی محسوس کی۔

شیخ عبدالقادر نے بھی اپنی تقریر کے آخر میں اس اہم حقیقت کی طرف اپنے مخصوص انداز میں اشارہ کیا ہے، کہتے ہیں:۔

"صاحبان! کل کے جلسے میں آپ نے دلوں سے پردے اٹھتے دیکھے ہیں، کئی بزرگوں کو استعجاب تھا، مگر صاحب یہ تو سیدھی سادی بات تھی، صرف یہی ہوا کہ مادۂ قبولیت تو ان مطعون انگریزی خوانوں میں موجود تھا، ان مشائخ اور علماء کے برمحل اور مناسب موقع اور پرتاثیر وعظوں نے رگ جاں پر نشتر کا کام کیا۔

(۲) روئداد اجلاس پٹنہ: ۵۸

نمک زد شوخی اندر جان وتو کرد
جراحت ہا کہ در بنیاد بود ست

غرض یہ ہے کہ نشتر بھی چبھے، زخم بھی تازہ ہوئے، درد بھی پیدا ہوا، روئے بھی، پیٹے بھی، کراہے بھی، اب دیکھنا یہ ہے کہ کچھ لہو بھی ٹپکتا ہے یا نہیں"۔(۱)

اس کے بعد مولانا شاہ سلیمان صاحب نے مفصل تقریر کی اور اپنا عربی قصیدہ پیش کیا جس کی ابتدائی اشعار حسب ذیل ہیں:۔

لروض العلم قد عاد الشباب　　واهل العلم طاب لهم مآب
الا یا ندوة العلماء طرا　　لنا من شانك العجب العجاب
لانك قد دعوت المسلمینا　　لنشر العلم فیهم فاستجابوا
وكان الجهل متسع الفیافی　　ووجه العلم كان له النقاب

دوسری تقریروں کے بعد پھر چندہ کا زور شور ہوا، اور جس پاس اس وقت جو کچھ موجود تھا وہ اس نے ندوہ کو دیدیا، یہاں تک کے ایک غریب مخلص نے دو دھیلے جو اس کے پاس تھے وہ بھی نکال کر پیش کر دئے، اس کے علاوہ بڑی بڑی رقمیں بھی وصول ہوئیں۔

جدید طبقہ کی طرف سے اظہارِ عقیدت

چوتھی نشست میں منیجر والنٹیئر ان بانکی پور ابوالخیر محمد اسحٰق صاحب نے انگیریزی دان طلبہ کی طرف سے ندوۃ العلماء کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی عقیدت کا اظہار ان الفاظ میں کیا کہ:۔

"گوہم لوگ انگریزی پڑھتے ہیں مگر علماء اپنے حسن اخلاق سے برابر ہماری دست گیری اور ہمارے رفتار و کردار کی نگرانی فرماتے رہیں، اور ہم تو انکے تابع اور انکے غلام ہیں، ہم ان کی جتنی خدمت کریں کم ہے"۔

سید شرف الدین صاحب کی تقریر بھی اس موضوع پر تھی، کہ انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کو علماء سے اور علماء کو انگریزی تعلیم حضرات یافتہ سے کتنا تعلق رکھنا چاہیے، انھوں

---

(۱) اجلاس پٹنہ

نے جدید طبقہ کے کمزور پہلوؤں کو کھول کھول کر بیان کیا، اور کہا کہ اس طبقہ سے علماء کے تنفر اور وحشت کی وجہ دراصل یہی ہے۔

آخر میں انھوں نے بہت صراحت کے ساتھ علماء سے رہنمائی اور رہبری کی درخواست کی اور کہا کہ "آپ ہماری کشتی کے ناخدا ہیں، ڈبوئیں یا سلامتی کے ساتھ کنارے پر لگائیں"۔

حاجی محمد نور الرحمٰن صاحب نے صدر انجمن کی اجازت سے ایک پرجوش قصیدہ پڑھا، اور اس میں مخالفین سے کچھ تعرض کیا، ان اشعار کو صدر انجمن نے پڑھنے سے روک دیا، اور مولانا سید عبدالحیؒ نے کہا کہ یہ ہمارے مقاصد کے خلاف ہے۔ وہ ہماری نسبت جو چاہیں کہیں، مگر ہم ان کو کچھ کہنا نہیں چاہتے، نہ اس کا سننا پسند کرتے ہیں۔ (۱)

حاجی امداد اللہ صاحب کی وفات پر تعزیتی تجویز

آخری اجلاس میں حضرت مولانا حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد نعیم فرنگی محلی علیہ الرحمہ کی وفات پر تعزیت کی تجویزیں منظور ہوئیں اور حاجی صاحب کو ندوۃ العلماء سے جو تعلق خاطر تھا اور ان کی ذات سے ندوہ کو جو فائدہ پہونچ رہا تھا اس کا اعتراف کیا گیا۔ مولانا سید عبدالحیؒ نے رپورٹ کارروائی سال گزشتہ میں ان کی تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ:۔

> "وہ ہندوستان کے علماء ومشائخ کے سرگروہ تھے، اور ندوۃ العلماء کے سرپرست اور مربی تھے، اور ابتدائے قیام ندوۃ العلماء سے روز وصال تک اپنی ہمت اور توجہ سے ندوۃ العلماء کو فائدہ پہونچاتے رہے۔ ندوۃ العلماء کے ساتھ جناب ممدوح کو جو خصوصیت تھی وہ اس سے ظاہر ہے کہ اس کے حالات سننے کے وہ ہمیشہ مشتاق رہتے تھے، اور جب کبھی خط پہونچنے میں دیر ہوتی تھی تو خود پیش قدمی فرماتے تھے۔"

سب سے آخر میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانیؒ ندوۃ العلماء کی طرف سے میزبانوں کا شکریہ ادا کرنے کھڑے ہوئے اور اپنے پر درد الفاظ میں منظر کی تصویر کھینچ کر رکھ دی۔ انہوں نے کہا کہ:۔

---

(۱) روئداد اجلاس پٹنہ

''بزرگان عظیم آباد! جس افسوس ناک وقت کے آنے کا کھٹکا تھا، اور جو حسرت آمیز گھڑی آنے کو تھی آخر آ ہی گئی۔ اب یہ جلسہ ختم ہونے کو ہے، اور یہ بزم درہم برہم ہوا چاہتی ہے، مجھے اجازت ملی ہے کہ میں آپ لوگوں کا شکریہ ادا کروں۔ حضرات ابتداء سے ہی میں اس ندوۃ العلماء کے ناچیز خدام میں ہوں۔ اس لئے شروع سے آج تک جتنے جلسے لکھنؤ وغیرہ میں ہوئے سب میں شریک ہوا۔ میں نے نہ صرف ندوۃ العلماء کے جلسے دیکھے ہیں بلکہ مسلمانوں کی دوسری انجمنوں میں بھی شریک ہوتا رہا ہوں، اور ایجوکیشنل کانفرنس کے بہت سے جلسے دیکھے ہیں، اس وجہ سے اس قسم کی مجالس کا جو مجھے تجربہ ہے وہ کم نہیں ہے۔ میں بلا تصنع سچے دل سے کہتا ہوں کہ جو حالت میرے دل پر یہاں طاری ہوئی، اور جو اثر یہاں پیدا ہوا کفی باللہ شہیدا ایسا کہیں نہیں ان پیدا ہوا۔''(۱)

آخر جلسہ برخاست ہوا۔ مسلمانوں نے ایک دوسرے کو حسرت کی نگاہ سے دیکھا، اور آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔

دم رخصت زباں تو کھل نہ سکی
دل کی باتیں ہوئیں نگاہوں میں(۲)

دارالعلوم کے متعلق مولانا کا ایک اہم مکتوب

مولانا کا قیام ان دنوں دربھنگہ میں تھا، اور حج کا ارادہ تھا، لیکن اس بات کو مخفی رکھنا چاہتے تھے، اس خط کے آخر میں جس کا ذکر آگے آرہا ہے اس بات کا اشارہ ملتا ہے، لکھتے ہیں:۔

''میں غالباً چار پانچ روز کے بعد مونگیر جاؤں گا، پھر کانپور کا ارادہ ہے، پھر کچھ قصد اور ہے۔''

مولانا کو اس بات کا بہت خیال تھا کہ ان کی غیر حاضری میں ندوۃ العلماء کا انتظام کس طرح ہوگا۔

ندوہ اس وقت جس اہم اور نازک مرحلہ میں تھا اس کے لئے یہ بات ضروری تھی کہ

---

(۱) روئداد اجلاس پٹنہ:۱۰۱ (۲) روئداد اجلاس پٹنہ:۱۰۱

بڑی وسیع النظری، حوصلہ مندی، اور اعتدال وتوازن کے ساتھ اس کے سارے شعبوں کی خبر رکھی جائے، اور ندوہ کا تخیل اور مقصد کسی وقت نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے، اس کے لئے ان کی نظر انتخاب مولانا عبد اللطیف اور مولانا سید عبد الحی پر پڑی۔

۲۸ رجب ۱۳۱۸ھ کو دربھنگہ سے ان دونوں کے نام ایک مشترکہ طویل مکتوب میں مولانا نے ان سارے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جو توجہ کے طالب ہیں۔ مولانا کا طرز فکر اور نقطۂ نظر جتنی وضاحت کے ساتھ اس خط میں ملتا ہے کسی اور خط میں نہیں۔

تیس صفحے کا یہ خط جس کو شاید رسالہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا درحقیقت دار العلوم کا لائحہ عمل ہے، اس میں مولانا نے اپنی عقلیت، ثقافت، انداز فکر، اور اسلوب بیان، خلوص و دردمندی، خلش واضطراب سب کچھ اس طرح سمودیا ہے کہ قانون کی جامعیت اور دقیقہ رسی کے ساتھ خطابت کا زور اور خطوط کی سادگی اور بے تکلفی بھی دامن دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے، اور اثر و دلپذیری کا ایک نیا مرقع نظر آتا ہے۔

سترہ نکات پر مشتمل اس خط میں چار چیزیں بہت نمایاں ہیں:۔

(۱) جزئیات سے گہری اور عملی واقفیت جو ایک کامیاب اور تجربہ کار قائد اور رہنما کے لئے بے حد ضروری ہے۔

(۲) دوراندیشی اور وسیع النظری۔

(۳) اعتدال وتوازن۔

(۴) علوم قرآن اور ادب عربی پر خاص زور۔

جزئیات سے واقفیت کا یہ عالم ہے کہ نہ صرف نصاب اور درسیات، طریقۂ تعلیم وتربیت اور دفتری امور، بلکہ تعمیرات تک کے معاملات میں ایسی تفصیلات ملتی ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اس سے کس درجہ باخبر تھے، اور انکو اس کی کتنی فکر تھی، ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"معلوم نہیں تعمیر کا کیا حال ہے، مولوی عبد الحمید صاحب اگر کامل توجہ سے اس کی نگرانی کریں اور تمام دن اس میں صرف کریں تو خیر، ورنہ حکیم صاحب کے

متعلق اس کی نگرانی کیجئے وہ واقف ہیں اور دلسوز بھی، اور منشی ظہیر الدین ہر وقت کام دیکھتے رہیں، یہ خیال رہے کہ بیچ کا کمرہ اسی وقت بنے گا، اس کے پورب رخ ایک دروازہ ہوگا، اور اس دیوار میں پورب رخ ڈاٹ دے کر الماری کے لئے در چھوڑ دیا جائے گا اور اندر کی طرف دیوار صاف رہے گی، اس کی تعمیر کی طرف پورا خیال رہے، روپیہ برباد نہ ہو، اور سیر کو جو مسلمان ہے، کسی وقت بلوا کر مشورہ کیا کیجئے۔''

دارالعلوم کی مہر کے متعلق لکھتے ہیں تو صرف اس کی تفصیل پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس خط میں اس کی شکل بھی بنا کر بھیج دیتے ہیں۔ اسی طرح سند کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''سند کے لئے عمدہ کاغذ اور خوشنما بیل وغیرہ بنوا کر چھپوایا جائے اور عبارت معمولی بھی چھپ جائے جو کل طلبہ کے لئے مناسب ہو مگر زیادہ عبارت جس سے طالب علم کی پوری لیاقت معلوم ہو وہ قلمی ہونا چاہئے۔ اس میں ایسے جچے تلے الفاظ ہوں کہ نہایت واقعی اور سچی حالت طالب علم کی ظاہر کر دیں۔''

علم کے ساتھ دینداری اور خوش خلقی کی ضرورت

دوسری بات جو اس خط میں نظر آتی ہے وہ مولانا کی دور اندیشی اور وسعت نظر ہے، وہ محض علم دین کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ اس کے ساتھ دینداری اور خوش خلقی کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ مدرسین کے انتخاب کے سلسلہ میں مولانا نے متعدد مشورے دیئے ہیں اور کئی اشخاص کے نام کی سفارش کی ہے، لیکن ہر جگہ اس بات کا خیال رکھا ہے کہ علم کے ساتھ دین و اخلاق کا پہلو ضرور نمایاں رہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مکتوب الیہ پر اس اس کی اہمیت اچھی طرح واضح ہو جائے۔ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ مولانا کا اسلوب بالکل غیر جارحانہ اور تنقید و طنز سے خالی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

''مدرسین زیادہ کئے جائیں۔ میرے خیال میں مولوی سیف الرحمٰن کا ہونا بہت مناسب ہے، لیاقت کے علاوہ نہایت دیندار، خوش خلق اور خوش خیال ہیں، کئی مرتبہ جلسوں میں شریک ہو چکے ہیں، اکثر کتابیں مولانا لطف اللہ سے پڑھی

ہیں۔اور حدیث مولانا رشید احمد صاحب سے دو برس وہاں رہ کر پڑھی ہے۔''

ایک اور صاحب کے متعلق اپنی رائے دیتے ہیں، اس ریمارک سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا ندوہ کی انتظامی مشینری کے لئے کس قسم کے آدمیوں کو پسند کرتے تھے:۔

''وہ نیک بخت، سنجیدہ اور فہمیدہ اور جدت پسند آدمی ہیں، ان کو فی الحال انتظامی امور میں مشورہ دینے والوں میں لینا چاہئے۔''

صحت جسمانی اور ورزش کی اہمیت

لیکن اگر ایک طرف مولانا کو قدم قدم پر دینداری کا خیال ہے اور وہ علم ولیاقت کے ساتھ خوش خلقی اور دینداری کا ذکر بھی ضرور کرتے ہیں تو دوسری طرف محض علم اور دینداری ان کے نزدیک کافی نہیں، صحت جسمانی اور اس کے لئے جو ذرائع ضروری ہوں، ان کو اختیار کرنا بھی ان کے نزدیک بیحد ضروری ہے، اس کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''طلبہ کی ورزش کا بھی بہت خیال رکھئے، قوت اور صحت جسمانی اگر نہ ہوگی تو وہ کیا پڑھیں گے اور محنت کیونکر کر سکیں گے، اس میں آپ شرم نہ کریں، مشورہ کر کے کوئی ورزش کرائیں۔''

آگے لکھتے ہیں:۔

''ہر وقت ان پر ایسا دباؤ نہ رہے کہ ان کے دماغ کی شگفتگی جاتی رہے، حاصل یہ ہے کہ نہ تو ایسے غیر مہذب ہوجائیں جیسے اسکول کے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں کہ کسی بزرگ کو کچھ سمجھتے ہی نہیں، اور نہ ایسے خائف اور پژمردہ ہوجائیں کہ بشاشت اور طباعی جاتی رہے، بلکہ شرع وتہذیب کے ساتھ ہشاش بشاش رہیں۔''

زندگی کے عناصر خمسہ

حقیقت یہ ہے کہ جب تک دین، علم، اخلاق، صحت اور دماغی شگفتگی کے یہ عناصر خمسہ ہماری زندگی میں نمایاں نہ ہوں گے اس وقت تک یہ زندگی اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر نہ ہو سکے گی۔اور اس میں اقوام عالم کو متاثر کرنے اور دلوں کو مسخر کرنے کی صلاحیت پیدا نہ ہوگی، دماغی صحت کے لئے شگفتگی کا جو لفظ مولانا نے استعمال کیا ہے،

میں سمجھتا ہوں کہ اس مفہوم کے لئے اس سے بہتر لفظ ملنا مشکل ہے، اور یہ مولانا کے صحت تصور اور حسن تعبیر کی دلیل ہے۔

اردو ادب

اردو ادب کی اہمیت بھی مولانا کی دوررس نگاہ سے مخفی نہ تھی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

''وہ انشائیں جو اس وقت کی طرز تحریر کے موافق لکھی گئی ہیں انہیں طلبہ کو دیکھنے کا حکم دیجئے، اردو عبارت اور مضمون لکھنے کی مشق کرایئے، اگرچہ کوئی اصلاح نہ دے تو لکھتے لکھتے خود ہی مشاق ہو جائیں گے۔''

خطابت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''ہر ماہ میں کم از کم دو مرتبہ ان سے بیان کرایئے، بیان میں آپ قلم و دوات اور کاغذ لے بیٹھئے، اور جس طالب علم سے جو غلطی لائق اظہار ہو اسی وقت لکھ لیجئے، اور وہ بیان کر چکے یا سب بیان کر چکیں اس وقت کھڑے ہوں اور جس نے لائق تعریف بیان کیا ہے اس کی تعریف اور جس نے غلطی کی ہے اس کی غلطی کا اظہار کر دیجئے، بغیر اس کے ان سے بیان کرانا کم نفع دے گا، اس کی بھی تاکید کیجئے کہ بآواز بلند بیان کریں، اس پر زور دیجئے کہ جو لکھ کر پڑھیں وہ ٹٹول ٹٹول کر نہ پڑھیں اس طرح پڑھیں کہ گویا زبانی پڑھتے ہیں۔''

توازن واعتدال

توازن واعتدال خط میں ہر جگہ نمایاں ہے، عربی ادب کے ساتھ جس کا ذکر آگے آرہا ہے اردو ادب کا خیال اور اس کی اہمیت کا احساس مولانا کو ہمیشہ رہا، اپنے رفقاء اور مسترشدین کو بارہا اس بات کی تاکید کی کہ وہ اردو میں عربی کے ثقیل الفاظ اور نامانوس ترکیبوں سے اجتناب کریں اور صاف وسادہ اسلوب اختیار کریں جو موثر اور دل نشیں ہو، اس کے ساتھ خوشنویسی اور املا کی صحت کی بہت تاکید کی ہے۔

ان سب باتوں میں ایک خاص بات جو نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ مولانا نے الفاظ کو بہت ناپ تول کے استعمال کیا ہے۔ جس چیز کی جتنی اہمیت تھی اس کو وہ اس سے زیادہ اہمیت دینے

کے روادار نہیں ہوئے، وہ ان ذہین، عبقری اور یک رخ انسانوں سے جدا اور بالا نظر آتے ہیں جو جب کسی چیز کی حمایت اور تائید پر اتر آتے ہیں تو دوسرے تمام پہلوؤں کو یک قلم فراموش کر دیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک شعبہ کو اپنے تدبر، ذہانت، اور فکری بلندی سے مالا مال کر دیتے ہیں، لیکن اور دوسرے شعبے (جو بعض اوقات اس سے کہیں زیادہ اہم ہوتے ہیں) ان کی ادنیٰ توجہ بھی حاصل نہیں کر پاتے، اور وہاں ان کی ساری عقل و ذہانت بے سود ثابت ہوتی ہے، لیکن مولانا ایک معتدل مزاج، سلیم الذہن اور متوازن انسان کی طرح اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ کوئی اہم اور ضروری پہلو ان کی دسترس سے باہر نہ رہ سکے۔ اور بغیر کسی بخل یا اسراف، مبالغہ، یا تنگ دلی کے اس کو پورا پورا حق ملے۔

علوم قرآن اور ادب عربی

دینیات اور قرآن مجید کی اہمیت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ''ابتدائی درجہ میں دینیات کا بہت خیال رکھئے، نصاب میں عمدہ کتابیں ہوں، عقائد کا بیان عمدگی سے تعلیم کیا جائے، مگر اس طرح کہ نئی تعلیم کے مناسب ہو، قرآن مجید کی طرف زیادہ توجہ رہے، ایسا ضرور کیجئے کہ ابتدائی درجہ کا طالب علم قرآن مجید کے ترجمہ سے عاری نہ رہے، قرآن شریف کی تعلیم میں تین امور کا لحاظ بہت ضروری ہے۔''

اول۔ یہ کہ حسب معمول اکثر مفسرین نسخ پر زور نہ دیا جائے، جہاں تک ممکن ہو آیات قرآنی کو نسخ سے بچایا جائے، اتقان میں بیس آیات کو منسوخ لکھا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے پانچ یا تین آیات کو، اور صدیق حسن خاں صاحب نے اپنے رسالہ ''افادۃ الشیوخ'' میں اسکو اچھا بیان کیا ہے۔

دوم۔ مطلب بیان کرتے وقت اس کا بہت خیال رہے کہ قرآن مجید کے الفاظ سے اس قدر معلوم ہوتا ہے اور یہ مضمون مفسرین نے روایت وغیرہ سے زیادہ کیا ہے، اکثر اس کا خیال نہیں رہتا، مضمون زائد اس قدر مشہور ہو گیا ہے کہ بے تامل قرآن شریف کی طرف سے اسے منسوب کرتے ہیں، بہت خیال کرنے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کا یہ

مضمون نہیں ہے۔

سوم، قرآن مجید کے الفاظ اور کیا عجب کہ کل مشترک المعنی ہوں، اس پر پہلے آپ غور کرلیں اور پھر طلبہ کو اس تنبہ کرتے رہیں، اور وہ معنی بتائیں جو بلا تاویل بنتے ہوں اور اس پر کسی قسم کا اعتراض نہ ہوتا ہو، مثلاً: مکروا ومکر اللہ، نسوا اللہ فأنساھم، اب مکر اور انسا کے معنی کئی ہیں مجھے اس وقت یاد نہیں رہے، بعض معنی ایسے ہیں کہ وہ شبہ جو مکر و انسا کی نسبت اللہ کی طرف کرنے میں ہوتا ہے وہ بالکل نہیں ہوتا، اور بلا تاویل معنی بنتے ہیں، اور اس معنی کو سند کلام عرب سے بھی تلاش کیجئے، مولوی محمد فاروق صاحب سے بھی اس میں مشورہ کرلیا کیجئے۔"

قرآن مجید کے لئے خاص انعام

دوسری جگہ مولانا نے انعامات کے لئے لکھا ہے کہ:۔

"مختلف موضوعات پر طلبہ تقریر کریں اور کامیاب ہونے والوں کو انعامات دیئے جائیں، لیکن قرآن مجید اور فقہ کو ترجیح دی جائے، اور یہ مشورہ دیا ہے کہ اس کے لئے "خاص انعام" رکھا جائے"۔

تجوید کا بھی بڑا اہتمام تھا، لکھتے ہیں:۔

"قرأت کی طرف خاص توجہ رکھئے، آپ کو خیال ہو یا نہ ہو کہ حافظ واجد (۱) کے پڑھنے نے کیسا عمدہ اثر ڈالا، اب اگر ہر سال یہی ایک حافظ سے سنوایئے تو بڑا اثر ہوگا، غرض اور بھی ایسے پیدا ہوں۔"

عربی ادب پر عبور اور تحریر و تقریر کی مشق کا مولانا کو ابتداء سے خیال تھا، اس خط میں ایک مدرس کی خصوصیات بیان کرتے وقت یہ بات بڑی اہمیت کے ساتھ لکھی ہے کہ:۔ ان کو اس کا تجربہ ہے، اور انہوں نے مختصر عرصہ میں عربی بولنے اور قرآن مجید کے ترجمہ کی مشق طلبہ کو کرادی ہے۔"

ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

---

(۱) ندوہ کے ایک طالبعلم واجد علی نے سالانہ اجلاس عظیم آباد میں کئی بار چند آیات کی تلاش کی، اور اس کو لوگوں نے غیر معمولی طور پر پسند کیا۔ یہاں تک کہ بعض اشخاص وارفتہ اور بےخود ہوگئے۔

''طلبہ کو سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور یاد ہو''

آخر میں عنان قلم ہاتھ سے لے کر دل کو دے دی ہے، لکھتے ہیں:۔

یہ کام (ندوۃ العلماء) خدا کے فضل سے قائم ہوا، اور بظاہر میرے نام لگایا گیا، اب اگر چہ بہت دل چاہتا ہے کہ دل توڑ کر اس کی خدمت کروں اور ندوۃ العلماء کو اور اس کے دار العلوم کو چلا کر دکھادوں، اور اس میں فنا ہو جاؤں، مگر ضعف جسمانی، اور قصور ہمت دونوں اس کے مانع ہیں، دل میں اس کی آرزو ہے کہ۔

مردے از غیب بروں آید وکارے بکند

خدا کا ہزار شکر ہے کہ مولوی عبدالحی صاحب اور آپ میرے گمان میں انہیں مردان غیب میں سے ہیں جن سے یہ عظیم الشان کام چلنے کی امید ہے، اللہ تعالیٰ آپ دونوں کی عمر اور صلاح وفلاح میں ترقی دے!''۔

آگے لکھتے ہیں:۔

''عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ہاتھوں سے اس جہاز کو پار لگائے اور یہ عظیم الشان فتح آپ ہی کے کارنامہ میں لکھی جائے'' (۱)

مولانا کا پہلا سفر حج

بچپن سے ہی مولانا کو حج وزیارت کی تمنا تھی، اوائل عمر ہی میں ایک مرتبہ گھر بار فروخت کر کے متعلقین کے ساتھ حج کا ارادہ کر لیا تھا، لیکن:۔

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب

کے اصول پر یہ تمنا اس وقت پوری نہ ہو سکی، اور شاید اسی میں خدا کی کوئی مصلحت پوشیدہ تھی۔

۱۵ ر شعبان ۱۳۱۸ھ کو کانپور سے روانہ ہو کر مونگیر پہونچے، تقریباً ایک ماہ وہاں قیام رہا، رفقاء سفر میں ایک خادم عبدالسمیع، مولانا بشارت حسین دربھنگوی، مولانا نور محمد پنجابی اور مولوی غلام حسین تھے۔

---

(۱) مجموعہ خطوط قلمی

سامانِ توکل

اار رمضان ۱۳۱۸ھ کو مونگیر سے روانگی ہوئی اور وہ بھی اس بے سروسامانی کے ساتھ کہ پانچ آدمی ہمراہ ہیں اور زادِ سفر صرف چالیس روپیہ ہے اور کسی کو سفر کی اطلاع بھی نہیں، طرفہ تماشا یہ کہ بعض رؤسائے مونگیر نے یہ اطلاع دی کہ کلکٹر کی طرف سے اس سال حج کی ممانعت ہوگئی ہے، لیکن ان سب دشواریوں اور موانع کی پرواہ کیئے بغیر انہوں نے روانگی کا فیصلہ کرلیا۔

صاحب ''کمالات'' لکھتے ہیں کہ:۔

''ایک شخص چاٹگام سے آیا ہوا تھا، اس نے حال دریافت کر کے کہا کہ میرا بھی قصدِ حج بیت اللہ شریف کا تھا، اور اسی ارادہ سے چاٹگام گیا تھا مگر قرنطینہ میں نہیں لیا گیا اور واپس کر دیا گیا، صرف ایک جہاز جائے گا، اور اس قدر آدمی کثرت سے ہوگئے ہیں کہ اب جو جاتا ہے واپس کر دیا جاتا ہے۔''

آپ نے فرمایا کہ:۔

''جب وہاں سے واپس کر دیئے جائیں گے تو چلے آئیں گے۔''

کانپور میں چونکہ طاعون کا زور تھا اس لئے وہ راستہ اختیار نہ کیا بلکہ ''گوالندوہ' ہوتے ہوئے چاٹگام پہونچے، ریل سے اترتے ہی لوگوں نے بیان کیا کہ:۔

''اب حج کے جانے والے نہیں لئے جاتے، آپ کا آنا بے موقع ہوا''۔

آپ نے شب کو وہاں قیام کیا اور دوسرے دن قرنطینہ کے مقام پر پہونچے، خدا کی قدرت کا یہ نمونہ ہوا کہ دو ہزار آدمی واپس کر دیئے گئے تھے، مگر جس روز آپ تشریف لے گئے اس روز حجاج کو لینے کا سرکاری حکم ہوا۔(۱)

۲۲ر شعبان کو عصر کے وقت قرنطینہ میں داخل ہوئے، جو جگہ مولانا کو ملی، وہ انتہائی تنگ اور تکلیف دہ تھی، پھوس کا ایک سائبان تھا جس میں ۵۰، ۶۰ آدمیوں کی گنجائش تھی اور ان میں بیشتر بنگالی تھے، لیکن ایک رات اور ایک دن قیام رہا کہ اس سے بہتر جگہ مل گئی۔

---

(۱) کمالات محمدیہ: ۲۸۷

استغراق اور بے ہوشی

سائبان میں مستقل شور و ہنگامہ اور جگہ کی تنگی کے باعث مولانا کو سخت اضطراب اور قلبی اذیت تھی، لیکن قدرت کی طرف سے کچھ ایسا انتظام ہوا کہ اس رات اور دن کا بڑا حصہ بھی خلوت ہی میں گزرا۔ صاحب ''کمالات'' لکھتے ہیں کہ:۔

''عشاء کی نماز کسی قاری نے بلند آواز سے اور خوش الحانی کے ساتھ تلاوت کی، آپ اس کو سنتے ہی از خود رفتہ ہو گئے، پہلے گریہ شروع ہوا، اس کے بعد کامل بے ہوشی ہو گئی، اس کامل بے ہوشی میں عجیب و غریب بات یہ ہوئی کہ عشاء کی نماز پورے طور پر پڑھی۔ آپ کے ہمراہی حضرات بیان کرتے ہیں کہ آپ نے عشاء کی نماز نہیں پڑھی تھی کہ بے ہوشی طاری ہوئی، اس بے ہوشی میں کسی وقت گریہ ہوتا تھا کسی وقت سکوت، کسی وقت کچھ کلام کی نوبت آتی، جب گریہ میں کچھ کمی ہوئی تو آپ نے دریافت فرمایا کہ:۔ ہم نے عشاء کی نماز پڑھی یا نہیں؟ لوگوں نے کہا کہ:۔ نہیں پڑھی۔ آپ نے وضو کیا اور جماعت کے ساتھ فرض پڑھے، اور سنت و وتر سب بخوبی پڑھی، ہمراہی دیکھتے رہے، بعد نماز پھر وہی گریہ اور کبھی سکوت رہا، آدھی رات تک اسی حالت میں آپ بیٹھے رہے پھر لیٹ گئے، دوسرے روز دوپہر تک یہ حالت رہی، مگر ارشاد فرماتے ہیں کہ صبح کو اٹھنے کے بعد ایسی بے ہوشی نہیں تھی جیسی شب کو رہی تھی، سہ پہر کو وہاں کا داروغہ غالباً اس کا نام ولی اللہ تھا، آیا، اور اس نے کہا کہ یہاں آپ کو تکلیف ہوگی دوسرے مقام پر آپ تشریف لے چلیں، وہ ایسے مقام پر لے گیا جہاں شور و غل کا نشان نہ تھا، سائبان نہایت وسیع تھا اور اس کے سامنے کشادہ صحن۔''

چاٹگام میں رجوع عام

اب لوگوں کی آمد و رفت شروع ہوئی، افسر قرنطینہ ایک بنگالی ڈاکٹر تھا، لوگ اس کی خوشامدیں کرتے تھے کہ ہمیں اندر جانے کی اجازت دیجئے، (۱) بہر حال کسی نہ کسی طرح کوشش کر کے لوگ حاضر ہوئے اور بیعت سے مشرف ہوتے، خاص طور پر طالب علم احاطہ

(۱) کمالات محمدیہ: ۲۸۷

کے باہر اجازت کے انتظار میں دو دو تین تین گھنٹے منڈلایا کرتے۔ لوگوں کے ہجوم سے ڈاکٹر عاجز آ گیا اور کہنے لگا کہ ہم نے کیوں ایسا شخص کو اندر لے لیا جس نے ہم کو پریشان کر دیا۔ اس نے کہا کہ خلاف قانون ہم اجازت نہیں دے سکتے، البتہ اگر کوئی تم کو پکڑ لائے گا تو ہم چھوڑ دیں گے۔ غرض کہ جو لوگ کیمپ کے کسی ملازم سے رابطہ رکھتے تھے یا کسی کی سفارش لاتے تھے وہ اندر جا کر ملاقات کرتے تھے، اور اکثر بیعت سے مشرف ہوتے تھے، یہاں تک کہ اطراف چٹگام سے بھی اکثر لوگ آئے اور بیعت سے سرفراز ہوئے۔ (۱)

لوگ بیعت کی درخواست کرتے تھے اور آپ ٹالنے کی کوشش کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بھائی اس کیمپ میں اور بھی کئی عالم ہیں، میں بھی ایک ملا ہوں، مجھ میں کون سی بات تم لوگوں نے دیکھی کہ اتنی دور سے آتے ہو اور مرید ہونا چاہتے ہو؟ اس کے جواب میں وہ کہتے تھے کہ ہم زیادہ نہیں جانتے، تمام اطراف میں یہ غل ہے کہ ہندوستان کے ایک بڑے بزرگ مولانا تشریف لائے ہیں۔ حضرات کے ہمراہ تین عالم تھے۔ جب کوئی مسئلہ دریافت کرتا تو حضرت ان کی طرف اشارہ کر کے فرماتے کہ یہ بڑے عالم ہیں، ان سے دریافت کرو۔ یہ سب کچھ ہوتا مگر لوگ آپ ہی پر نثار ہوتے تھے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ اگر آپ ۱۰، ۱۵ روز شہر میں قیام فرمائیں تو اس وقت دو تہائی اہل شہر دست مبارک پر بیعت کریں۔ (۲)

مولانا کا جہاز ۴ رشوال کو عدن پہونچا، اپنے ایک مسترشد میاں خدا بخش کو ان کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

> ''تمہارا خط قرنطینہ چاٹگام میں پہونچا تھا۔ وصیت کے خواہاں ہو، جو کچھ پہلے بتایا گیا ہے اس پر عمل کرو، وہی نجات کے لئے کافی ہے، اس وقت یہ کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے کسی وقت غافل نہ رہو۔ ہاتھ سے کام کرو، آنکھ سے سب کچھ دیکھو، مگر دل اسی کی طرف رہے، اور اس پر عمل ہو۔
>
> جان جائے تو بلا سے پر تر ادھیان نہ جائے
>
> اللہ بس باقی ہوس اس وقت جہاز عدن پہونچا، الحمد للہ ہم یہاں تک نہایت لطف سے پہونچے۔'' (۳)

---

(۱) کمالات محمدیہ: ۲۸۷ (۲) کمالات محمدیہ: ۲۴۱ (۳) ایضاً

خدا کی شان دیکھئے کہ ۴۰؍روپیہ اور پانچ افراد کو ساتھ لے کر حج کو چلے، اور اس بے سروسامانی کے باوجود پورا سفر آرام سے طے ہوا، بلکہ وہ اطمینان قلب اور سکون حاصل تھا جو دولت مندوں کو گھر پر بھی نہ ملتا ہوگا۔

۱۱؍شوال کو مکہ معظّمہ پہونچے۔ ایک خط میں اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

''۱۱؍رمضان شریف کو جہاز پر سوار ہوا، اور نہایت احترام سے ۱۱؍شوال کو مکہ معظّمہ پہونچا، خدا کے فضل وکرم سے عجیب وغریب واقعات راہ میں پیش آتے رہے، یہاں بیت اللہ کے قریب مکان کرایہ پر لیا ہے، سترہ روپیہ کرایہ ہے، نہایت آرام سے بسر ہو رہی ہے، جب تک سرکار کہیں نہیں آنا ہوگا۔'' (۱)

ندوہ کی یاد

مولاناؒ کو حجاز کے دوران قیام میں ندوہ کو جتنی فکر تھی اس کا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے جو مولانا سید عبدالحیؒ کے نام انہوں نے مکہ معظّمہ سے لکھے ہیں، وہ اس کی جزئیات کا جس اہتمام سے ذکر کرتے ہیں، اور اس کی ترقی کی جو عملی صورتیں تجویز کرتے ہیں اس سے ان کے اس تعلق خاطر پر روشنی پڑتی ہے۔

حجاز پہونچ کر قدرتی طور پر مولانا کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر یہاں کوئی عالم ندوہ میں درس وتدریس کے لئے مل سکے تو اس سے طلبہ میں ادبی ذوق پیدا کرنے میں بڑی سہولت اور مدد حاصل ہوگی، مولانا نے اس بات کا بہت ہی اہتمام کے ساتھ اپنے خط میں ذکر کیا ہے۔

ندوہ کی مخالفت میں جن فتوؤں اور اشتہارات ورسائل کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا، اس کے سد باب کے لئے مولانا یہ چاہتے تھے کہ علماء حرمین کا کوئی فتوی حاصل کیا جائے، اور ہندوستان میں اس کی اشاعت ہو۔

شریف مکہ کو ندوہ کا سرپرست بنانے کا خیال بھی مولانا کے دل میں آیا تھا، اس کے متعلق بھی مولانا عبدالحی سے استصواب رائے کیا ہے۔

---

(۱) کمالات محمدیہ: ۲۴۱

۱۲/ذی الحجہ کو مکہ مکرمہ سے مولانا عبدالحی کو جو پہلا خط لکھا گیا ہے اس میں مولانا نے ان سب امور پر روشنی ڈالی ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

''یہاں آنے کے بعد ایسی حالت رہی، اور ہے، کہ کوئی کام نہیں ہوسکتا بجز خیال ونظارۂ بیت اللہ کے، ضروری امور یہ لکھنا ہیں کہ ایک عالم مغربی جنہیں یہاں کے شریف نے بلایا تھا مگر بعض امور ایسے پیش آئے کہ وہ یہاں خوش نہیں ہیں، ہندوستان جانا پسند کرتے ہیں، جوان عالم ہیں اور تقریر زور کی ہوتی ہے، بعض سبق پڑھاتے دیکھا، بہت خوب پڑھاتے ہیں، علوم ادبیہ اچھے جانتے ہیں، اگر دارالعلوم میں رکھے جائیں تو بہت مناسب ہے، مدرسہ کی وقعت بھی ہوگی اور کام بھی چلے گا، میرے نزدیک اگر بعض خاص سبق ان کے متعلق ہوں اور املا کریں تو بہت ہی مناسب ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تحقیق مسائل خوب بیان کریں گے مگر عربی میں کریں گے، اس وجہ سے عربی بولنا بھی آئے گا، ہمیں مشورہ کرکے جلد اطلاع دیجئے، دوسرے یہ کہ شریف مکہ کو اگر سرپرست ندوہ کو کیا جائے تو کوئی نقص تو نہ ہوگا، اگر مناسب ہو تو سعی کی جائے، اس سے مخالفین تو دب جائیں گے اور علماء حرمین کا ایک فتویٰ بھی تیار ہوسکے گا۔ تیسرے یہ کہ ایک مصری عالم آئے ہیں شیخ علی حربی، بڑے خلیق اور بڑی لیکچرر اور واعظ وصوفی ہیں، مصر میں جو مجلس ''مکارم اخلاق'' کی قائم ہوئی ہے، اس کے رکن ہیں، اتفاق بین المسلمین کے بڑے خواہاں ہیں اور اس کے ساعی ہیں، دو وعظ میں نے سنے، عجیب خوش بیان شخص ہے، بے تکلف ایسی فصیح عربی مسجع بولتا ہے کہ سبحان اللہ! مجھ سے بہت ہی محبت کرتے ہیں، انہیں رکن اعزازی میں داخل کیجئے اور ان سے خط وکتابت رکھئے، اگر روئداد طبع ہوئی ہو تو ان کے نام سے کیجئے۔''(۱)

مولانا کو اس خط کے جواب کا انتظار بھی دشوار معلوم ہوا، چنانچہ تین ہی روز کے بعد ایک اور خط لکھتے ہیں جو زیادہ تر انہیں مضامین پر مشتمل ہے۔ مولانا سید عبدالحی کا ایک خط ان کو ملا تھا، لیکن وہ ان کے خط کے جواب میں نہ تھا اس لئے لکھنے کا تقاضا اور شدید ہوگیا، لکھتے ہیں:۔

''حج تو ہوگیا، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے آمین! آپ کے کہنے کی تعمیل بھی ہوئی،

---

(۱) مجموعہ خطوط قلمی بنام مولانا سید عبدالحیؒ

یعنی عرفات پر جبل رحمت کے قریب بالتخصیص آپ کے لئے دعا کی، اور بظاہر وہ اچھی حالت تھی مگر مجھ سے سیہ کار کی دعا کیا، مگر:۔

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا

ابھی نہ آنے کو دل چاہتا ہے اور نہ سامان ہے، بہر حال سرکارؐ جب رخصت کردیں، انہیں کے مہمان ہیں اگر چہ نالائق ہیں، سیہ کار ہیں۔ جب میں بیت اللہ کے قریب اول روز پہونچا تو یہ شعر زبان سے بے اختیار نکلا۔

نہ لائق در پہ آنے کے نہ قابل منہ دکھانے کے
امید مغفرت لے کر ترے دربار میں آئے

اس کے بعد مغربی عالم کے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔
ان کو ندوہ بلایئے، غالباً سو روپیہ ماہوار پر آسکیں....
آخر میں لکھتے ہیں کہ:۔
کلکتہ میں جلسہ ہو تو چاٹگام وغیرہ واعظ بھیجیں، چاٹگام میں بہت لوگ جان گئے ہیں۔" (۱)

استنبول سے ایک خط

مکہ مکرمہ پہونچنے کے کچھ ہی عرصہ کے بعد مولانا کو استنبول سے ایک دعوت نامہ ملا، یہ حسن آفندی کا خط تھا جو بدرالدین طیب جی جج بمبئی ہائی کورٹ کے سالے ہیں، اس خط میں انہوں نے مولانا کو استنبول تشریف آوری اور خلیفۃ المسلمین سے ملاقات کی دعوت دی تھی، اور مولانا بھی ندوہ کے مفاد کے پیش نظر اس سفر پر کچھ آمادہ تھے، چنانچہ ایک خط مورخہ ۲۶/ذالحجہ میں مولانا کو سید عبدالحی کو لکھتے ہیں:۔

"میرے یہاں آنے کی اطلاع استنبول میں ہوئی، اور ایک صاحب نے خط طلبی کا لکھا، یہ شخص حسن آفندی، بدرالدین طیب جی (جو بمبئی ہائی کورٹ کے جج ہیں) کے سالے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ اگر آنے کا صرف پاس ہو، تو خلیفۃ المسلمین سے ضرور ملو، دل چاہتا ہے مگر صرف نہیں ہے، آپ کی کیا رائے ہے، اگر ملاقات ہوئی تو ندوہ کا مالی فائدہ ہونے کی امید ہے۔" (۲)

---

(۱) مجموعۂ مکاتیب قلمی بنام مولانا سید عبدالحیؒ (۲) مجموعہ مخطوط قلمی

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفر غالباً مالی دشواریوں کے پیش نظر نہ ہو سکا۔

نائب سلطان کی ارادت وعقیدت

سلطان عبدالحمید خاں کی طرف سے عبدالرحمٰن پاشا نائب سلطان کی حیثیت سے حج کے لئے آتے تھے۔ ایک مہاجر مکی نے اپنے مکان پر ایک جلسہ منعقد کیا اور تقریر کے لئے شیخ علی حربی کو جو مصر کے ایک جید عالم اور بہترین مقرر تھے، مدعو کیا، مولانا بھی مدعو تھے اور جلسہ میں تشریف رکھتے تھے۔ اس تقریب میں پاشا سے مولانا کا تعارف ہوا، اس کے بعد پاشا نے مولانا کو مدعو کیا، اور اپنے خلوص وعقیدت کا اظہار کیا، اور دمشق وقسطنطنیہ کے سفر کی دعوت دی۔ مصنف ''کمالات'' نے اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ قلمبند کیا ہے، لکھتے ہیں:۔

''اس جلسہ میں پاشا بھی مدعو تھے جو سلطان المعظم غازی عبدالحمید خاں کی طرف سے حرمین ہر سال آتے ہیں اور پانچ ہزار فوج ان کے ہمراہ ہوتی ہے، صاحب جلسہ نے وعظ ختم ہونے کے بعد ترکی زبان میں ان سے کچھ بات کی، اس کے بعد وہ پاشا ہمارے حضرتؒ کی طرف مخاطب ہوئے اور عربی زبان میں کہا کہ آپ ہماری دعوت قبول فرمائیں تو ہمیں بہت فخر ہوگا، پھر یہ بھی کہا کہ ہماری پوری مسرت تو اس وقت ہوگی کہ آپ دمشق آئیں او ہم آپ کا استقبال کریں، اور اپنے مکان لے جائیں اور وہاں سے قسطنطنیہ آپ کو لے جائیں، اس کے بعد آپ نے دعوت قبول کی اور دوسرے روز شب کو ان کی فرودگاہ پر تشریف لے گئے، پاشا نہایت اعزاز واکرام سے آپ کو لے گیا، اور نہایت ہی اعزازی مقام پر آپ کو بٹھایا، سنا گیا ہے کہ معززین ترکوں کی نشست کا کمرہ وسیع ہوتا ہے اور عرض کی جانب اس میں چبوترہ ہوتا ہے، اس پر بہت عمدہ گدے اور تکیے لگے ہوتے ہیں اور باقی کمرہ میں تین طرف کرسیاں ہوتی ہیں، چبوترہ پر مجلس کا سردار بیٹھتا ہے اور سب لوگ کرسی پر چبوترہ کے سامنے! پاشا موصوف نے حضرتؒ کو چبوترہ پر بٹھایا اور آپ چھوٹی کرسی پر حضرتؒ کے روبرو بیٹھے اور کہا کہ اس وقت آپ نے مجھے

بڑی عزت دی۔ پھر وہی جملہ کہا جو پہلی ملاقات میں کہا تھا یعنی یہ کہ پوری عزت مجھے اس وقت ہو جب آپ دمشق تشریف لائیں اور ہم استقبال کریں اور پھر آپ کو قسطنطنیہ لے جائیں، آپ نے اس کا جواب کچھ نہ دیا، دعوت کے بعد پاشا نے ایک کورٹ و عمامہ نذر کیا جس کو خلعت سلطانی کہنا چاہیئے۔ آپ تشریف لے آئے اور پھر کسی وقت اس ملاقات کا خیال نہ فرمایا۔'' (۱)

مدینۂ طیبہ جاتے وقت اس نے خواہش کی کہ ہمارے اونٹوں پر ہمارے ہمراہ چلیں، ہر قسم کی عافیت ہوگی، مگر آپ نے منظور نہ فرمایا۔ (۲)

امیر مکہ کا خط اور اعانت کی درخواست

اسی زمانہ میں امیر مکہ شریف عون الرفیق کے ساتھیوں نے خواہش کی کہ مولانا امیر مکہ سے ملاقات کریں لیکن وہ تیار نہیں ہوئے، اس کے کچھ عرصہ کے بعد ان کو امیر مکہ کا ایک خط موصول ہوا، اس خط میں امیر نے مولانا کو تاج العلماء الکرام وخلاصۃ ذوی المجد والاحترام جیسے بلند الفاظ سے خطاب کیا ہے۔ اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ حجاز میں مولانا کو کس درجہ مقبولیت اور شہرت حاصل تھی، اور وہاں ان کو کتنی عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

سلطان عبدالحمید خاں کا ارادہ تھا کہ جدہ سے مکہ مکرمہ، مدینۂ منورہ اور پھر وہاں سے شام تک ریلوے لائن قائم کی جائے، اس زبردست منصوبہ کے لئے کثیر سرمایہ کی ضرورت تھی، امیر نے اس خط میں بڑی صراحت کے ساتھ مالی امداد کی اپیل کی ہے، اور مولانا سے درخواست کی ہے کہ وہ اپنے اثر و رسوخ کے ذریعہ اس کار خیر میں تعاون کریں، ان کو کیا خبر تھی کہ اس فقیر منعم کے پاس حجاز سے واپسی تک کے لئے روپیہ نہ تھا لیکن دل اللہ نے اتنا غنی عطا فرمایا تھا کہ امراء اور رؤساء بھی اعانت کے خواستگار تھے۔ اقبال نے بالکل صحیح کہا ہے:۔

اپنے مالک کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک
اور پہچانے تو پھر تیرے گدا دارا و جم

---

(۱) کمالات محمدیہ: ۱۰۵ و ۱۰۶ (۲) کمالات: ۱۰۶۔

یہ خط جمادی الاولی ۱۳۱۸ھ کا تحریر کردہ ہے، اور اس کو مصنف ''کمالات'' نے پورا نقل کیا ہے۔(۱)

لارڈ مکڈانل کی مولانا شبلیؒ سے بدگمانی

۱۹۰۰ء کا آغاز تھا کہ لارڈ انٹونی مکڈانل جو صوبہ متحدہ اودھ کے لفٹنٹ گورنر تھے اور مسلمانوں پر ان کی خاص ''نظر عنایت'' تھی، مولانا شبلی سے بدگمان ہو گئے، اور ساتھ ہی ان کو منشی اطہر علی صاحب کاکوروی سے بھی انجمن تعلقہ داران اودھ کے بعض پیچیدہ معاملات کے سلسلہ میں کچھ بدگمانی پیدا ہوگئی، اس بدگمانی اور ناراضگی کا اثر جو ابتدا میں ان دونوں شخصیتوں تک محدود تھا، قدرتی طور پر ندوہ تک پہونچا۔ اس بات کا بعض عاقبت اندیش حضرات پر اتنا اثر پڑا کہ انہوں نے نہ صرف کہ یہ صوبہ بلکہ برطانی ہندوستان کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ اس جملہ کی توضیح یہ ہے کہ مولانا شبلی اور منشی اطہر علی دونوں حیدرآباد چلے گئے، اور لارڈ مکڈانل کے تبادلہ سے پہلے واپس نہ ہوئے۔

حیات شبلی کے مصنف نے مولانا کے اس سفر کے اسباب کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ:۔

> ''ممکن ہے کہ اس سفر کی عجلت اور حیدرآباد کے انتخاب کے مشورہ میں بعض سیاسی اسباب سے (جن کا اشارہ اوپر گزر چکا ہے) برطانی ہند سے دور جانے کی مصلحت بھی شامل ہو۔''

مولانا محمد علی نے اس زمانہ میں حجاز میں تھے اور مولانا عبدالحق حقانی قائم مقام ناظم کی حیثیت سے کام کررہے تھے، لیکن ایک ہی سال کے بعد ۱۹ر فروری ۱۹۰۰ء کو انہوں نے اپنا استعفیٰ دہلی سے بھیج دیا اور لکھا کہ میں اپنی بعض ضروریات خانگی کی وجہ سے خدمت نظامت کی بخوبی انجام دینے سے قاصر ہوں۔

مخالفین کی شورش، حکومت کے عتاب اور مولانا محمد علی کی غیر موجودگی کے بعد یہ داخلی

---

(۱) نقل میں صحت کا پورا لحاظ نہیں رکھا جاسکا، کئی جگہ بیاض بھی چھوٹی ہوئی ہے، تاریخ کی جگہ جمادی الاولی ۱۳۱۰ھ لکھا ہے، جو ظاہر ہے غلط ہے۔ مولانا کا پہلا سفر حج جیسا کہ خود ''مولف کمالات'' نے دوسری جگہ تصریح کی ہے ۱۸ھ کو ہوا۔

انتشار اور کمزوری ندوہ کے لئے ایک ضرب کاری تھی جس سے سنبھلنا آسان نہ تھا، اس وقت ندوہ کا بار گراں صرف چار آدمیوں کے کاندھوں پر پڑ گیا جو حسب ذیل ہیں:۔

(۱) مولانا سید عبدالحی

(۲) مولانا مسیح الزماں

(۳) مولانا خلیل الرحمٰن سہارنپوری

(۴) منشی احتشام علی صاحب

ندوہ کو اس وقت جو سنگین خطرات درپیش تھے، اس کے پیش نظر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر یہ چار حضرات اس نازک گھڑی میں اس کی خدمت کے لئے ہر طرح آمادہ و مستعد نہ ہوتے، تو ندوہ کب کا ختم ہو چکا ہوتا۔

اجلاس ششم منعقدہ کلکتہ، شعبان ۱۳۱۹ھ دسمبر ۱۹۰۱ء

اختلاف و انتشار اور بدگمانی و غلط فہمی کی اس فضا میں ندوہ کا اجلاس ششم دسمبر ۱۹۰۱ء کو کلکتہ میں منعقد ہوا، مخالفت کا جو سلسلہ اجلاس بریلی سے شروع ہوا تھا اس نے اس مرتبہ بھی زور پکڑ لیا تھا، معمولی معمولی جملوں اور محاوروں پر نکتہ چینی اور نزاع لفظی کا جو مزاج قدم میں پیدا ہو گیا تھا، اس کی وجہ سے ندوہ کی سالانہ جلسوں کی تقریروں پر ''مشق سخن'' جاری تھی مزید یہ ہوا کہ ان مخالفین کی طرف سے واعظ اور مبلغ پورے علاقہ میں پھیلا دئے گئے تھے جو ہر شخص سے اس قسم کی بات کرتے تھے جس سے وہ ندوہ سے بدگمان ہو۔

سورتی تاجروں سے کہتے تھے کہ ندوہ کے ارکان وہابی ہیں، پیروں کو نہیں مانتے، علماء اور ارکان مدرسہ عالیہ کہتے تھے کہ یہ سب نیچری ہیں، جلسہ صرف اس غرض سے کرتے ہیں کہ مذہبی تعلیم کی بیخ کنی کی جائے اور یہاں بھی مدرسہ عالیہ پر حملہ کرنے آئے ہیں، نئے خیال والوں سے کہتے تھے کہ ندوۃ العلماء مسلمانوں کو مغربی علوم و فنون سے ہٹا کر قول واقول میں پھنسانا چاہتے ہیں، احناف سے کہتے تھے کہ ندوۃ العلماء نے لوگوں کو تقلید کی قید و بند سے آزاد کرنے کے لئے یہ سوانگ کھڑا کیا ہے۔(۱)

---

(۱) روئداد جلسہ امرتسر:۲۴

ان اعتراضات اور فتنہ پردازیوں کی وہ شورش تو اب نہ تھی جو کچھ عرصہ پیشتر نظر آئی تھی، لیکن اس کا سلسلہ بند نہیں ہوا تھا، اجلاس ششم کی روئداد میں اصل روئداد سے پہلے ایک ورق علیحدہ سے لگایا گیا تھا جس میں یہ اعلان درج تھا کہ:۔

''روئداد ان تمام کارروائی کا مجموعہ ہے جو جلسہ سالانہ میں ہوتی ہے، یہ تو نہ کوئی فقہ کی کتاب ہے نہ عقائد کی جس سے عام اہل اسلام کوئی مسئلہ یا کوئی عقیدہ استنباط کریں، اہل حق کو لازم ہے بحق اسلام از روئے دین و دیانت اس کلام کے ایسے معنی نکالیں اور بیان کریں جو صحیح اور حق ہوں''۔

اس تحریر سے وہ جھنجھلاہٹ اور دشواری صاف ظاہر ہو رہی ہے جس کا اہل ندوہ شکار تھے، حقیقت یہ ہے کہ یہ بڑا نازک، دشوار گزار، اور ہمت شکن مرحلہ تھا اور ندوہ کی تاریخ میں ان حضرات کا نام سنہرے حروف میں لکھا جائے گا جو اس آڑے وقت میں کسی ملامت اور کسی تنقید اور مذمت کی پرواہ کئے بغیر اس مقدس فرض کی ادائیگی میں دل و جان سے مشغول رہے۔

کلکتہ میں ان مخالفین نے فضا کو خراب کرنے کی خوب کوشش کی، مولانا حجاز تشریف رکھنے کے باوجود اس کے لئے بیحد متفکر اور مضطرب تھے، مولا سید عبدالحیؒ کو ایک خط مورخہ ۲/ ذی الحجہ ۱۳۱۸ھ میں لکھی:۔

''کمال الارشاد (۱) کو شائع کیجئے، کلکتہ میں جو مخالفین برا اثر ڈال رہے ہیں ان کے لئے بہت مفید ہوگا، ایک رسالہ صرف انکے جھوٹ اور فریب میں شائع کر دیا جائے تو انکا اثر بہت کم ہو جائے گا''۔(۲)

ان مخالفین نے علماء حرمین سے جو فتوی حاصل کئے تھے، اس کے متعلق مولانا لکھتے ہیں:۔

''فتوی پر جن کی مہریں ہیں وہ معتبرین کی نہیں ہیں، بلکہ اکثر بے علموں کی ہیں، اگر آپ ایک عمدہ تمہید زیادہ کر کے شائع کر دیں تو بھی مفید ہوگا''۔(۳)

---

(۱) غالباً ارشاد الکملاء مراد ہے، پہلے اس کا نام کمال الارشاد تجویز کیا گیا ہوگا۔ (۲) مجموعہ مکاتیب قلمی۔
(۳) مجموعہ مکاتیب قلمی۔

مخالفین کے ساتھ مولاناؒ کا رویہ

مولانا کا خیال تھا کہ مخالفین کی کوششوں سے بے توجہی اور بے پرواہی درست نہیں، بلکہ معقول طور پر اس کا تشفی بخش جواب دینا چاہئے، ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

''میری رائے اول سے یہ ہے کہ مخالفین کی کوششوں سے ایسی بے توجہی نہیں چاہئے جیسی سید احمد خاں نے اپنی مخالفین سے کی۔ انھوں نے تو گورنمنٹ کو ہمراہ بنا کر اپنا کام نکالا، آپ کے ساتھ گورنمنٹ نہیں ہوسکتی، اور عوام مالدار کچھ گورنمنٹ کی خوف سے کچھ مخالفین کی سعی سے علیحدہ ہو جائیں گے، اور ہو رہے ہیں، ان کے جھوٹ فریب کا اور اپنے اصلی مدعا کا عمدہ پیرایہ میں اظہار ضروری ہے''۔(۱)

خدا کی مشیت ایسی ہوئی کہ اس مخالفین سے ندوہ کو یک گونہ فائدہ ہی ہوا، تجارت پیشہ اور مالدار طبقہ جس کو برگشتہ کرنے کیلئے یہ لوگ خصوصیت سے کوشاں تھے، ندوہ سے واقف ہو گیا، اور اس کے دل میں اس کا جذبہ پیدا ہوا کہ اس اہم ادارہ سے واقفیت حاصل کی جائے جس کی مخالفت اس شدومد سے کی جا رہی ہے۔

اس جلسہ میں مولانا شبلی شریک نہیں ہو سکے، لیکن انھوں نے معذرت کا خط لکھا اور اعلان کیا کہ آئندہ اجلاس میں وہ ضرور شریک ہونگے۔

مولانا کی واپسی، علالت اور کلکتہ حاضری

انعقاد جلسہ سے دو تین ماہ قبل غالبًا جمادی الاولیٰ ۱۳۱۹ھ میں مولانا کی حجاز سے واپسی ہوئی اور مونگیر میں قیام پذیر ہوئے اور جلسہ سے (جو شعبان ۱۳۱۹ھ میں منعقد ہوا) چندروز پیشتر انکو درد گردہ کا شدید دورہ تھا (یہ مولانا کا پرانا مرض تھا اور کبھی کبھی اس کے دورے ہوا کرتے تھے اور اس سے ضعف میں بہت اضافہ ہو جاتا تھا) لیکن اس کے باوجود مولانا کلکتہ تشریف لائے، نتیجہ یہ ہوا کہ اس سفر کی زحمتوں اور تکان کی وجہ سے ضعف اتنا بڑھ گیا کہ آخر کار جلسہ میں شرکت نہ کرسکے، مولانا سید عبدالحی نے حسب معمول رپورٹ پڑھ کر سنائی۔

---

(۱) مجموعہ مکاتیب قلمی۔

تیسرے اجلاس میں دارالعلوم کی رپورٹ مولانا حفیظ اللہ نے پیش کی، جواس زمانہ میں دارالعلوم کے مہتمم تھے، (یادرہے کہ درمیان میں مولانا فاروق چریاکوٹی مہتمم ہوگئے تھے)۔

ندوۃ العلماء کی دستورالعمل کی ترمیم وتنسیخ کیلئے اٹھارہ ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی گئی، اس کا مقصد یہ بیان کیا گیا کہ جدید ضرورتوں کے لحاظ سے اس دستورالعمل میں ترمیم واضافہ کی ضرورت سمجھی گئی، اس لئے یہ قدم اٹھایا گیا، اس مجلس میں ندوہ کے جوممتاز ترین اراکین شامل تھے، ان میں مولانا شبلی کا بھی نام نظر آتا ہے۔

طلبہ کا امتحان

اس جلسہ میں بھی طلبہ کا امتحان لیا گیا اور پہلے سے کہیں زیادہ سخت مولانا ابوالخیر صدیق پروفیسر پریسیڈنسی کالج کلکتہ نے عربی کی ایک عبارت ترجمہ کرنے کیلئے دی، طلبہ نے اس کا ترجمہ بہت خوبی سے کیا، اس سے زیادہ مشکل مسئلہ یہ تھا کہ ایک فارسی رباعی اور ایک شعر بامحاورہ عربی میں ترجمہ کرنے کیلئے دیا گیا، اردو شعر یہ تھا۔

کلیم دیکھو تو جب بھی غش تھے پڑے ہوئے تھے ہزاروں پردے
ہم ان کی آنکھوں کے ہائے صدقے کہ جلوہ یوں بے حجاب دیکھا

جن لوگوں کو ترجمہ کے کام سے کچھ واستہ رہا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اشعار کا بامحاورہ ترجمہ کس قدر مشکل کام ہے، لیکن ندوہ کے ان جواں ہمت اور ذہین طلبہ نے بہت آسانی کے ساتھ اور بہت جلد اس کا ترجہ کر کے دیدیا اور اچھا ترجمہ کیا۔

تقسیم انعامات

اجلاس چہارم میں امتحان کی محفل پھر گرم ہوئی، حدیث وتفسیر کے متعلق سوالات کئے گئے اور اس کے بعد انعامات تقسیم ہوئے، طلبہ کو طلائی اور نقرئی تمغے پیش کئے گئے۔

اس اجلاس میں شیخ عبدالقادر نے ایک تقریر کی اور اس میں لارڈ مکڈانل کے شکوک و شبہات پر روشنی ڈالتے ہوئے اس پر حیرت کا اظہار کیا۔

دوسری تقریروں کے بعد یہ جلسہ ختم ہوا، میزبانوں میں سے بعض حضرات زاروقطار

رو رہے تھے، اور یہ شعر پڑھ رہے تھے

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم وبہار آخر شد

لکھنؤ میں طاعون اور دارالعلوم کی منتقلی

۱۹۰۲ء میں لکھنؤ میں طاعون کا حملہ ہوا اور اس کا اثر یہ پڑا کہ دارالعلوم کے طلبہ بہت تیزی کے ساتھ گھر واپس جانے لگے، چونکہ نیا سال شروع ہوا تھا اس لئے دارالعلوم بند کر دینا مناسب نہ ہوا، شیخ مشیر حسین صاحب تعلقہ دار گدیہ نے پیش کی کہ مدرسہ ان کے مکان میں جو اسٹیشن بادشاہ نگر کے متصل سڑک پر واقع ہے، منتقل ہو جائے۔

۲۲/ذی قعدہ ۱۳۲۰ھ کو دارالعلوم وہاں منتقل ہو گیا، اور ڈھائی ماہ کے بعد دوبارہ لکھنؤ اپنی جگہ آ گیا، موسم گرما اور مکانات کی قلت کی وجہ سے طلبہ کو جو تکلیف پہونچ رہی تھی اس کے پیش نظر مجلس انتظامیہ کے بیشتر اراکین نے یہ رائے دی کہ مدرسہ کو شاہ جہاں پور منتقل کر دیا جائے لیکن آخر میں یہ تجویز ہوئی کہ لکھنؤ کے ذمہ دار حضرات اس کی ذمہ داری قبول کریں، اور اس کے اخراجات اور تعمیر دارالعلوم کے لئے سرمایہ فراہم کریں، ایک مدت تک یہ موضوع زیر بحث رہا اور ۱۷/شعبان ۱۳۲۱ھ کو منشی اطہر علی صاحب کو دارالعلوم کا معتمد بنایا گیا، اور یہی فیصلہ ہو کہ دارالعلوم لکھنؤ میں رہے۔

نئے درجوں کا افتتاح

شوال ۱۳۱۹ھ/فروری ۱۹۰۲ء میں دارالعلوم کا چوتھا درجہ متوسط سال اول کے نام سے کھلا، اس کے بعد سال دوم کی منظوری ہوئی۔ ان درجوں کے افتتاح کے ساتھ نصاب کے مسائل بھی بڑھے .... ۱۳۱۹ھ میں اس کام کیلئے ایک خاص مجلس کی تشکیل کر دی گئی، جس میں مولانا محمد فاروق چریا کوٹی اور مولانا عبداللہ ٹونکی جیسے تجربہ کار حضرات شامل تھے، اس مجلس کے معتمد مولانا حبیب الرحمان خاں شروانیؒ بنائے گئے۔

۱۔ مجموعۂ مکاتیب قلمی۔

انگریزی سکنڈ لینگو یج

اس زمانہ میں سکنڈ لینگو یج کی حیثیت سے انگریزی کا ایک کلاس کھول دیا گیا، اور اس خدمت کے لئے انگریزی کے ایک مدرس کا تقرر بھی عمل میں آ گیا۔

۱۶ / ربیع الثانی ۱۳۲۰ھ کو مجلس انتظامیہ کا جلسہ ہوا، اور ضروری امور کے علاوہ ''الندوہ'' کی ادارت کا مسئلہ طے کیا، مولانا حبیب الرحمان کا خاں شروانی اس کے مرتب بنائے گئے، اور مولانا سید عبدالحیؒ ان کے مشیر اور شریک کار۔

گورنمنٹ کے رویے میں تبدیلی کے آثار

نواب وقارالملک بہادر نے لفٹننٹ گورنر ممالک متحدہ آگرہ و اودھ سے ۱۴/ مارچ ۱۹۰۲ء کو علی گڑھ میں ملاقات کی اور ندوۃ العلماء کے صحیح حالات سے ان کو باخبر کیا، انھوں نے یہ سن کر کہا کہ ''مجھ کو کسی کی طرف سے کوئی شبہ نہیں'' کلکتہ کے سالانہ اجلاس میں بھی متعدد اہم سرکاری شخصیتیں موجود تھیں اور ان کے سامنے بات کھل کر آ گئی تھی، اس کے علاوہ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ لارڈ مکڈانل جو اپنے کو مسلمانوں کی قسمت کا مالک سمجھ بیٹھے تھے یہاں سے جا چکے تھے، بدگمانیوں کی فضا کسی قدر صاف ہو چکی تھی، اور ندوۃ العلماء کی طرف سے بھی اس کا بار بار اعلان کیا جا چکا تھا، کہ وہ صرف ایک تعلیمی ادارہ ہے جس کو سیاسیات سے متعلق کوئی سروکار نہیں، اس لئے گورنمنٹ کے خلاف کسی سازش یا انتشار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دفتر ندوہ شاہجہاں پور میں

شاہجہاں پور میں ندوہ کیلئے ایک خاص جائداد وقف تھی اور اسکے انتظام کی کوئی معقول صورت نہ تھی، اس لئے دفتر ندوۃ العلماء شاہجہاں پور منتقل ہو گیا، اس وقت مولانا مسیح الزماں خاں نائب ناظم تھے۔

اجلاس امرتسر اور مولانا شبلیؒ کی آمد

رجب ۱۳۲۰ھ مطابق اکتوبر ۱۹۰۲ء میں امرتسر میں ندوہ کا نواں اجلاس منعقد ہوا،

مولانا شبلی بھی شریک ہوئے، انھوں نے جب اپنا فارسی ترکیب بند پڑھا تو سامعین ہمہ تن گوش تھے:

اے کہ پرسی چہ کسانیم و چہ ساماں داریم   آنچہ باہیچ نیرزو نجہاں آں داریم

مولانا شروانی نے اپنی تقریر میں مفصل طور پر ندوۃ العلماء کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی، عوام کے شکوک وشبہات کو رفع کیا، اور مخالفین کے اعتراضات کے جواب دیے۔

۸رجب کو پانچویں نشست میں مولانا شبلی نے ندوۃ العلماء کی ضرورت پر تقریر کی، مولانا چاہتے تھے کہ صرف اسی پر اکتفا کریں، لیکن حاضرین کے اصرار پر ختم نبوت پر بھی تقریر کی۔(۱) یہ تقریر مولانا کی بہت خاص اور ممتاز تقریروں میں تھی، روداد ندوہ میں اس تقریر کا ذکر ان الفاظ کے ساتھ کیا گیا ہے "یہ تقریر اس قابل تھی کہ حرفاً حرفاً قلم بند کی جاتی مگر باوجود کوشش کے نہیں ہوسکی، افسوس ہے کہ اب تک اردو میں آواز نویسی Pecording کا طریقہ ایجاد نہیں ہوا، اس وجہ سے ایسی دل آویز تقریریں اس وقت تک کیلئے ہوتی ہیں جب تک کہ وہ آواز کانوں میں گونجتی رہے"۔(۲)

مجلس نصاب میں مولانا شبلیؒ کا انتخاب

۱۵ربیع الثانی ۱۳۲۰ھ کو جس مجلس نصاب کی تشکیل کی گئی تھی، اس میں مولانا شبلی کا نام نہ تھا (مولانا شبلی اس زمانے میں حیدرآباد میں تھے) اس بات کا مولانا کو بہت احساس تھا، انھوں نے جو خطوط اس زمانے میں مولانا شروانی کو لکھے ہیں اس میں اس بات کا اظہار کیا ہے (۳)، اجلاس امرتسر کے دوسرے ہی روز مجلس انتظامیہ نے اس مجلس میں مولانا کا بھی انتخاب کرلیا۔

اجلاس مدراس اور مفاہمت کی آخری کوشش

۱۳۲۱ھ کے آغاز میں مدراس میں بھی ندوۃ العلماء کی ایک شاخ قائم ہوگئی اور شہر

---

(۱) قادیانیت نے اس زمانے میں خاصی قوت حاصل کرلی تھی اور بہار پراس کا خاص حملہ تھا اور بعض اچھے سمجھدار لوگ اس سے متاثر ہونے لگے تھے۔ (۲) روداد اجلاس امرتسر ص ۱۰۸ (۳) تفصیل کے لئے دیکھئے حیات شبلی ص ۲۸۸

کے سر برآوردہ حضرات اور عمائد نے اس کی ممبری قبول کی، لیکن چند علماء ایسے بھی تھے جنھوں نہ صرف ان کی ممبری قبول کرنے سے انکار کیا بلکہ اس کی مخالفت شروع کر دی، جب مدراس میں ندوہ کا اجلاس طے پایا تو ندوہ کا ایک وفد اس لئے مدراس روانہ کیا گیا کہ وہ ندوہ کے تخیل اور مقاصد کی اشاعت کرے اور مخالفت کے شدباب کی کوئی تدبیر سوچے، اس مخالفت نے اتنا زور پکڑ لیا کہ وفد نے اضلاع کے دورے منسوخ کر کے صرف شہر مدراس میں اپنی کوششیں مرکوز کر دیں۔

مولانا محمد علیؒ کا سفر مدراس

مولانا محمد علی حالات کی نزاکت کے پیش نظر خود سفر پر مجبور ہوئے اور ۳؍شوال ۱۳۲۱ھ کو ندوہ کے اور ارکان کے ساتھ مدراس کے سفر پر روانہ ہوئے۔ اگرچہ مولانا اجلاس مدراس سے کچھ عرصہ پیشتر ہی نظامت سے مستعفی ہو چکے تھے، (۱) لیکن ندوہ سے ان کے تعلق اور محبت میں ذرہ برابر فرق نہ آیا تھا، معین الندوہ کے ارکان نے اسٹیشن پر مولانا کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا، ابتداء کے دو چار روز تو بہت سکون کے ساتھ گزرے، مختلف مقامات پر جلسے منعقد ہوئے، مخالفین کی طرف سے ان جلسوں کو درہم برہم کرنے کوئی کوشش نہیں کی گئی اور نہ کوئی خاص شورش یا سرگرمی نظر آئی، لیکن اس کے بعد مخالفت نے پھر زور پکڑا اور شہر کا ایک حصہ اس سے متاثر ہو گیا، حد یہ ہے کہ ان مخالفین نے پروپگنڈہ اور افترا پردازی سے آگے بڑھ کر خشت باری اور فوجداری شروع کر دی، ان کی کوشش یہ تھی کہ ارکان ندوہ خوف و ہراس میں آ کر شہر چھوڑ دیں، لیکن مولانا اور ان کے ساتھیوں نے اس کی کچھ پرواہ کئے بغیر اپنا کام جاری رکھا۔

ندوہ کا یہ دسواں اجلاس ۱۴/۱۵/۱۶؍شوال ۱۳۲۱ھ ۳/۴/۵؍جون ۱۹۰۴ء کو اسپرنکس گارڈن واقع میتنام پیٹھ مدراس میں ہوا، جہاں اس سے قبل کانگریس کمیٹی کا سالانہ جلسہ ہوا تھا، اس وسیع پنڈال میں حوض کے ایک وسیع قطعہ کو چھوڑ کر سات ہزار آدمی کرسیوں پر

(۱) مولانا نے استعفیٰ ضرور دیا تھا لیکن وہ رسمی طور پر ابھی منظور نہیں ہوا تھا اور نہ کسی ناظم کا انتخاب عمل میں آیا تھا، اس کی تفصیل مولانا محمد علی اور مولانا شبلی کے عنوان کے ماتحت آگے آئے گی۔

بیٹھ سکتے تھے، مولانا ابو محمد عبدالحق صاحب دہلوی کا نام صدارت کے لئے پیش کیا گیا، وہ کرسی صدارت پر رونق افروز ہوئے اور ایک گھنٹے تک ندوہ کے اغراض ومقاصد کی وضاحت کی اور ان شبہات کا ازالہ کیا جو ندوہ کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو رہے تھے۔

مولانا عبدالحی نے گزشتہ سال کی رپورٹ ناظم کی طرف سے پیش کی اور تمہید بیان کرتے ہوئے کہا کہ یہ پہلا موقع ہے کہ شمالی ہند کے علماء ومشائخ کی ایک جماعت مدراس میں مجتمع ہوئی ہے اور مدراس کے علماء ومشائخ کا ایک گروہ کثیر رونق افروز ہے، یقین ہے کہ آپ کو اس بات کے باور کرنے میں کچھ تامل نہ ہوگا یہ ندوۃ العلماء کی برکت ہے کہ اس نے شمال وجنوب کے علماء کو ایک جگہ فراہم کردیا ہے۔ اس کے بعد مولانا نے بہت متوازن الفاظ میں ندوۃ العلماء کے قیام ونشونما اور عروج وارتقاء کی مختصر تاریخ پیش کی جس کو پڑھ کر ندوۃ العلماء کی جیتی جاگتی تصویر نگاہوں کے سامنے پھر جاتی ہے، ندوۃ العلماء کے مقصد اور نصب العین کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے مولانا نے اس کو پانچ حصوں پر تقسیم کردیا:

۱۔ ترقی تعلیم
۲۔ ترقی تعلیم کی اصلاح
۳۔ رفع نزاع باہمی
۴۔ درستی اخلاق
۵۔ مسلمانوں کی بہبودی عام

پھر اس کے بعد ان پانچوں نکات کی ایسی جامع اور یقین آفریں تشریح کی کہ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی اس میں وہی تازگی، صداقت اور واقعیت معلوم ہوتی ہے، اور لکھنے والے کی دقت نظر اور اصابت رائے کا معترف ہونا پڑتا ہے۔

ندوہ کے اجلاس نہم منعقدہ امرتسر میں ایک تجویز انسداد رسوم قبیحہ کے سلسلے میں منظور ہوئی تھی، اس کے متعلق اعداد وشمار پیش کرتے ہوئے مولانا نے بتایا کہ اس سال ۲۴ رعلماء

کرام نے ۶۱ جگہ پر مندرجہ بالا تجویز عمل میں لانے کے لئے کوششیں فرمائیں اور لوگوں لوگوں سے عہد و پیمان لئے اور وقتاً فوقتاً نگرانی فرمائی، بعض حضرات نے بہت زیادہ توجہ فرمائی اور بعض نے کم، مگر الحمدللہ یہ کوششیں بے سود نہیں رہیں۔

مثال کے طور پر مروان کے پیر احمد شاہ نے جن کا حلقہ اثر بہت وسیع تھا، اس علاقہ کے تمام خواتین اور سر برآوردہ لوگوں سے عہد و پیمان لیا، صرف ایک رئیس نے عہد شکنی کی لیکن ان کو بھی تائب ہو کر پیر صاحب سے معافی مانگنی پڑی، متعدد واقعات ایسے ہوئے کہ بہت سے حوصلہ منداشخاص نے وہ رقوم جو رسوم وتقریبات پر بیجا صرف کی جاتی تھیں اسلامی اداروں اور انجمنوں کو پیش کر دیں، اس کے علاوہ ندوہ کے وکلاء اور مبلغین نے مختلف علاقوں کا دورہ کر کے بڑا کام کیا، قائم گنج کے قریب ضلع فرخ آباد کے ایک گاؤں مسلمان صریح بت پرستی میں مبتلا تھے، ان وفود کی کوششوں سے انھوں نے توبہ کی اور بتوں کو توڑ کر پھینک دیا۔

اس جلسہ میں آسٹریلیا کے مسٹر چارلس شیورائٹ نے جن کا اسلامی نام محمد عبد الحق ہے، انگریزی میں تقریر کی اور اپنے قبول اسلام کے اسباب میں بیان کیے، سر عبدالقادر نے ان کا اردو میں ترجمہ کیا۔

مولانا شاہ سلیمانؒ نے اس جلسہ میں تصوف پر ایک بہت مؤثر تقریر کی، خود بھی رو رہے تھے اور دوسروں کو بھی رلا رہے تھے، آخر میں کہہ کر تقریر ختم کی کہ حضرات اب حوش وحواس درست نہیں جو کہنا ہوگا پھر کبھی کہوں گا۔

خواجہ حسن نظامیؒ کی دلچسپ تقریر

ان کے بعد خواجہ حسن نظامی کھڑے ہوئے، انھوں نے کہا کہ آج ایک گالی نامہ شائع ہوا ہے اور اس میں نام بنام شرکائے ندوۃ العلماء کو گالیاں دی گئی ہیں، میں سمجھتا تھا کہ ان میں میرا بھی نام ہوگا مگر باوجود تلاش کے نہیں ملا، مجھ کو اپنی اس بے نصیبی پر حسرت ہوئی۔ لہٰذا میں دو روپیہ چندہ کی رکنیت کے طور پر پیش کرتا ہوں تاکہ میرا نام اگر اس وجہ سے چھوڑ دیا گیا ہے کہ میں ندوہ کا رکن نہیں ہوں تو اب شامل کر لیا جائے۔

۵/جنوری کو جلسہ انتظامیہ میں مولانا شبلیؒ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اکثر تجاویز کے محرک وہی رہے۔

مولاناؒ کے استعفیٰ کی توثیق

اس تاریخ کی صبح کو مولانا عبدالحق حقانیؒ نے تجویز کے طور پر مولانا محمد علیؒ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ مستعفی ہو گئے ہیں، یہ جلسہ ان کا استعفیٰ منظور کرتا ہے اور مولانا مسیح الزماں کی نظامت کو تین سال کیلئے منظور کرتا ہے۔

۶/جنوری کو جلسہ کی صدارت مولانا شبلیؒ نے کی اور سر عبدالقادر کے بعد دارالعلوم کی ضرورت پر تقریر کی، مولانا نے صرف عنوانات قلم بند کئے تھے اور اس کی روشنی میں تقریر کر رہے تھے، تقریر کے بعد مولانا نے تجویز پیش کی کہ دارالعلوم کا ایک کمرہ صرف علماء کے چندے سے تعمیر کیا جائے، چنانچہ اسی وقت اس سلسلہ میں کچھ رقم بھی جمع ہو گئی۔

مدراس کے جلسہ سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مولانا شبلی کو مولانا محمد علی اور مولانا سید عبد الحی اور دوسرے ارکان سے دو بدو گفتگو کرنے کا موقع ملا اور باہمی غلط فہمیاں دور ہوئیں، (۱) مولانا شبلی کا نام "الندوہ" کے ایڈیٹروں میں تو جلسہ سے دو ماہ قبل شامل ہو گیا تھا، (۲) اور اس کی وجہ سے فضا کسی قدر خوش گوار ہو چکی تھی، اس ملاقات اور بالمشافہ گفتگو سے بدگمانیوں کی بدلیاں چھٹ گئیں اور ماحول کی کہر آلود صبح شعاع امید سے ایک بار پھر جگمگا اٹھی۔ (۳)

مولانا محمد علیؒ اور مولانا شبلیؒ

مولانا محمد علیؒ نے ارکان کے اختلافات اور باہمی کشمکش سے دل برداشتہ ہو کر نیز اپنی مسلسل علالت اور ضعف کے پیش نظر کئی مرتبہ استعفیٰ دینے کوشش کی لیکن ارکان انتظامیہ کے شدید اصرار کی وجہ سے ہمیشہ استعفیٰ واپس لینے پر مجبور ہوئے۔ لیکن ۱۳۲۱ھ میں آخر کار ان کا استعفیٰ منظور کر لیا گیا۔

---

(۱) حیات شبلی، ص ۳۹۷ (۲) حیات شبلی میں ہے کہ مولانا کا نام اس وقت ایڈیٹروں میں شامل کیا گیا حالانکہ یہ بات درست نہیں۔ (۳) افسوس یہ کہ یہ مصالحت زیادہ دیر تک ثابت نہ ہو سکی اور اختلافات کی بنیادیں (جن کا ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا) بدستور مستحکم رہیں، اسی کے ساتھ ندوۃ العلماء نے ترقی کے بہت سے مراحل طے کئے جن کی تفصیل اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے۔

ان وجوہ کو سمجھنے کیلئے ان کے اور مولانا شبلی کے تعلقات اور ارکان ندوہ کے رویہ اور طرز عمل پر ایک نظر ڈالنا ناگزیر ہے، اس کے بغیر صحیح صورت حال سے ہم بخوبی واقف نہیں ہوسکتے۔

مولانا محمد علی کی مولانا شبلی سے ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ ندوہ کی اجلاس میں شرکت کیلئے کانپور آئے، ان کے ادبی وتاریخی ذوق اور علمی وتحقیقی مزاج کے پیش نظر مولانا نے ندوہ کیلئے ان کو بہت مفید سمجھا، ان کی بہت گرم جوشی کے ساتھ پذیرائی کی، اور مولانا سید عبدالحیؒ کے الفاظ میں ''ان کی دلجوئی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا'' بعض افکار وخیالات کیوجہ سے علماء واہل دین کا ایک طبقہ ان کو پسند نہیں کرتا تھا، اور وہ اس کے لئے تقریباً اجنبی تھے، مولانا نے یہ کوشش کی کہ وہ طبقہ علماء سے قریب ہوسکیں، اور علماء کو ان سے جو وحشت ہے وہ ختم ہو، اس غرض سے انھوں نے ندوۃ العلماء کے جلسوں میں ان کو تقریر کرنے اور اپنے خیالات کا اظہار کرنے کا موقع فراہم کیا۔

سب سے پہلے جن لوگوں کو مولانا شبلی سے اختلاف پیدا ہوا، ان میں مولانا محمد حسین الہ آبادی، اور مولانا عبدالحق حقانی تھے، ان کا خیال تھا کہ مولانا شبلی میں کچھ ایسی جارحانہ کمزوریاں ہیں جن کی موجودگی میں ان سے تعاون بہت دشوار ہے، ان کمزوریوں کو وہ ''ضرورت سے زائد احساس برتری'' سے تعبیر کرتے تھے، انھوں نے مختلف مواقع پر (جیسا کہ مولانا سید عبد الحی کی لکھی ہوئی ایک تحریر سے پتہ چلتا ہے) مولانا محمد علیؒ سے اس مسئلہ پر گفتگو کی اور انکو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ان حالات میں مولانا شبلی سے زیادہ عرصہ تک تعاون نہ ممکن ہے نہ سودمند مصالحت کی صرف ایک صورت ہے، اور وہ یہ کہ ان کے طرز فکر اور پالیسی کو قبول کرلیا جائے، اس وقت یہ اختلاف اور کشمکش قدرتی طور پر ختم ہوجائیگی لیکن ندوہ کے تخیل اور نصب العین کو جو روحانیت اور وسیع النظری، ایمانی کیفیات اور جدید معلومات کی دوستونوں پر قائم ہے، نقصان پہونچے گا، اور اسکا یہ نازک توازن برقرار نہیں رہ سکے گا۔

مولانا محمد علیؒ کا خیال یہ تھا کہ دنیا کا کوئی شخص بھی کمزوریوں سے خالی نہیں ہے، دانش مندی اور مصلحت شناسی کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کی امن کمزوریوں کو حتی الامکان نظر انداز کیا جائے اور خوبیوں سے فائدہ اٹھایا جائے، دارالعلوم کے ایک مدرس کے سلسلہ میں (جن

سے بعض لوگوں کو اختلاف تھا) مولانا نے اپنے اس رائے اور طرزِ عمل کا اظہار کیا ہے، مولانا عبدالطیف اور مولانا سید عبدالحیؒ کو ایک مشترکہ خط میں (جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں گزرا ہے) لکھتے ہیں:۔

''چونکہ کام کے آدمی کمیاب کیا گویا نایاب ہیں، اس لئے میں نے جس میں کوئی کمال دیکھا اس حیثیت سے اس کی قدر کی، اور یہ چاہا کہ اس سے مستفید ہونا چاہیئے، اب اگر اس کے ساتھ نقص بھی اس میں ہے تو اس فکر میں رہا کہ اس نقص کی مضرت سے بچ کر اس کی خوبی سے فائدہ اٹھانا چاہیئے، اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ایسا کوئی شخص نظر نہیں پڑا جس میں وہ خوبی ہو اور نقص نہ ہو، میرے نزدیک بغیر اس تحمل کے کام نہیں چل سکتا''۔(۱)

یہ رائے مولاناؒ نے اگرچہ ایک دوسرے موقع پر ظاہر کی تھی، لیکن اس سے ان کے رویہ اور طرزِ عمل پر پوری روشنی پڑتی ہے۔ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اگر کسی شخص میں ذرا بھی صلاحیت ہے اور وہ کسی شعبہ میں مفید ہوسکتا ہے تو اس کے دوسرے کمزور پہلوؤں سے چشم پوشی کرتے ہوئے اس صلاحیت اور خوبی کا کھلے دل سے اعتراف کرنا چاہیئے، اور جس اعزاز اور رتبہ کا وہ مستحق ہے ویسا ہی اس سے معاملہ کرنا چاہیئے، اس خیال کے تحت مولانا نے ان کے ساتھ اپنا رویہ بہت اچھا رکھا، اکثر اوقات وہ ان کی رائے کو ترجیح دیتے اور مختلف طریقوں سے ان کو ندوہ سے زیادہ سے زیادہ قریب کرنے کی کوشش کرتے، مولانا محمد حسین الہٰ آبادی اسی بنیاد پر ندوہ سے علیٰحدہ ہو گئے، مولانا عبدالحق حقانی ساتھ رہے، لیکن انکو وہ دلچسپی باقی نہ رہی جو پہلے تھی۔

ادھر مولانا شبلیؒ نے اس طرزِ عمل کو جو سراسر اخلاص و محبت پر مبنی تھا، کمزوری اور ان کی شخصیت سے ناجائز فائدہ اٹھانے پر محمول کیا، اور باوجود یہ کہ مولانا ان کی رائے کو اکثر اوقات اپنے دوسرے رفقاء کی رائے پر ترجیح دیتے تھے، اور انکے مشوروں کو پوری توجہ سے سنتے تھے، انھوں نے یہ سمجھا کہ ان کو ندوہ کے تعارف کے لئے آلہ ناشر الصوت کی حیثیت سے استعمال کیا جارہا ہے اور اس سے زیادہ ان کی کوئی قیمت اور افادیت نہیں۔

(۱) مجموعہ خطوط قلمی

ان کی غلط فہمی میں ایک اور چیز سے مدد ملی۔

ندوہ میں آمد سے پہلے مولانا محمڈن کالج علی گڑھ میں استاذ تھے، ان کی اصلاحی سرگرمیوں اور عملی جدوجہد کا باقاعدہ آغاز ندوہ کے پہلے اجلاس سے ہوا، جب وہ ایک مفکر اور مصلح اجتماعی کی حیثیت سے پبلک کے سامنے آئے۔(۱)

مولانا محمد علی چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں انکے متعلق جو غلط فہمیاں ہیں وہ رفع ہوں، اس لئے کہ اس کے بغیر وہ نہ ندوۃ العلماء کیلئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں، نہ مسلمانوں کو کوئی نفع پہونچا سکتے ہیں، ندوۃ العلماء کے جلسوں میں شرکت اور اس کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی وجہ سے یہ بات حاصل ہوئی، بڑی حد تک یہ غلط فہمیاں دور ہوئیں، بہت سے لوگ ان سے متاثر ہوئے، اور اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہوئے، اہل علم نے ان کی ذہانت، علمی و ادبی ذوق، اور فکری صلاحیتوں کی قدر کی لیکن اس سے مولانا کے اندر اپنی اہمیت کا احساس پیدا ہو گیا، اور انکو ارباب ندوہ سے یہ شکایت رہنے لگی کہ وہ ان سے محض نقارچی کا کام لینا چاہتے ہیں اور انکی شخصیت اور اثرات سے غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں، اس بنیادی غلط فہمی کا اظہار مولانا کے ایک خط سے پوری طرح ہوتا ہے جو انھوں نے ۱۹۰۲ء میں مولانا شروانی کو لکھا، اس کے صرف ایک جملہ میں پوری داستان پوشیدہ ہے اور سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ اس جملہ کا پس منظر کیا ہے لکھتے ہیں:۔

> ''مجھ کو اب ندوہ سے معاف کر دیجئے، مجھ سے صرف نقارچی کا کام لینا مقصود ہے تو اور بھی بہت سے لوگ ہیں، افسوس ہے کہ ہم مسلمانوں کے قلوب کی یہ کیفیت رہ گئی ہے''۔(۲)

لیکن آخر کار یہ اختلاف جس کی بنیادیں اور جڑیں پہلے سے موجود تھیں، بڑھنا شروع ہوا، ان اختلافات کا تجزیہ کیا جائے تو اس کو تین چیزوں میں سمیٹا جا سکتا ہے۔

---

(۱) اس سے قبل اعظم گڈھ اور علی گڈھ میں ترکوں کی اعانت کے سلسلہ میں چندہ اور اس طرح کے کچھ اور قومی کام مولانا نے شروع کیے تھے، لیکن ایک داعی اور مصلح کی حیثیت سے ان کی شہرت ندوہ کے ساتھ شروع ہوئی۔

(۲) حیات شبلی، ص ۳۸۸

۱۔ ذہنی ساخت اور مزاج کا اختلاف

۲۔ ماحول اور تربیت کا اختلاف

۳۔ تخیل اور طرز فکر کا اختلاف

پہلی نظر میں یہ تجزیہ کچھ عجیب اور مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ ان اختلافات کے پیچھے یہ ساری چیزیں کارفرما تھیں اور یہی وہ جڑیں تھیں جن سے اختلافات کا اتنا بڑا تناور درخت کھڑا ہو گیا۔

یہ اور بات ہے کہ تعلقات کی اس کشیدگی اور ابتری کا فوری اور قریبی سبب مزاج ہی کا اختلاف تھا ورنہ ہو سکتا تھا کہ اس معاملہ میں کچھ تاخیر ہوتی یا حالات کوئی اور رخ اختیار کر لیتے۔

جہاں تک مزاج کا اختلاف کا تعلق ہے مولانا کا مزاج تیز تھا اور اس کی شہادت ہر وہ شخص دے گا جس نے مولانا کے ان خطوط کا مطالعہ کیا ہے جو مولانا محمد علیؒ، مولانا شروانیؒ، مولانا سید عبدالحیؒ کو یا اور دوسرے متعلق اصحاب کو انہوں نے وقتاً فوقتاً لکھے ہیں۔ ان کے قریبی جاننے والوں نے بھی ان کی زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں اور عادات پر روشنی ڈالی ہے، جس سے ان کے مزاج اور ذہنی ساخت کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ لیکن شاید یہی خصوصیات تھیں جو آگے چل کر ان کی اولوالعزمی و حوصلہ مندی، حمیت دینی اور عزت قومی کی شکل میں ظاہر ہوئیں۔ مسلمانوں کے دینی شعائر و مسلمات کے مسئلہ میں ان کی دلسوزی اور سعی پیہم جنگ بلقان کے شہداء و مظلومیت کے لئے ان کی بے چینی و بے آرامی، مستشرقین اور دشمنان دین کی ریشہ دوانیوں کے مقابلہ کے لئے ان کی ہمہ وقت آمادگی اور اس طرح کی اور دوسری چیزیں اس کی روشن مثالیں ہیں۔

مولانا محمد علیؒ اس کے بالکل دوسرے سرے پر تھے، بچپن میں ان کا یہ حال تھا کہ خاندان کے بعض بزرگ کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے غصہ ان میں رکھا ہی نہیں، مولانا شاہ کرامت علیؒ نے جن سے مولانا آغاز جوانی میں تربیت حاصل کی تھی، مولانا کو صبر و تحمل کی خاص وصیت کی تھی اور مولانا اس پر سختی سے کاربند تھے۔ (۱) اور اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ

---

(۱) کمالات محمدیہ، ص ۱۴۱

مولانا اتنے طویل عرصہ تک ان کے ساتھ نباہ کرتے رہے۔

۲۔ جہاں تک ماحول اور تربیت کا تعلق ہے، مولانا محمد علی اور مولانا شبلی میں بڑا اختلاف نظر آتا ہے۔ مولانا شبلی کی ذہنی وفکری نشو ونما اور ارتقاء میں علی گڑھ کا خاصا حصہ ہے، وہ آرنلڈ کے شاگرد تھے، سرسید کے خیالات وافکار سے باوجود اختلاف کے متاثر تھے، علماء ومشائخ سے ان کو وہ تعلق نہیں تھا جو مولانا محمد علیؒ کو تھا اور باوجود اس کے کہ وہ علی گڑھ کے مفید اور مضر رجحانات میں پوری تمیز رکھتے تھے لیکن بہرحال بشریت سے خالی نہ تھے، اس متلاطم سمندر میں رہ کر تر دامن نہ ہونا اور اس یک طرفہ ماحول میں قلب اور عقل کے حدود وامتیازات کو ملحوظ رکھنا اور روحانی خلا کا احساس ان کے لئے قدرتی طور پر دشوار تھا، جس منزل پر وہ اپنی آخری عمر میں پہونچے تھے اور جس نے ان کو سیرت رسولؐ کی طرف متوجہ کیا تھا وہ منزل اس وقت ان سے بہت دور تھی۔

دوسری طرف مولانا محمد علی ہیں جن کو کمسنی ہی سے اہل دل ومشائخ وقت کی جستجو تھی اور جنہوں نے فضل رحمٰن گنج مرادآبادی جیسے عارف اور صاحب دل سے کسب فیض کیا تھا، ندوۃ العلماء کے عروج اور اپنی شدید مصروفیت کے زمانہ میں بھی وہ عجیب وغریب اور قابل رشک باطنی کیفیات اور احوال رکھتے تھے، ان کی مشہور کتاب ''ارشاد رحمانی'' (۱) (جس میں آج بھی دلوں میں ایمانی حرارت اور ذوق محبت پیدا کرنے کی عجیب وغریب صلاحیت ہے) اسی زمانہ کی تصنیف ہے، ان کے ارشاد، وتربیت تزکیۂ نفس اور باطنی احوال اور اذواق کی شہادت ان کی پوری زندگی سے ملتی ہے، جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں کی جائے گی۔

۳۔ جہاں تک تخیل اور طرز فکر کا اختلاف ہے تو وہ دراصل ماحول اور تربیت کے اسی اختلاف کا نتیجہ تھا جس کا ذکر اوپر گزرا ہے، انسان کے افکار وخیالات، اس کی ذہنی افتاد، خاندانی صفات اور ماحول وتربیت اور تعلیم ومطالعہ کا نتیجہ اور خلاصہ ہوتے ہیں۔ اس سے علیحدہ ہوکر ان کی کوئی معقول اور صحیح توجیہ نہیں کی جاسکتی، مولانا محمد علیؒ کے نزدیک زندگی کا اصل جوہر اور تعلیم کا اصل مقصد وہ روحانی تعلق ہے جو انسان کو خدا سے ہونا چاہئے۔ یہ

---

(۱) اس کتاب کا مفصل ذکر ''سلوک وارشاد'' کے باب میں کیا گیا ہے۔

تعلق ہے محبت کا، خوف کا اور امید کا، اگر یہ تین چیزیں نہ ہوں تو پھر یہ ساری ذہانت اور خطابت، ادب و بلاغت، فلسفہ اور علم کلام ذہنی عیاشی اور فریب نظر کے سوا کچھ نہیں، نظریاتی طور پر ہر مسلمان اس بات کی تصدیق کرے گا لیکن اگر عملی طور پر اس کی زندگی ایمان ویقین اور تعلق مع اللہ کا زندہ اور متحرک نہ ہو تو یہ مقصد پورا نہیں ہوسکتا۔

جدید علوم وفنون اور جدید مسائل اور رجحانات سے واقفیت، جدید علم کلام کی طرف توجہ اور نئے ملحدانہ نظریات اور لادینی تحریکات کے مقابلہ کے لئے جن کی پشت پر ہزاروں انسانوں کی ذہانتیں اور دنیا کا عظیم اور وقیع لٹریچر ہے، ہمیں یقیناً اپنے نظام تعلیم کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے، لیکن ہمارے سارے فکری، تعلیمی اور اجتماعی نظام میں یہ روح جاری وساری ہونی چاہئے کہ اس کا اصل مقصد روح کی بالیدگی، خدا کی معرفت ومحبت کا حصول اور اس کے احکام اور مرضی کے مطابق زندگی کی تشکیل ہے، اور بس یہ اگر بلند نصب العین ہم ہر وقت اپنی نظر کے سامنے رکھیں گے تو ہمارا ہر قدم لامحالہ اسی روشنی میں اٹھے گا اور ہم اس بے مثال تجربہ میں کامیاب ہوسکیں گے، جس کی جرأت اس عہد آخر میں صرف ندوۃ العلماء نے کی ہے، مولانا محمد علی کو ندوہ کے بانی اور اس تحریک کے قائد کی حیثیت سے یہ مقصد بہت عزیز تھا، مولانا شبلی اپنی تمام علمی وادبی بلندیوں اور دینی وملی خدمات کے باوجود ان کے نزدیک اس مطلوب معیار پر پورے نہ اترتے تھے، اور نہ اس خلا کا ان کو پورا احساس تھا۔ استعفیٰ سے کچھ عرصہ پیشتر مولانا محمد علیؒ نے مولانا شروانی کو مخاطب کرتے ہوئے بڑی سادگی وصفائی اور قلق ودلسوزی کے ساتھ اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے:۔

"اب مجھے دار العلوم کی نسبت کچھ کہنا ہے جو میرے فہم سے بالکل باہر ہوگیا ہے کہ اس کا انتظام کیونکر کیا جائے، نہ اس کے سرمایہ کی فکر نظر آتی ہے، نہ تعلیم دینے والے میسر آتے ہیں، نہ کسی مولوی کی توجہ ہے، ایک مولوی شبلی صاحب کچھ متوجہ ہوئے تھے سو منشی اطہر علی صاحب (۱) سے نہیں بنتی، اس کے علاوہ مولوی شبلی صاحب کی لیاقت کا میں فریفتہ ہوں، اور مجھے یہی خیال ہے کہ انہیں کی ہمت

---

(۱) منشی اطہر علی صاحب مولانا شبلی صاحب کے سخت مخالفین میں سے تھے، یہاں تک کہ ایک جلسہ انتظامیہ میں انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ: مولانا شبلی کو ندوہ کے جلسوں میں تقریر کرنے سے باز رکھا جائے۔

ولیاقت سے کام چلے گا، مگر میرے نزدیک مذہبی اور دینی خیال جیسا چاہئے ویسا نہیں ہے، پہلے مجھے خیال تھا کہ میں اور وہ مل کر اس کام کو چلائیں گے، اب میں سخت متحیر ہوں کہ کیا کروں؟ اب آپ غور کر کے میری نسبت رائے دیجئے کہ میں کیا کروں؟ میرا ضعف وناتوانی اس قدر ہے کہ اس کے ساتھ ان مصائب کا تحمل میری طاقت سے باہر ہے، کوئی کام کرنے والا نہیں ملتا، اور اس کا بھی صدمہ ہے کہ بنا بنایا کام بگڑ جاتا ہے اور مولویوں کی آبرو رہی سہی جاتی ہے۔ مولوی شبلی صاحب بھی خفا ہو کر اپنے گھر بیٹھ رہے ہیں۔‘‘(۱)

ان بنیادی اختلافات کے باوجود دس برس سے کچھ زائد عرصہ تک مولانا محمد علی نے سب تلخ وترش برداشت کیا، لیکن ندوہ پر آنچ نہ آنے دی، ابتداء کے چند برس گزرنے کے بعد مولانا کے اس حکیمانہ اور ایثار پسندانہ رویہ کے باوجود مولانا شبلی نے ان کے ساتھ وہی معاملہ شروع کیا جس سے عاجز آ کر مولانا محمد حسین الٰہ آبادی وغیرہ ندوہ سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ مولانا کی اس روش پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا سید عبدالحق نے ایک جگہ لکھا ہے:۔

’’مولانا شبلی کا انداز طبیعت ابتداء سے یہ تھا کہ وہ دوسروں کی رائے سننا گوارا نہیں کرتے تھے، اور جو شخص مسئلہ زیر بحث پر گفتگو کرنا چاہتا تھا اس کو ناشائستگی کے ساتھ جھڑک دیتے تھے۔‘‘(۲)

مولانا محمد علیؒ چونکہ مولانا شبلی کے بہت معترف تھے اور ان کا بہت خیال رکھتے تھے اس لئے ان کو اس عجیب وغریب رویہ کی توقع نہ تھی، ان کے دل ودماغ پر بہت ضرب لگی، لیکن انہوں نے ندوہ کے مفاد کے لئے اس کو گوارا کیا۔

۱۶؍ذی الحجہ ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۶؍مارچ ۱۹۰۳ء کو ایک ہی روز مولانا غلام محمد ہوشیارپوری نے مولانا شبلی کا نام معتمد مجلس دارالعلوم کے لئے پیش کیا، اور اتفاق کے ساتھ یہ نام منظور ہوا، دوسری طرف مولانا محمد علی نے رسمی طور پر اپنا استعفیٰ پیش کیا لیکن حسب معمول کوئی شخص بھی اس کے منظور کرنے پر راضی نہ ہوا۔

دوسرے روز انتظامیہ کا پھر جلسہ ہوا اور مولانا محمد علیؒ نے پوری کوشش کی کہ استعفیٰ

---

(۱) الجامعہ: جمادی الاولی ۱۳۱۵ھ۔ (۲) مجموعہ مکاتیب قلمی۔

منظور کر لیا جائے، انہوں نے کہا کہ کل میں نے استعفیٰ پیش کیا تھا وہ منظور نہیں ہوا مگر غور کرنے میں اصلح یہی سمجھتا ہوں کہ اس کو منظور کر لیا جائے، لہٰذا میں پھر بمنت وسماجت اس کی منظوری کی درخواست کرتا ہوں، ارکان نے بالاتفاق کہا کہ ہم اس کو منظور نہیں کر سکتے، آپ نے رجب ۱۳۱۳ھ کے جلسہ میں اور اس کے علاوہ کئی بار تحریراً وتقریراً استعفیٰ پیش کیا ہے، اور اپنی علالت اور معذوری ظاہر فرمائی ہے مگر ہم ہمیشہ آپ کا استعفیٰ منظور کرنے سے مجبور ہیں، کوئی شخص آپ جیسا متدین اور دردمند ندوۃ العلماء کا نظر نہیں آتا جس کو ہم قائم مقام آپ کا کریں، یہ آپ ہی کا کام تھا کہ اپنا ذاتی مشاہرہ ماہوار ندوہ کو دیدیا اور اب تک ندوہ اس سے فائدہ اٹھا رہا ہے، علاوہ اس کے آپ جب لکھنؤ میں ندوہ کے کام سے مقیم رہے تو اکثر اپنی خورد ونوش کے مصارف بھی برداشت کرتے رہے اور کرایہ آمد ورفت کا بھی نہیں لیا اور کبھی لیا تو ہمارے اصرار مبالغہ سے، ایسے شخص کو ہم نہیں چھوڑ سکتے، آپ نے ۱۳۱۴ھ کے جلسہ میں عذر کیا تھا کہ مال کا کام خود نہیں کر سکتے، اس واسطے جلسہ نے ان کاموں سے آپ کو سبکدوش کیا اور ایک مجلس مال قائم کی اور مولوی خلیل الرحمٰن صاحب کو ناظم مال منتخب کیا وہ ۱۳۱۹ھ تک ناظم مال رہے اس کے بعد منشی احتشام علی صاحب منتخب ہوئے وہ اب تک کام کر رہے ہیں، اگر کوئی شخص ہم کو نظامت کے لائق میسر آجائے تو ہم آپ کا استعفیٰ قبول کر سکتے ہیں۔ علاوہ اس کے آپ کی علیحدگی سے بہت خطرات پیش نظر ہیں جن کی وجہ آپ کی علیحدگی مناسب نہیں ہے اور خود بھی آپ کو ایسا خیال نہ کرنا چاہئے، ندوۃ العلماء ایک دینی مجلس ہے، اس کا نقصان تمام مسلمانوں کا نقصان ہے، ایسی حالت میں ضرر شخصی خیال نہیں کیا جا سکتا۔(۱)

استعفیٰ کی اصل وجہ

اس زمانہ میں ایک خاص واقعہ پیش آیا جس نے مولانا کو اس پر مجبور کر دیا کہ وہ مستعفی ہو جائیں، اگر یہ واقعہ پیش نہ آتا تو شاید مولانا اتنی جلد یہ فیصلہ نہ کرتے اور ان کا شاندار عہد کچھ دن اور چلتا، مولانا سید عبدالحیؒ نے اس واقعہ کو اپنی ایک اہم تاریخی تحریر میں قلمبند

۱۔ کارروائی انتظامیہ قلمی، جلد اول ص ۱۴۶

کیا ہے، واقعہ کے پس منظر کو بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

''اس زمانہ میں مولانا شبلی نے کئی خط پے در پے مولانا ممدوح کو لکھے، اور اس میں چند بے اصل الزام لگائے (۱) اور سخت سست لکھا جس کو وہ برداشت نہیں کر سکے اور اسی دن ایک مطبوعہ تحریر کے ذریعہ اپنا استعفیٰ ملک کے سامنے پیش کر دیا اور لکھ دیا؟ کہ وہ آئندہ سے ندوہ کا کام نہ کریں گے۔''

اس زمانہ میں مولانا نے مولانا سید عبدالحی کو ایک خط لکھا جو اپنے حال اور کچھ علمی استفسارات پر مشتمل ہے۔ اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خاصے دل شکستہ اور مایوس ہو چکے تھے اور ان جھگڑوں بکھیڑوں سے علیحدہ ہو کر روحانی اصلاح اور ارشاد کی طرف متوجہ تھے، اور اسی میں ان کو اپنے درد کی دوا نظر آرہی تھی، لکھتے ہیں:۔

''آپ کے خط کا جواب تو غالباً دے چکا ہوں، اس وقت آپ سے کچھ بات کرنے کو دل چاہا، میری حالت ان دنوں عجیب قسم کی ہو رہی ہے جس کا بیان نہیں ہوسکتا، بظاہر ایک قسم کا تپاک ہے، ملاقات کرنے کو دل نہیں چاہتا، ہاں یہ آرزو رہتی ہے کہ کوئی اپنا ہم جنس رفیق ہو اس سے کلام کریں، تمام احباب کو دیکھ لیا، اللہ کے سوا کوئی دوست نہیں ہے۔'' (۲)

یہ خط سپرد ڈاک کرنے سے پہلے ہی (جیسا کہ خط کے انداز سے صاف معلوم ہوتا ہے) ان کو مولانا خلیل الرحمٰن سہارنپوری کا خط ملا جو غالباً اسی استعفیٰ سے متعلق تھا اور جہاں تک اندازہ ہوتا ہے مولانا سہارن پوری نے ان کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ استعفیٰ کا خیال ترک کر دیں، بلکہ مولوی شبلی کو اس بات پر مجبور کریں کہ وہ یا تو یہ روش ترک کر دیں، یا ندوہ سے کنارہ کش ہو جائیں، یہ بات مولانا کے مزاج کے بالکل خلاف تھی، مولانا نے اس خط کو دیکھ کر اپنے مذکورہ بالا خط میں

(۱) مولانا سید سلیمان ندویؒ نے حیات شبلی میں ایک جگہ ان خطوط کا سرسری ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ مولانا شبلی مرحوم اس زمانہ میں جھلا جھلا کر ندوہ کے دوستوں کو سخت خط لکھتے رہے (ص ۳۹۶) مولانا سید عبدالحی کے ذاتی کتب خانہ کے محفوظ کتب خانہ کے ذخیرہ میں مجھے مولانا شبلی کے اور خطوط کے ساتھ ان کا ایک ایسا خط ملا جس میں انھوں نے دفتر ندوہ سے ان خطوط کا مطالبہ کیا ہے جو انھوں نے مولانا محمد علی کو لکھے تھے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ خط جو ندوہ کے فائل کے لئے ضروری ہیں وہ مطالعہ کے بعد واپس کر دیں گے۔ ندوہ کے دفتر نظامت کے پرانے کاغذات خاصی تلاش کے بعد بھی وہ خطوط دستیاب نہ ہوئے ورنہ یہ مسئلہ مفصل طور پر روشنی میں آجاتا۔ (۲) مجموعہ خطوط قلمی بنام مولانا سید عبدالحی

حسب ذیل سطریں اضافہ کیں:۔

"اس تحریر کے بعد مولوی خلیل الرحمٰن صاحب کا خط آیا، اسے بھیجتا ہوں، دیکھئے میں اس لائق نہیں کہ کسی سے جھگڑا چھیڑوں، میں نے لکھ دیا ہے، ندوہ سے علیحدہ ہونے کے وجہ اخبار میں شائع کر چکا ہوں، اور اگر تمام وجوہ لکھے جائیں تو کئی ورق میں آئیں۔"

مولانا کے اس فیصلہ میں ایک چیز سے اور مدد ملی۔

مولانا کا اپنے وطن مونگیر سے اس پوری مدت میں ارشاد و تربیت کا تعلق قائم تھا، جس کی وجہ سے بہار میں ان کی شخصیت بہت مقبول اور ہر دلعزیز تھی۔ مونگیر کے علاوہ دربھنگہ، پٹنہ اور دوسرے ضلعوں اور شہروں میں مولانا کے معتقدین کی ایک بہت بڑی تعداد تھی جو ان کو اپنا روحانی مرشد اور مربی تسلیم کرتی تھی۔ جب مولانا کسی موقع پر ان اطراف کا دورہ کرتے تو وہاں یک گونہ بہار آجاتی، اور رشد و ہدایت کی ہوائیں چلنے لگتیں۔ سمٹ سمٹ کر لوگ ان کے جائے قیام پر جمع ہونے لگتے۔ اس "فرصت" کو غنیمت سمجھتے، اور ان کے انتظار میں دن گنا کرتے۔

دوسری طرف مولانا کو ان سادہ دل اور مخلص مسلمانوں کی اس تشنگی کا پورا احساس تھا اور وہ ان کی دینی رہنمائی و تربیت اپنا فرض سمجھتے تھے۔

حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ سے تعلق رکھنے والے تمام حضرات بالخصوص وہ لوگ جن کا تعلق بہار سے تھا، بڑی حد تک مولانا سے وابستہ تھے۔ ۱۳۱۳ھ میں مولانا فضل رحمٰنؒ کے انتقال کے بعد لوگوں کا رجوع زیادہ تر مولانا کی طرف ہو گیا، اور بہار کی آمد و رفت جو ۱۳۰۰ھ میں شروع ہو گئی تھی، بہت بڑھ گئی۔ ان سب باتوں کی وجہ سے مولانا کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا کہ وہ ان اہل طلب کی طرف بھی توجہ کریں۔ ندوہ جن حالات سے اس وقت گزر رہا تھا اس کے پیش نظر مولانا کو قدرتی طور پر اس نئے میدان کی طرف توجہ زیادہ ہو گئی، اور اس شکستہ خاطری اور بدظنی و بددلی کی فضا میں جو بدقسمتی سے ندوہ پر چھائی ہوئی تھی، ان کو یہ نیا میدان زیادہ موزوں اور حسب حال معلوم ہوا۔ اسلام پور ضلع پٹنہ سے مولانا شروانی کو بہت صفائی سے لکھتے ہیں:۔

''وہاں ہر طرف سے یار و اغیار نے دل کو پاش پاش کر دیا تھا اور سبھوں نے اپنی نظر سے گرا دیا تھا، اس سے زیادہ اس طرف کے لوگوں کی نگاہوں میں اللہ تعالیٰ نے مقبول کیا، چار ضلعوں میں ایک غل مچ گیا۔'' (۱)

مونگیر میں اقامت کا خیال دراصل ان ہی حالات کا نتیجہ تھا۔ جس کا ذکر اوپر گزرا ہے۔ ۱۳۱۶ھ ہی سے مولانا کے دل میں یہ ارادہ پیدا ہوا تھا لیکن اس وقت وہ کسی فیصلہ پر نہیں پہنچے تھے، بلکہ اصل یہ ہے کہ خدا کو ندوہ کے لئے ان سے ابھی بہت کام لینا تھا۔ ایک خط میں مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:۔

''اب کچھ خفیف سا ارادہ یہ ہے کہ مونگیر اقامت کروں، وہاں کے لوگ بہت خواہشمند ہیں، دیکھئے کیا مرضی خدا ہے۔'' (۲)

دوسری طرف قادیانیوں نے بہار پر بھر پور حملہ کیا تھا اور مونگیر و بھاگلپور کے متعلق ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ دونوں ضلعے قادیانی ہو جائیں گے۔ (۳) اس فتنہ کے سد باب کے لئے فوری مقابلہ اور ایک طاقتور شخصیت کی ضرورت تھی، مشیت نے یہ سعادت بھی مولانا ہی کے لئے مقدر کی، اور ان کے لئے خود بخود سامان ہوتے گئے۔

صاف نظر آ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا سے ندوہ کے لئے جتنا کام لینا تھا وہ لے لیا، اب ان کو نیا ساز و سامان اور نیا میدان عطا کیا جا رہا ہے، اور خدا کو یہ منظور ہے کہ قادیانیت کے اس نئے فتنہ کا استیصال بھی ان ہی کے ہاتھوں انجام پائے، اور طالبان حق کے لئے اصلاح و ہدایت اور سلوک و ارشاد کا فیض ایک بار پھر عام ہو۔

استعفیٰ کی منظوری

اب مولانا نے مستقل سکونت مونگیر میں اختیار کر لی تھی۔ (۴) اور اپنا استعفیٰ بھی

---

(۱) مقالہ متعلقہ سوانح از مولانا رحمانی: ۴۴ (۲) ایضاً (۳) ایضاً (۴) ۱۳۲۰ھ کے آخر ہی میں مولانا نے کانپور چھوڑ دیا اور مونگیر میں اقامت اختیار کر لی تھی، مولانا سید عبدالحی کو مونگیر سے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔ میں دیکھتا ہوں کہ جو بات پیش آتی ہے وہ مہیب ہی صورت دکھاتی ہے، اس سے مشیت ایزدی کا پتہ لگتا ہے، میں نے استعفیٰ اخبار بھیجنے کو لکھا ہے، عنقریب روانہ کروں گا، پھر اپنی حالت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں، الحمد للہ مع الخیر ہوں، بہت لطف سے گزرتی ہے، نفس پرستوں کے جھگڑوں سے اور انکی صحبت سے نجات ہے، خدا کا ہزار شکر ہے''۔

اخبارات میں شائع کردیا تھا، صرف اس کی رسمی توثیق باقی تھی۔

۲۴؍ربیع الثانی ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹؍جولائی ۱۹۰۳ء کے جلسۂ انتظامیہ میں مولانا سید عبدالحیؒ نے مولانا کا استعفیٰ پیش کیا، اور مجلس نے بالآخر مجبور ہوکر ان الفاظ کے ساتھ استعفیٰ کی منظوری دی:۔

"اس جلسہ کو مولانا کے مستعفی ہونے کا افسوس ہے، ظاہر ہے کہ مولانا درحقیقت بانی وباعث انعقاد ندوۃ العلماء کے ہیں، اور مولانا نے اس مجلس کے قائم کرنے سے جو احسان اپنی قوم پر عموماً طبقۂ علماء پر خصوصاً کیا ہے اس کا شکریہ ادا نہیں ہوسکتا، اور باعتبار مولانا کے خلوص اور ہر دلعزیزی کے کسی طرح ان کی علیحدگی عہدۂ نظامت سے گوارا نہیں ہوسکتی، اور یہی وجہ ہے کہ اس سے پہلے بھی جب مولانا نے علیحدگی کا قصد کیا تو باصرار تمام مولوی صاحب کو باز رکھا گیا، لیکن اب چونکہ مولانا کو بوجہ اپنی معذوری کے نظامت سے علیحدگی پر نہایت اصرار ہے، حتی کہ استعفیٰ اخبارات میں شائع کرادیا تو اب بجز اس کے اور کیا چارہ ہے کہ افسوس کے ساتھ یہ استعفیٰ منظور کیا جائے، اور ناظم جدید سالانہ کا انتخاب جلسۂ عام سالانہ پر ملتوی رہے۔" (۱)

اس تاریخ کو رسمی طور پر ندوہ سے مولانا کا یہ تعلق ختم ہوگیا، لیکن اس کے بعد ہی مولانا نے بہت نازک وقت میں مدراس کا سفر کیا اور اس کے جلسۂ سالانہ میں شرکت کی۔ مونگیر میں مستقل اقامت اور سلسلۂ ارشاد وتربیت کے باوجود ان کا دل اس میں برابر لگا رہا، اور وہ کسی وقت بھی اس کو فراموش نہ کرسکے۔ جس قیمتی پودے کو انہوں نے اپنے خون جگر سے سینچا تھا، اس کی طرف سے غفلت ان کے لئے ناممکن تھی۔ (۲)

حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے اپنی مسلسل علالت وضعف اور اشغال ومجاہدات، نیز ان سارے اختلافات وکشمکش کے باوجود اپنی ساری فکری وعملی قوت ندوہ کے لئے بے دریغ صرف

(۱) کاروائی جلسہ انتظامیہ (جلد دوم) (۲) ندوہ سے کنارہ کشی کے بعد مولانا نے اپنے دو صاحبزادوں (مولانا نور اللہ و مولانا منت اللہ صاحب) کو باوجود اس کے بعض علماء دوسرے مشہور نامور مدارس دینیہ کی تحریک عرصہ سے کررہے تھے، تعلیم کے لئے ندوہ بھیجنا پسند کیا، اور اپنے رفقاء سے برابر خط وکتابت کا تعلق قائم رکھا۔

کر دی، اور اس کا کوئی معاوضہ اور صلہ قبول نہ کیا، اور جب کبھی ان کو کوئی معاوضہ دیا گیا تو انہوں نے اس کو ندوہ ہی کی نذر کر دیا۔ انہوں نے مولانا سید عبدالحی کو جو نصیحت کی تھی اس پر پہلے خود عمل کر کے دکھایا تھا۔ حجاز سے ایک خط میں ان کو لکھا تھا:۔

''آپ کسی وقت ہمت نہ ہاریے گا، آپ کی ہمت سے بہت کچھ ہوگا۔ میں جانتا ہوں کہ مصارف کی آپ کو دقت رہتی ہے، مگر آپ کو بخوبی معلوم ہوگا کہ جس کسی نے کچھ کیا ہے وہ فقر و فاقہ اور قناعت ہی میں کیا ہے، ایسے حضرات کا نام نامی نیک نامی کی سنہری کتاب میں لکھا ہے۔'' (۱)

(۱) ۲۔ مجموعہ خطوط قلمی۔ ص:۳۰

باب پنجم

قادیانیت کا مقابلہ

مولانا محمد علیؒ کا ایک کارنامہ جس کے ذکر کے بغیر ان کی تاریخ نامکمل رہے گی، قادیانیت کا مقابلہ اور سرکوبی ہے۔

انہوں نے اس کے لئے اپنی قوت صرف کردی، اور جب تک اس مہم میں کامیاب نہ ہوئے، اطمینان کی سانس نہ لی۔

انہوں نے قادیانیت کی تردید میں سو سے زائد کتابیں اور رسائل تصنیف کئے ہیں جس میں سے صرف ۴۰ کتابیں ان کے نام سے طبع ہوئیں اور بقیہ دوسرے نام سے۔

انہوں نے اس کو وقت کا افضل ترین جہاد قرار دیا، اور اس کے لئے لوگوں کو ہر قسم کی کوشش اور قربانی پر آمادہ کرنے کی کوشش کی، اور بڑی دلسوزی کے ساتھ اس کی اہمیت سمجھائی، ان کوششوں سے بہار (جس پر قادیانیوں نے اس زمانہ میں بھرپور حملہ کیا تھا، اور بڑی تعداد میں مسلمان اس کا شکار ہو رہے تھے) اس خطرہ سے محفوظ ہو گیا، اور ہندوستان کے اور دوسرے علاقوں میں بھی جہاں کہیں مولانا کی تصنیفات پہنچیں، یا مولانا کے مبلغین پہنچے، قادیانیت کے قدم اکھڑ گئے۔ مسلمانوں پر اس نئے دین کی حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی، اور ہزاروں لاکھوں مسلمان اس فتنہ سے محفوظ ہو گئے۔

مولانا کی اس دلسوزی، سیماب وشی، بیقراری، اور اس مسئلہ میں غیر معمولی ذکی الحسی

کا سبب سمجھنے کے لئے، اور ان کی کوششوں اور قربانیوں کی قدر و قیمت اور اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ قادیانیت پر ایک اجمالی نظر ڈال لی جائے، اور یہ دیکھا جائے کہ قادیانیت سے اسلام اور عالم اسلام کو وہ کیا بڑا خطرہ درپیش تھا جس نے مولانا کو اس قدر بے چین کر رکھا تھا، اور ان کی راتوں کی نیند اور دن کا آرام ختم کر دیا تھا۔

قادیانیت کے متعلق ایک بڑا مغالطہ جس میں عام مسلمانوں کے علاوہ اچھے خاصے ممتاز اور ذہین افراد بھی بعض وقت گرفتار نظر آتے ہیں، یہ ہے کہ وہ قادیانیت پر ایک گمراہ فرقہ (فرقہ ضالہ) کی حیثیت سے غور کرتے ہیں اور پھر قدرتی طور پر اسی لحاظ سے اس کے نتائج و مضمرات کا اندازہ لگاتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں قادیانیت بھی مسلمانوں کا ایک گمراہ فرقہ ہے جو بہ نسبت دوسرے گمراہ فرقوں کے اسلام کی صراط مستقیم سے ذرا زیادہ دور ہو گیا ہے۔ لیکن یہ طرز فکر ہمیں قادیانیت کی صحیح تصویر تک پہنچنے میں رہنمائی نہیں کرتا، اس سے ہمیں قادیانیت کی اس خطرناکی اور ان تباہ کن عناصر کا پورا اندازہ نہیں ہوتا جو نبوت محمدیؐ اور بالآخر پورے اسلامی نظام کو نہ صرف نقصان پہنچانا چاہتے ہیں بلکہ خاکم بدہن ان کے کھنڈر پر ایک نئی عمارت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

ایک متوازی نبوت اور متوازی امت

اگر نبوت محمدیؐ کے کسی جز کا انکار پورے اسلامی نظام کا انکار ہے، اور بلاشبہ ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ قادیانیت (جس نے نبوت محمدیؐ کے کسی جزو سے انکار نہیں کیا، بلکہ وہ اس کے مقابل ایک نئی نبوت کی دعویدار ہے) عالم اسلام، اور سارے اسلامی نظام کو متزلزل کر دینا چاہتی ہے، اور اس کی جگہ ایک نیا نظام اور نیا مذہب قائم کرنا چاہتی ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب ''قادیانیت کا مطالعہ و جائزہ'' میں اس پہلو پر بہت اچھی طرح روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''قادیانیت کا تحقیقی مطالعہ کرنے سے یہ غلط فہمی اور خوش گمانی دور ہو جاتی ہے اور ایک منصف مزاج انسان اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ قادیانیت ایک مستقل مذہب اور قادیانی ایک مستقل امت ہیں، جو دین اسلام اور امت اسلامیہ کے

بالکل متوازی چلتے ہیں، اور اس کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ مرزا بشیر الدین محمود صاحب کے اس بیان میں کوئی مبالغہ اور غلط بیانی نہیں کہ "حضرت مسیح موعودؑ کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونجتے ہیں" آپ نے فرمایا:۔ یہ غلط ہے کہ دوسرے لوگوں سے ہمارا اختلاف صرف وفات مسیح اور چند مسائل میں ہے، اللہ کی ذات، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، غرضکہ آپ نے تفصیل سے بتایا کہ ایک ایک جزو میں ہمیں ان سے اختلاف ہے۔" (۱)

مسلمانوں کی غیرت اور وفاداری کا امتحان

اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عالم اسلام کی روح ہیں، اور بلا ادنیٰ شائبہ شک کے ایسا ہی ہے، تو آپؐ کے بعد ایک نئے نبی کے آنے کا امکان مسلمانوں کے لئے خطرہ کا سب سے بڑا سگنل، مسلم معاشرہ اور عالم اسلام میں عظیم انتشار کا باعث ہے، اور ایسی تحریک کا وجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت وشریعت پر کلی اعتماد واطمینان کے لئے کھلا ہوا چیلنج ہے، اور اس کا نشو ونما اور ترقی ہر غیرتمند مسلمان کے لئے سخت ذہنی تشویش اور قلبی اذیت کا موجب ہے۔

قادیانیت کی تبلیغ واشاعت

یہ زمانہ قادیانیت کے عین عروج کا تھا، ۱۹۰۱ء میں مرزا صاحب نے کھل کر اپنے اس عزم وارادہ کا اظہار شروع کر دیا تھا۔ ان کے رسائل کا وہ مجموعہ جس کا نام "اربعین" ہے، منصب جدید کے اعلانات اور تصریحات سے بڑھا ہوا ہے۔

۱۹۰۲ء میں ایک رسالہ 'تحفۃ الندوہ' لکھا، اس کے مخاطب بالخصوص ندوہ کے علماء وارکان اور بالعموم تمام علماء تھے جو ندوہ کے اجلاس امرتسر (منعقدہ ۱۹۰۲ء) میں شریک تھے، اس میں مرزا صاحب نے بہت کھل کر اور وضاحت کے ساتھ اپنے خیالات ظاہر کئے۔ مولانا محمد علیؒ نے اس وقت اس کی تردید کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہ کی، اور اس

۱۔ قادیانیت، ص ۱۶۸ و ۱۶۹

مسئلہ پر زیادہ توجہ نہ دے سکے۔ ایک طرف وہ ندوہ کی ترقی اور استحکام کی طرف متوجہ تھے، دوسری طرف ان کو اس کا پورا اندازہ نہ تھا کہ یہ تحریک دیکھتے دیکھتے ایسی خطرناک صورت اختیار کرلے گی، اور پنجاب کے علاقہ کو پار کر کے ہندوستان کے مختلف حصوں اور بالخصوص بہار پر اس شدت سے حملہ آور ہوگی۔

قادیانی بہت منظم طریقے پر کام کر رہے تھے۔ اخبارات، رسائل اور کتابوں کے علاوہ ان کے مبلغین جن کو ایک طرف قادیان میں باقاعدہ ٹریننگ دی جاتی تھی، اور دوسری طرف مالی امداد کے ذریعہ ان کو ایسا تابع بنالیا جاتا تھا کہ وہ اس کے جال سے کسی حال میں آزاد نہ ہوسکیں۔

بہار پر یورش

بہار میں قادیانیوں نے چار ضلعوں میں بہت کامیابی حاصل کی تھی، خاص طور پر مونگیر اور بھاگلپور کے متعلق یہ اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ یہ دونوں ضلع قادیانی ہوجائیں گے۔ انہوں نے یہ ٹکنک اختیار کی تھی کہ کچھ لوگ کھل کر قادیانی مبلغ کی حیثیت سے سامنے آتے تھے اور کچھ لوگ جو حقیقت میں قادیانی تھے لیکن اپنے کو مسلمان ظاہر کرتے تھے، وہ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرتے اور ان کو ان کی تحریروں اور تقریروں کی طرف متوجہ کرتے۔ ایک قادیانی مبلغ سعید مختار جس کا مولانا نے اپنے ایک خط میں ذکر کیا ہے:۔

> ''بہت سرگرمی کے ساتھ مشغول تھا اور بہار کے علاوہ بنگال میں بھی اس نے مہم شروع کردی تھی، ہزاری باغ (بہار) میں بہت سے مسلمان قادیانی ہوگئے تھے۔'' (۱)

قادیانی لٹریچر علانیہ تقسیم کیا جاتا اور ناواقف مسلمان عام طور پر اس سے متاثر ہوتے۔ اس وقت جو رسائل واخبارات قادیانیوں کی طرف سے شائع ہو رہے تھے، ان کی تعداد اشاعت ۲۶ ہزار تھی۔ ہر قادیانی کے لئے یہ لازم تھا کہ وہ اپنی آمدنی کا کچھ حصہ مذہب کی اشاعت کے لئے دے۔ محض اسی ذریعہ سے ان کا بجٹ لاکھوں تک پہنچ گیا تھا

---

(۱) صحیفۂ رحمانیہ

اوراس کی وجہ سے ان کو تبلیغ واشاعت کے کام میں (جس میں وہ مالی امداد کی ترغیب دے کرنا واقف اور ضرورت مند لوگوں کو آسانی کے ساتھ شکار کر لیتے تھے) بڑی سہولت تھی۔

مولانا محمد علیؒ اپنے ایک معتمد خاص حاجی لیاقت حسین بھاگلپوری کو ایک خط میں بڑی دردمندی کے ساتھ ان حالات کی طرف متوجہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ''ان کی سعی اور کوشش اس قدر انتھک اور منظم ہے جس کو دیکھ کر ایک مسلمان کا دل لرز جاتا ہے کہ الٰہی یہ کیا طوفانِ کفر اور سیلاب ارتداد ہے، اس کو روکنے کی کیا صورت ہو، ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں جہاں ان کے لوگ تبلیغ نہ کرتے ہوں، اور ہندوستان کے علاوہ یورپ، انگلستان، جرمنی امریکہ اور جاپان میں بڑے زوروں اور نہایت نظم سے اپنے مذہب کی اشاعت کر رہے ہیں۔ ان کے پاس کوئی بنک نہیں، کوئی ریاست نہیں، صرف ایک بات ہے کہ مرزا نے کہہ دیا ہے کہ ہر مرید حسب استطاعت ماہانہ مذہب کی اشاعت کے لئے کچھ دے، اور جو ۳ ماہ تک کچھ نہ دے گا وہ بیعت سے خارج ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بیت المال میں لاکھوں روپیہ جمع ہو گیا، اور ان کا ہر مرید اپنی آمدنی کا کم ازکم دسواں حصہ دیتا ہے، اور بعض تو تہائی اور چوتھائی قادیان بھیجتے رہتے ہیں جس سے وہ خاطر خواہ اپنے مذہب کی اشاعت کر رہے ہیں۔'' (۱)

مونگیر کے زمانۂ قیام میں مسلمانوں نے مولانا سے یہ صورت حال بیان کی، اور اس پر تشویش کا اظہار کیا۔ مولانا خود اس بات سے فکر مند تھے، ان مسلمانوں کے توجہ دلانے سے ان کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ اگر پوری قوت کے ساتھ اس تحریک کا مقابلہ نہ کیا گیا تو اس سے بڑے افسوسناک نتائج ظاہر ہو سکتے ہیں۔ یہی وہ موڑ تھا جہاں مولانا اپنی ساری صلاحیتوں کے ساتھ میدان میں اتر آئے، اور اپنا سارا وقت اور ساری قوت کے اس کے لئے وقف کر دی، اور اپنے تمام مریدین و مسترشدین، رفقاء، اور اہل تعلق کو اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی تلقین کی، اور صاف صاف کہا کہ جو اس معاملہ میں میرا ساتھ نہ دے گا، میں اس سے ناخوش ہوں۔ (۲)

---

(۱) کمالات محمدیہ ص ۲۷۵ (۲) ایضاً ص ۲۷۶

اسی درمیان میں یہ واقعہ بھی پیش آیا کہ مراقبہ میں مولانا کو یہ القا ہوا کہ یہ گمراہی تیرے سامنے پھیل رہی ہے اور تو ساکت ہے، اگر قیامت کے دن باز پرس ہو تو کیا جواب ہوگا۔(۱)

ایک اہم تاریخی مناظرہ

اس جدوجہد کا آغاز ایک اہم تاریخی مناظرہ سے ہوا جس میں قادیانیوں کو ایسی شکست فاش ہوئی کہ انہوں نے دوبارہ اس میدان میں آنے کی جرأت نہ کی، یہ قادیانیت پر پہلی ضرب کاری تھی جس سے نہ صرف بہار کے قادیانیوں کو بلکہ پورے ہندوستان کی قادیانی تحریک کو سخت نقصان پہنچا، اور اس کے بہت خوشگوار نتائج برآمد ہوئے۔ اس مناظرہ میں جو (۱۹۱۱ء میں ہوا) تقریباً چالیس علماء شریک تھے۔ دوسری طرف سے حکیم نور الدین وغیرہ آئے تھے۔ مناظرہ کی اہمیت کا اندازہ کرنے کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ ادھر مناظرہ شروع ہوا، ادھر مولانا سجدہ میں گر پڑے۔ اور جب تک فتح کی خبر نہ آئی، سر نہ اٹھایا۔

اس مناظرہ کی مختصر روئداد مولانا کے صاحبزادے مولانا منت اللہ رحمانی نے قلمبند کی ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

مرزا صاحب کے نمائندے حکیم نور الدین صاحب، سرور شاہ صاحب اور روشن علی صاحب مرزا صاحب کی تحریر لے کر آئے کہ ان کی شکست میری شکست ہے اور ان کی فتح میری فتح۔ اس طرف سے مولانا مرتضیٰ حسن صاحب، علامہ انور شاہ کشمیری، مولانا شبیر عثمانی، مولانا عبد الوہاب بہاری، مولانا ابراہیم صاحب سیالکوٹی (تقریباً چالیس علماء) بلائے گئے تھے، لوگوں کا بیان ہے کہ عجیب منظر تھا۔ صوبۂ بہار کے اضلاع کے لوگ تماشائی بن کر آئے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ خانقاہ (۲) میں علماء کی ایک بڑی بارات ٹھہری ہوئی ہے، کتابیں الٹی جا رہی ہیں، حوالے تلاش کئے جا رہے ہیں اور بحثیں چل رہی ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ مولانا محمد علی کی طرف سے مناظرہ کا وکیل اور نمائندہ کون ہو؟ قرعہ فال مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کے نام پڑا، آپ نے مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کو تحریراً اپنا

---

(۱) کمالات محمدیہ، ص ۴۳ (۲) خانقاہ رحمانی۔

نمائندہ بنایا۔ علماء کی یہ جماعت میدان مناظرہ میں گئی، وقت مقرر تھا۔ اس طرف مولانا مرتضٰی حسن صاحب اسٹیج پر تقریر کے لئے آئے اور اس طرف آپ سجدہ میں گئے اور اس وقت تک سر نہ اٹھایا جب تک فتح کی خبر نہ آگئی۔ بوڑھوں کا کہنا ہے کہ میدان مناظرہ کا منظر عجیب تھا۔ مولانا مرتضٰی حسن صاحب کی ایک ہی تقریر کے بعد جب قادیانیوں سے جواب کا مطالبہ کیا گیا تو مرزا صاحب کے نمائندے جواب دینے کے بجائے انتہائی بدحواسی اور گھبراہٹ میں کرسیاں اپنے سروں پر لئے ہوئے یہ کہتے بھاگے کہ "ہم جواب نہیں دے سکتے"۔(۱)

قادیانیت کے خلاف زبردست مہم

اس مناظرہ کے بعد مولانا نے قادیانیت کے خلاف باقاعدہ اور منظّم طریقہ پر زبردست مہم شروع کی، اس کے لئے دورے کئے، خطوط لکھے، رسائل اور کتابیں تصنیف کیں، دہلی اور کانپور سے کتابیں طبع کرواکر مونگیر لانے اور اشاعت کرنے میں خاصا وقت صرف ہوتا تھا اور حالات کا تقاضا یہ تھا کہ اس میں ذرا بھی سستی اور تاخیر نہ ہو، اس لئے مولانا نے خانقاہ میں ایک مستقل پریس قائم کیا، اس پریس سے (اور کتابوں کے علاوہ) سو سے زائد چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہوئیں جو سب مولانا کے قلم سے ہیں، اس قدر ضعف اور سلسلہ علالت کے ساتھ جو بدستور جاری تھا، اتنا وقیع اور عظیم تصنیفی کام بجائے خود ایک کرامت سے کم نہیں، اور تائیدِ الٰہی و توفیقِ خداوندی کے سوا کچھ اور چیز سے اس کی توجیہ نہیں ہوسکتی، صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے اس کام پر مامور تھے، ہر چیز میں خدا کا فضل ان کے شاملِ حال تھا۔

مولانا نے اپنے ایک معتمد اور خادم خاص کو ایک خط میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے، اور بے تکلفی اور سادگی کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

> "میرا ضعف و ناتوانی اے عزیز تم پر اور تمہارے کل سلسلہ کے بھائیوں پر ظاہر ہے کہ میں مدت سے بیکار ہو چکا ہوں، اور میرے ظاہری قویٰ نے جواب

---

(۱) مقالہ متعلقہ سوانح، ص ۴۶

دے دیا، مگر خدائی ارشاد "إنا نحن نزلنا الذکر و انا له لحافظون" نے اپنی غیر محدود وقدرت کا ایک ضعیف وناتواں ہستی میں جلوہ گر فرما کر وہ کام لیا جس کا خیال وخطرہ بھی نہ تھا، اس قدر رسائل اس ضعف وناتوانی میں لکھوا دینا اسی کا فضل ہے۔"(۱)

شہرت وناموری سے اجتناب

لیکن شہرت وناموی سے اجتناب اور اخفاء حال کا ہمیشہ سے اہتمام تھا۔ انجمن تہذیب کے قیام میں بھی مولانا دوسروں کو آگے بڑھاتے تھے، خود کوئی عہدہ قبول نہ کرتے تھے۔ ندوۃ العلماء کے پورے دورِ نظامت میں اور اپنی دینی وملی جدوجہد کے ہر مرحلہ میں مولانا 'پس پردہ' ہی نظر آتے ہیں۔ اسٹیج کی سرگرمیوں، جلسوں اور تقریروں، اور ترحیب واستقبال کے مظاہروں، مدح سرائیوں وقصیدہ خوانیوں سے مولانا کو اپنی زندگی کے کسی دور میں ادنیٰ مناسبت بھی نہیں رہی، اور باوجود اس کے کہ ندوۃ العلماء کے قیام، نشو ونما اور عروج وارتقاء کی ساری داستان بنیادی طور پر مولانا ہی کی ذات سے وابستہ ہے۔ انہوں نے ہمیشہ دوسروں کو آگے بڑھایا اور قیادت کے اسٹیج پر اپنا صحیح وممتاز مقام (جو در اصل ان ہی کا حق تھا) حاصل کرنے کی کوشش درکنار کبھی خواہش بھی نہیں کی اور زبان حال سے یہ کہتے رہے کہ:۔

"مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں"

وہ اس سطح سے بہت بالاتر تھے، اور ان حدود سے بہت آگے نکل چکے تھے، یہ عہدہ ومنصب اور ناموری ان کے لئے اب "پیر کی بیڑی" سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی، اس موقع پر یہی رنگ غالب رہا، چنانچہ اتنے زبردست ذخیرے میں صرف ۴۰ر کتابیں مولانا کے نام سے طبع ہوئی ہیں، ان میں بھی بعض کتابوں پر مولانا کا نام ہے اور بعض پر ان کی کنیت ابو احمد ہے، یہاں تک کہ ان کی مشہور کتاب 'فیصلۂ آسمانی' بھی ابو احمد رحمانی ہی کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

---

(۱) کمالات محمد یہ" بنام حاجی لیاقت حسین صاحب بھاگلپوری، ص ۳۷۵ و ۳۷۶

ان کتابوں کو مولانا اکثر بڑی تعداد میں مفت تقسیم کرتے، اور مناسب جگہوں پر پہنچاتے مولانا کے ہزاروں روپیہ اس مد پر خرچ ہوئے لیکن انہوں نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی، اس وقت ان کے سامنے صرف ایک مقصد تھا، وہ یہ کہ ہر قیمت پر اس تحریک کا خاتمہ ہونا چاہئے، اپنے مریدین کو بھی جن کی تعداد ہزاروں سے متجاوز تھی، مولانا نے اس کام پر لگانا چاہا، اور جدید اسلوب میں اس مقصد کے لئے ان کو متحد کرنے کی کوشش کی۔ وہ چاہتے تھے کہ صرف انفرادی حیثیت سے نہیں بلکہ اجتماعی حیثیت سے اور متحد اور منظّم طریقے سے قادیانیت پر بھرپور حملہ کیا جائے۔

حاجی لیاقت حسین کو (جن کا ذکر ابھی گزر چکا ہے) مولانا نے بڑے اہتمام کے ساتھ اس بات کی طرف متوجہ کیا ہے۔ ایک خط میں ان کو لکھتے ہیں:۔

> ''میں چاہتا ہوں کہ مخالفین اسلام کی بے انتہا سعی اور کوشش کا جواب دیا جائے، بالخصوص مرزائی جماعت کا فتنہ فرو کرنے میں جو کچھ ہو سکے اس سے دریغ نہ کیا جائے اور نہایت انتظام کے ساتھ یہ سلسلہ میرے بعد بھی جاری رہے، اس لئے رائے یہ ہے کہ ایک انجمن قائم کی جائے جس کا نظم تم لوگ اپنے ہاتھ میں لو، اور اس کے لئے ہر وہ شخص جو مجھ سے ربط و تعلق رکھتا ہے، وہ اس میں حسب حیثیت التزام کے ساتھ ماہانہ شرکت کرے، ورنہ جو شخص میرے اس دینی اور ضروری کہنے کی طرف بھی متوجہ نہ ہوگا۔ میں اس سے ناخوش ہوں اور وہ خود یہ سمجھ لے کہ اس کو مجھ سے کیا تعلق باقی رہا۔'' (۱)

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا کے ان مریدین، مسترشدین اور خلفاء کے ذریعہ بہت بڑا کام ہوا، اور انہوں نے مولانا کی رفاقت، محبت اور اطاعت کا حق ادا کر دیا، مولانا کے ایک مسترشد اور مجاز مولانا عبدالرحیم صاحب کے ذریعہ مونگیر اور بھاگلپور کے دیہاتوں میں سیکڑوں ہزاروں اشخاص کی اصلاح ہوئی، اور وہ ان کے ہاتھ پر تائب ہوئے، دیہاتوں میں مولود کے جلسے اس اصلاح کا بڑا ذریعہ بنے، اور ان سے بہت فائدہ ہوا۔ مولانا ایک طویل اور مفصل مکتوب میں ان کو لکھتے ہیں:۔

---

(۱) کمالات، ص ۲۷۶

''مولود شریف کے جلسے کراؤ، اور اس میں ان کے (مرزا صاحب اور ان کے ساتھی) حالات بیان کرو جس مقام کے لوگ نہایت غریب ہیں ان سے کہو کہ تم سنو، شرینی وغیرہ کی کچھ ضرورت نہیں۔ میں تمام محبین سے کہتا ہوں کہ وہ تمہاری مدد کریں، تم کو ہر جگہ بھیجیں، یہاں سے رسائل قادیانی کے متعلق منگا کر ان لوگوں کو دو، اور اس خط کی متعدد نقلیں کر کے جو ہمارے احباب ہیں، ان کو بھجوادو۔'' (۱)

مولانا کو اس سنگین خطرہ کا جو مسلمانوں کے سروں پر منڈلا رہا تھا پورا احساس تھا، اور اس کے مقابلہ کا ان کو اس قدر زائد اہتمام تھا کہ یہ کہا کرتے تھے کہ:۔

''اتنا لکھو اور اس قدر طبع کراؤ اور اس طرح تقسیم کرو کہ ہر مسلمان جب صبح سو کر اٹھے تو اپنے سرہانے ردقادیانی کی کتاب پائے۔'' (۲)

اس بات سے مولانا کے اس اہتمام و توجہ اور خلش و بے چینی کے ساتھ اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت اس تحریک نے کتنی خطرناک اور تشویش انگیز صورت اختیار کر لی تھی اور اس بات کی ضرورت صاف محسوس ہو رہی تھی کہ اس کے سد باب کے لئے اسی دلسوزی اور قربانی سے کام لیا جائے جس سے مولانا نے کام لیا، اور اپنے آرام اور صحت کی پرواہ کیے بغیر اس کے لئے ہر قسم کی جدوجہد اور قربانی میں سب سے پیش پیش رہے۔

ایک صاحب (مولوی نظیر احسن صاحب بہاری) جن کا خط پاکیزہ تھا، صرف اس کام پر مامور تھے کہ وہ مسودات صاف کریں، وہ دونوں پیروں سے مفلوج تھے، اگر کبھی مسودات صاف کرنے میں تاخیر ہو جاتی تو مولانا ان سے فرماتے کہ:۔

''محنت سے کام کرو، تمہیں جہاد کا ثواب ملے گا''۔

ایک مرتبہ مولوی صاحب نے پوچھا کہ:۔

''کیا مجھ کو جہاد بالسیف کا ثواب ہوگا؟

فرمایا:۔

''بیشک! اس فتنۂ قادیانیت کا استیصال جہاد بالسیف سے کم نہیں۔'' (۳)

---

(۱) خطوط بنام مولانا عبدالرحیم صاحب، ص۴ (۲) مقالہ متعلقہ سوانح، ص۴۶ (۳) ایضاً: ۴۷

تہجد کے وقت تصنیف

مولانا کا معمول تھا کہ ۳ بجے تہجد کے لئے اٹھ جاتے تھے، اب یہ تہجد کا وقت بھی مولانا نے ردقادیانیت کے لئے وقف کر دیا، اکثر یہ وقت تصنیف میں گزرتا۔ بعض دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ مولانا تہجد چھوڑ کر ردقادیانیت پر کتابیں لکھا کرتے تھے۔

اکثر ایسا ہوا کہ مولانا نے اپنی ضرورتوں کو مؤخر کر کے پہلے کتابوں کی اشاعت کا انتظام کیا، اور جو کچھ ان کے پاس اس وقت ہوا وہ سب بے چون وچرا اس پر صرف کر دیا۔ جن مبلغین کو قادیانیت کے رد کے لئے مختلف مقامات پر بھیجنا ہوتا، پہلے ان کو اس کی تربیت دیتے اور اس کی کوشش کرتے کہ قادیانیت سے ان کی واقفیت بہت گہری ہو، تا کہ وہ خود اعتمادی اور کامیابی کے ساتھ یہ اہم فریضہ انجام دے سکیں اور عین وقت پر لاجواب اور شرمندہ نہ ہوں جس کا عام مسلمانوں پر بہت برا اثر پڑ سکتا ہے۔

مریدین واہل تعلق میں جو اہل علم حضرات تھے، ان کو بھی اس بات پر آمادہ کرتے رہتے کہ وہ قادیانیت کے رد میں رسائل اور کتابیں لکھیں۔ غرض اس سلسلہ کی جو بھی کوشش ان کے لئے ممکن تھی، اس میں انہوں نے کوئی کسر باقی نہ چھوڑی، اور ان ساری صلاحیتوں وقوتوں اور ذرائع ورسائل کو پوری طرح استعمال کیا جو ان کے دسترس میں تھے۔

مولانا کے خطوط

مولانا نے اپنے مریدین، خلفاء اور اہل تعلق کو قادیانیت کے سلسلہ میں جو خطوط لکھے ہیں وہ ان کے افکار اور جذبات کو سمجھنے کے لئے بہت مستند ذریعہ اور قیمتی ذخیرہ ہیں۔ ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کی نگاہ میں اس تحریک کے مقابلہ اور استیصال کی کس درجہ اہمیت تھی اور وہ اس بارے میں کتنے ذکی الحس ہو گئے تھے اور مضطرب و بے چین رہتے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کے سب مسترشد اور اہل تعلق اس کے مقابلہ کے لئے اپنی ساری قوت اور صلاحیت کے ساتھ صف آرا ہو جائیں۔

ان کے نزدیک (جیسا کہ اوپر گزرا ہے) اس فتنہ کا مقابلہ اس وقت جہاد بالسیف

سے کم نہ تھا، اورانہوں نے جس جوش اور غیرت اورحمیت ایمانی کے ساتھ اس کا ہر محاذ پر مقابلہ کیا، اس سے معلوم ہوا کہ یہ ان کا محض نظریہ اور رائے نہ تھی، بلکہ ان کی زندگی کی ایک ایسی حقیقت تھی جس کا سیدھا تعلق ان کے قلبی احساسات اور جذبات سے تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو جو محبت وعشق تھا، یہ سب اس کی کرشمہ سازی تھی، اور اسی نے ان کے اندر یہ سیمابی کیفیت پیدا کردی تھی۔

کارزلف تست مشک افشانی ماعاشقاں
مصلحت راتہمتے برآہوئے چیں بستہ اند

حاجی لیاقت حسین بھاگلپوری کو ایک مفصل خط کے آخر میں لکھتے ہیں:۔

''تم کو چاہئے کہ اپنے تمام گاؤں کے بھائیوں اور جو لوگ تمہارے زیر اثر ہیں، ان کو اس کام میں نظام کے ساتھ متوجہ کرو، یہ میری تحریر معمولی نہیں ہے، یہ کام تو خدا چاہے ہوگا اور ضرور ہوگا، دیکھئے کہ کون اس خدائی کام کو انجام دیتا ہے اور کون اس سے محروم رہتا ہے۔''(۱)

مولانا نے اپنے مریدین سے کبھی چندہ نہیں لیا اور نہ اس کو پسند کرتے تھے، بلکہ جب بھی موقع ملتا خود ان کی امداد میں پیشقدمی کرتے، یہاں تک کہ اپنے خاص معتمدین اور خدام سے بھی فرمائش کرنے کے روادار نہ ہوئے، لیکن اس موقع پر انہوں نے اپنے مزاج کے خلاف بہت صفائی کے ساتھ اپنے مریدین کو مالی تعاون پر بھی آمادہ کیا۔

حاجی صاحب موصوف کو اپنی ضعف وعلالت کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں:

''للہ الحمد! میں بالکل سفر آخرت کے لئے تیار ہوں اور یہ کام نہایت ضروری ہے، میں نے کبھی تم سے کسی قسم کا چندہ نہ لیا، نہ کسی چیز کی فرمائش کی، مگر اب یہ کام اس قدر ضروری ہے کہ بے کہے بات نہیں بنتی۔''

اس خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

''جب لوگ کفر اور ارتداد اپنا جان ومال قربان کرکے خریدتے ہیں تو تعجب ہے کہ سچے مسلمان دین کی خدمت کے لئے تھوڑا سا اپنے ''ہاتھ کا میل'' بھی نہ

(۱) کمالات:۲۷۷

دے سکیں۔''(۱)

ایک عقیدت مند کو جنہوں نے حاجی لیاقت حسین کو اس کام کے لئے کچھ رقم پیش کی تھی، شکریہ کا خط لکھتے ہیں:۔

''تم نے جو کچھ عزیزی لیاقت حسین کو نہایت ضروری دینی کام کے لئے دیا، وہ اس فقیر کو پہنچا، اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا کافی بدلہ دونوں جہان میں عنایت کرے، تم جانتے ہو کہ میں نے یا میرے خاص آدمی نے کبھی کسی سے کچھ طلب نہیں کیا۔ اس وقت میاں لیاقت حسین تین سو سے کچھ زائد روپیہ لائے، جنہوں نے خوشی سے روپیہ دیا اللہ ورسولؐ ان سے خوش ہوا، اور یہ فقیر ان سے بہت خوش ہوا، میں تمہیں اس سے بھی آگاہ کرتا ہوں کہ اس وقت جھوٹ بہت شائع ہے اور دینی حمیت جاتی رہی ہے، اس لئے اکثر دینی کام میں صرف کرنا نہیں چاہتے، اور دینی کام کرنے والوں کو الزام لگا کر دوسروں کو بھی روکتے ہیں۔''(۲)

مولانا عبدالرحیم صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

''تم سے جہاں تک ہوسکے اس گمراہ (۳) کا پیچھا کرو، جہاں جہاں وہ جائے تم بھی جاؤ، اور دو باتیں کرو:۔ اول یہ کہ جو غرباء و معذورین یہاں نہ آسکیں ان کو ہماری طرف سے بیعت کرو اور سلسلۂ رحمانیہ میں داخل کرکے انہیں ایسی ہدایات کرو کہ وہ اس سلسلہ کے عاشق ہوجائیں اور کسی گمراہ کی باتوں کا ان پر اثر نہ ہو۔ دوئم یہ کہ میں تم سے زبانی بھی کہہ چکا ہوں اور اس وقت خاص کر تم کو لکھ رہا ہوں تاکہ خوب مستعدی سے کام کرو، اور دیکھو محض اللہ کے واسطے کرو، جب انسان اللہ کا ہوجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے سب کاموں کا کفیل ہوجاتا ہے۔''(۴)

اس طرح کے خطوط مولانا اپنے خاص مریدین اور خلفاء کو برابر ارسال کرتے رہتے تھے، اور ان کو پوری قوت کے ساتھ اس نئی گمراہی اور بغاوت کے مقابلہ پر کمربستہ

---

(۱) کمالات: ۲۷۶ (۲) کمالات: ۲۷۹ (۳) کچھ قادیانی مبلغ گوگری ضلع مونگیر اور اس کے آس پاس رسائل وغیرہ تقسیم کررہے تھے، ان میں غالباً سعید مختار بھی تھا جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔

(۴) خطوط بنام مولانا عبدالرحیم: ۳۰

ہو جانے کی تلقین کرتے، ان لوگوں کو مولانا سے جو غیر معمولی تعلق اور شیفتگی تھی اس کی وجہ سے یہ خطوط سیکڑوں مواعظ اور رسالوں کا کام کر رہے تھے اور ان سے بڑے بڑے نتائج حاصل ہوتے تھے۔

چونکہ مولانا نے اس سے پہلے کبھی اس قسم کے مالی تعاون کی اپیل نہیں کی تھی اس لئے اس کا بھی بہت اثر پڑ رہا تھا، اور ہر شخص اس مہم میں مالی طور پر حصہ لینے کے لئے کوشاں تھا۔

مولانا کی اس کامیاب جدو جہد میں ان حضرات کے پر خلوص تعاون کو بڑا دخل ہے، اور اس میں ان خطوط و مکاتیب کا بلاشبہ بڑا حصہ ہے، جنہوں نے ان کو اس کی ترغیب دی اور اس پر آمادہ کیا۔

فیصلۂ آسمانی

مولانا کی سب سے پہلی اور سب سے اچھی تصنیف ''فیصلہ آسمانی'' ہے جو قادیانیوں کے حق میں واقعی ''فیصلۂ آسمانی'' ثابت ہوئی، یہ کتاب تین جلدوں میں ہے، اس کے تین ایڈیشن مولانا کی زندگی ہی میں شائع ہو گئے، لیکن کسی قادیانی کو اس کا جواب دینے کی ہمت نہ ہوئی۔ مولانا کی وفات کے بعد بھی کسی قادیانی نے اس کا جواب دینے کی جرأت نہ کی۔ قادیانیت کے خلاف سارے لٹریچروں میں جواب تک لکھا گیا ہے، یہ کتاب ایک خاص امتیاز رکھتی ہے، اور اپنے محکم طرز استدلال، اسلوب کی وضاحت اور صفائی، اور صحیح و طاقتور گرفت کے اعتبار سے بہت کم کتابیں اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔

اس راہ کے نشیب و فراز کو دیکھے ہوئے، اور اس کے ایک بڑے مبصر (۱) کی رائے یہ ہے کہ قادیانیت کے رد میں لکھی ہوئی اکثر کتابوں میں بعض بعض جگہ احتمال کی گنجائش نکل آتی ہے لیکن اس کتاب میں کسی جگہ احتمال کی گنجائش، یا استدلال میں کوئی خامی اور کمزوری نظر نہیں آتی۔

حقیقت یہ ہے کہ کتاب حشو و زائد اور غیر ضروری دلائل سے بالکل پاک ہے، اور اس میں اپنے جذبات کو تسکین دینے کے بجائے قاری کو مطمئن کرنے کی زیادہ کوشش کی

---

(۱) حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ۔

گئی ہے۔ دوسری طرف لکھنے والے کے دردوسوز اور اخلاص وحسن نیت نے اس کی قیمت وافادیت اور قوت وتاثیر میں اور اضافہ کر دیا ہے۔

مولاناؒ نے اس کتاب میں قادیانیت کی طرف عام مسلمانوں کے میلان کی جو صحیح گرفت کی ہے اس سے اس کا سوال کا بڑی حد تک جواب مل جاتا ہے کہ اگر قادیانیت واقعی نبوت محمدیؐ کے خلاف بغاوت اور ایک متوازی دین کی دعوت ہے تو پھر اس قدر مسلمان اس کی طرف کیوں مائل ہو گئے اور انہوں نے اس میں کیا خاص فائدہ محسوس کیا اور اس سے ان کے کن جذبات کی تسکین ہوئی۔ اس مسئلہ پر فیصلہ آسمانی حصہ اول میں روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''حضرت مسیحؑ اور حضرت مہدیؑ کے آنے کی خبریں حدیثوں میں اس قدر آئی ہیں، اور مشہور ہیں کہ ہر خاص وعام جانتا ہے، مگر شاذ ونادر بہت سے سچے مسلمان اسکے منتظر ہیں خصوصاً اس نازک وقت میں کہ مسلمانوں کی دینی ودنیاوی ہر طرح کی حالت نہایت خراب بلکہ معرض زوال میں ہورہی ہے، ایسے وقت میں حضرت مسیحؑ کے آنے کا مژدہ نہایت ہی مسرت بخش ہوسکتا ہے۔'' (۱)

اس کتاب میں مولاناؒ نے قادیانیت کے تجزیہ وتحلیل اور جانچ کے لئے دو تین اصول خاص طور پر پیش نظر رکھے ہیں۔ ان کے نزدیک قادیانیت پر غور کرنے کا عام فہم اور صحیح طریقہ یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کی آمد اور دعوائے نبوت سے دنیا کو اور مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچا۔ دوسرے یہ کہ جو علامات اور صفات حضرت مسیحؑ یا امام مہدیؑ کی احادیث میں بیان کی گئی ہیں وہ مرزا صاحب میں کہاں تک پائی جاتی ہیں، اور تیسرے یہ دیکھا جائے کہ جس شخص نے اتنا بڑا دعویٰ کیا ہے اس کی نجی زندگی اور ذاتی حالات کیا ہیں۔ وہ سچا ہے یا جھوٹا، منہاج نبوت تو بڑی چیز ہے، اس کی زندگی صلحاء امت یا عام راست باز اور شریف النفس مسلمانوں کے معیار پر بھی پوری اترتی ہے یا نہیں؟۔

کتاب کی تمہید میں مولانا لکھتے ہیں:۔

''ایک مختصر بات عام فہم کہنا چاہتا ہوں اسے ملاحظہ کیا جائے، حضرت مسیحؑ

---

(۱) فیصلہ آسمانی، ص ۳

کے آنے کی خبر جناب سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دی، اور صحابہؓ اور تابعین اور تمام علماء دین نے اس پر یقین کیا، اس سے ظاہر ہے کہ بڑی مہتم بالشان خبر ہے، اور نہایت ظاہر ہے کہ یہ اہتمام اور شان صرف اس وجہ سے ہے کہ ان کی ذات مقدس سے دینی فائدہ بہت کچھ ہوگا، مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی حالت ان کی برکت سے درست ہوجائے گی، صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں بغض وعداوت نہ رہے گا، روپے پیسے کی وہ کثرت ہوگی کہ کسی مسلمان کو ہدیہ اور تحفہ لینے کی طرف توجہ نہ ہوگی، دنیا بھر میں دین اسلام کو غلبہ ہوگا، ان میں سے کسی بات کا شائبہ بھی مرزا صاحب کے وجود سے نہیں پایا گیا، بلکہ سب باتیں برعکس ہیں، غور سے دیکھا جائے کہ مسلمانوں میں کس قدر بغض وعداوت ہے، کس قدر افلاس ہے، اور دنیا میں کس قدر تفرق ادیان ہے، اور پھر یہ کہ اسلام کس قدر ضعیف ہوگیا ہے۔'' (۱)

آگے ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

''اگر مرزا صاحب اپنے دعوے میں سچے ہوتے تو ان کے صحبت یافتہ زمانہ کے لوگوں سے نرالا ڈھنگ سے رکھتے کہ ہر طرف سے قبولیت کی نگاہ ان پر پڑتی، مگر حالت برعکس ہے''۔(۲)

مولانا لکھتے ہیں کہ دوسرا طریقہ علماء کے لئے ضرور مفید ہے لیکن عام مسلمانوں کی اصلاح کے لئے زیادہ کارگر نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ مولانا نے کتاب کے پہلے حصے میں یہی آخری طریقہ کار اختیار کیا ہے، اور ان کے نجی حالات اور اقوال و پیشگوئیوں کو ان کے برسر حق یا برسر باطل ہونے کا معیار بنایا ہے، اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ سچائی میں سب سے اول درجہ رکھتا ہے یا نہیں؟ اگر ذرا بھی سچائی میں گرا ہوا پائیں تو اس سے اجتناب کریں۔ میں نے اس رسالہ میں اسی طریقے کو اختیار کیا ہے کہ خاص وعام اس سے مستفید ہوں اور بذات خود فیصلہ کرسکیں، مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ہمارے صدق یا کذب کو

(۱) فیصلۂ آسمانی ص:۴ (۲) ایضاً ص:۵

جانچنے کے لئے ہماری پیش گوئی سے بڑھ کر اور کوئی امتحان نہیں ہوسکتا (آئینہ کمالات اسلام ص:۲۸۸)......اس لئے میں نے ان کی پیش گوئیوں پر نظر کرنا مناسب سمجھا، اور پیشگوئیوں میں اس پیشگوئی کو اختیار کیا جو ان کے (مرزا صاحب) کے نزدیک نہایت عظیم الشان ہے، اور جس کی شرح سے ان کے ذاتی تقدس کا حال طالب حق روشن دلیل سے معلوم کرسکیں"۔(۱)

کتاب کا پہلا حصہ مرزا صاحب کی "منکوحہ آسمانی" سے متعلق ہے، اور اس میں تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ان کے سارے الہامات اور پیشگوئیوں کو حقیقت اور واقعہ کے لحاظ سے اس طرح غلط اور جھوٹا ثابت کیا گیا ہے کہ کوئی انصاف پسند اور غیر جانبدار انسان مطمئن ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دوسرے اور تیسرے حصوں میں ان کی مزید غلط بیانیوں اور دعووں کا پردہ فاش کیا ہے، اور آیات قرآنیہ، احادیث نبویہؐ، دلائل عقلیہ، حالات موجودہ اور واقعات گزشتہ ہر پہلو سے ان کے کذب وافتراء، غلط بیانی اور فریب دہی کے ایک ایک جزو کی تشریح کی ہے اور ان کے سارے دلائل کا مکمل پوسٹ مارٹم کیا ہے۔

دوسرے حصہ میں خود مرزا صاحب کی زبان سے ایسے اقوال پیش کئے ہیں جو ان کے خلاف پڑتے ہیں اور وہ ان کے کاذب یا صادق ہونے کا فیصلہ کرنے کے لئے کافی ہیں، نیز ان باتوں کی تردید کرتے ہیں جو مرزا صاحب نے قرآن وحدیث کی طرف منسوب کی ہیں اور قرآن وحدیث ان سے بری ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے مولانا کے وسعت علم ومطالعہ، معاملہ فہمی، اور دقیقہ رسی، حقیقت پسند اور دلنشں، مؤثر اور سادہ طرز تحریر کا پورا اندازہ ہوتا ہے جو کتاب کی ایک ایک سطر سے نمایاں ہے، کسی گنجلک اور پیچیدہ طرز تحریر، کمزور استدلال یا کسی الجھانے والے مسئلہ سے کتاب بالکل پاک ہے، اور یہی کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت اور قیمت ہے۔

مرزا صاحب نے اپنے کمال واعجاز کے ثبوت کے لئے "اعجاز احمدی" لکھی یا لکھوائی تھی اور اس کا دعویٰ کیا تھا کہ اس رسالہ اور قصیدۂ اعجازیہ کی ادبی بلاغت اور فنی کمال کی نظیر کوئی دوسرا پیش نہیں کرسکتا۔ مولانا نے اس قصیدہ کا بہت پرلطف قصہ بیان کیا ہے اور اس

۱۔فیصلۂ آسمانی ص:۶

سارے جال کا تار و پود بکھیر دیا ہے جو مرزا صاحب نے علماء اور عام مسلمین دونوں کو بیک وقت فریب دینے کے لئے پھیلایا تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ اس جال میں خود ہی گرفتار ہوگئے، اور یہ تدبیر ان کے لئے الٹی پڑ گئی۔

مرزا صاحب نے ۵ر نومبر ۱۸۹۹ء میں یہ اعلان کیا تھا کہ:۔

''اے میرے مولا! اگر میں تیرے حضور میں سچا ہوں تو ان تین سالوں کے اندر جو جنوری ۱۹۰۰ء سے آخر دسمبر ۱۹۰۲ء تک ختم ہو جائیں گے، کوئی ایسا نشان دکھلا جو انسانی ہاتھوں سے بالاتر ہو، مگر تین برس کے اندر میری تائید اور تصدیق میں کوئی نشان نہ دکھلاوے، تو میں نے اپنے لئے یہ قطعی فیصلہ کرلیا ہے کہ اگر میری یہ دعا قبول نہ ہو تو میں ایسا ہی مردود اور ملعون اور کافر اور بے دین اور خائن ہوں جیسا کہ مجھے سمجھا گیا''۔

مولاناؒ لکھتے ہیں کہ:۔

''اس دعا کے بعد (مرزا صاحب) تین برس تک اسی فکر و تجویز میں رہے کہ کوئی نشان تراش کر مسلمانوں کو دکھایا جائے تا کہ میں اپنے اقرار سے ملعون و کافر قرار نہ پاؤں۔ میرے خیال میں انہوں نے یہ تدبیر سوچی کہ ہندوستان میں عربی ادب کا مذاق نہیں ہے، اس لئے ایک عربی قصیدہ لکھوا کر اور اس کی تمہید اردو میں لکھ کر رسالہ شائع کر کے اعجاز کا دعویٰ کیا جائے۔ اس زمانہ میں ایک عرب طرابلس کے رہنے والے ہندوستان میں آئے ہوئے تھے، جابجا وہ پھرتے رہے اور حیدرآباد میں ان کا قیام زیادہ رہا ہے، یہ عربی کے شاعر تھے اور مزاج میں آزادی بھی شاعروں کی سی رکھتے تھے۔ اس شہر میں مرزائی زیادہ ہیں، انہوں نے مرزا صاحب سے ربط کرادیا اور خط و کتابت ہونے لگی۔ انہوں نے قصیدہ کی فرمائش کی، عرب صاحب نے روپیہ لے کر قصیدہ لکھ دیا۔ مولانا محمد سہول صاحب پورینوی بھاگلپوری کہتے ہیں کہ حیدرآباد میں میں نے اس سے ادب کی بعض کتابیں پڑھی ہیں، بڑا ادیب تھا کہتا تھا کہ مجھے روپیہ کی ضرورت پیش آئی تھی، میں نے مرزا کو لکھا، اس نے قصیدہ لکھوایا میں نے لکھ دیا، اس نے روپیے مجھے دیئے۔'' (۱)

---

(۱) فیصلۂ آسمانی ص ۵۹

اس شخص نے جان بوجھ کر کچھ ایسی غلطیاں بھی قصیدہ میں شامل کردی تھیں، جو اہل زبان سے مستبعد ہیں۔اس کے متعلق مولانا لکھتے ہیں:۔

''سعید (شاعر کا نام) مرزا کو جھوٹا جانتا تھا، اور یہ بھی جانتا تھا کہ عربی ادب سے مرزا کو مس نہیں ہے اس لئے اس نے قصداً یہ غلطیاں رکھیں تاکہ اہل علم اس سے واقف ہوکر اس کی تکذیب کریں۔ چونکہ عرصہ تک ہند میں رہا ہے اور بعض علوم عقلیہ اس نے یہاں پڑھے ہیں اس لئے وہ ہندی محاورات سے بھی واقف تھا، اس لئے مرزا صاحب کو فریب دیا، اور بعض ہندی الفاظ بھی قصیدہ میں داخل کردیئے۔ الحاصل یہ قصیدہ مرزا کا اعجاز نہیں ہے اگر اسے اعجاز کہا جائے تو سعید شامی کا اعجاز ہوگا'' (۱)

غرضکہ کتاب کے تینوں حصوں میں مرزا صاحب کی ایک ایک دلیل، ایک ایک اعجاز اور الہام وپیشگوئی کو لے کر عقل ونقل ہر پہلو سے اس پر کلام کیا ہے، اور بغیر کسی جارحیت اور جذباتیت کے اس پر علمی طور پر ایسی تنقید کی ہے جو ہر طبع کے لئے قابل قبول ہو، اور وہ لوگ جو کسی ضد اور شرارت کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی سادہ لوحی اور عقید تمندی، یا کسی اور قسم کے ذہنی وقلبی تاثر کے ماتحت اس کا شکار ہوگئے ہیں، ان پر وہ اصل حقیقت ظاہر ہوجائے جو منطقی بحثوں، نکتہ آفرینیوں، خالص علمی مباحث، اور اختلافی مسائل کے پردہ میں چھپ کر عام مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل ہوگئی ہے، اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کو مرزا صاحب کی زندگی اور اقوال واعمال سے وہ نفرت اور بیزاری پیدا نہیں ہوتی جو مطلوب ہے اور کمال ایمان کی علامت ہے۔

جو اسلوب اور طرز استدلال مولانا نے اختیار کیا، عام اصلاح وہدایات کے لئے اس سے بہتر اسلوب کوئی اور نہیں ہوسکتا، اور نہ وہ اس درجہ مفید ثابت ہوسکتا ہے، اس لئے کہ اس میں دماغوں کو علمی اور واقعاتی طور پر مطمئن کرنے، اور دلوں میں اس نئے دین کی طرف سے نفرت وبیزاری پیدا کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔

فیصلۂ آسمانی کا تیسرا حصہ پہلی مرتبہ ۱۳۳۲ھ میں چھپا تھا اور اس میں مرزائیوں کو

---

(۱) فیصلۂ آسمانی، ص:۵۹

چیلنج کیا گیا تھا کہ وہ اس کا جواب دیں۔ ۱۳۲۷ھ میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا، اور اس میں اعلان کیا گیا کہ جو شخص اس کتاب کا جواب دے گا، اس کو تین ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔ لیکن کسی ایک قادیانی نے بھی اس کا جواب دینے کی ہمت نہ کی۔

فیصلۂ آسمانی کا خلاصہ انگریزی میں بھی کیا گیا، لیکن شاید اس کے شائع ہونے کی نوبت نہ آسکی۔

شہادت آسمانی

مولانا کی دوسری اہم تصنیف ''شہادت آسمانی'' ہے۔ یہ دو حصوں میں ہے، ''پہلی شہادت آسمانی'' اور ''دوسری شہادت آسمانی''۔ ۱۳۱۲ھ کے رمضان میں چاند اور سورج میں ایک ساتھ گہن ہوا۔ مرزا صاحب نے اس واقعہ کو بڑے فخر سے اپنے حق میں ایک آسمانی شہادت کے طور پر اپنی مہدویت کے ثبوت میں پیش کیا، اور یہ اعلان کیا کہ:۔

''حدیث میں آیا ہے کہ ان دونوں گہنوں کا اجتماع امام مہدیؑ کی علامت ہے، اس لئے مرزا صاحب کی مہدویت ثابت ہوگئی۔''

ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ:۔

''رمضان میں ان دو گہنوں کا اجتماع کسی مدعی مسیحیت یا مہدویت کے زمانہ میں نہیں ہوا، صرف ان ہی کے عہد میں ہوا ہے۔''

قادیانیوں میں اس بات کا بڑا ذکر تھا، اور وہ اس کو ہر جگہ مرزا صاحب کی صداقت کے ثبوت میں پیش کیا کرتے تھے۔

مولانا نے یہ کتاب ''شہادت آسمانی'' دراصل اسی خیال کی تردید میں لکھی ہے، اور بہت مدلل طریقے پر اس دعویٰ کو غلط ثابت کیا ہے۔

سب سے پہلے مولانا نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس دعوے کی بنیاد مرزا صاحب نے جس حدیث پر رکھی ہے وہ حدیث اس لائق ہرگز نہیں ہے کہ اس سے یہ عقیدہ ثابت کیا جائے کہ مہدی موعود کے وقت میں ایسے گہنوں کا ہونا ضروری ہے، اور وہ گہن امام مہدی کی علامت ہیں۔

دوسری بات انہوں نے یہ ثابت کی ہے کہ ۱۳۱۲ھ کا گہن ایک معمولی گہن تھا جو اپنے وقت پر ہوا، اور اس طرح کے گہن پہلے بھی بہت ہو چکے ہیں۔

چنانچہ اپنے نئے قول کی تائید میں ایک ماہر ہیئت مسٹر کیتھ کی کتاب (Use of Globe) جو لندن میں ۱۸۶۹ء میں چھپی، اور ایک ضخیم فارسی کتاب ''حدائق النجوم'' جو ہیئت فیثا غورثی کے بیان میں ہے، اور ۱۱۵۸ صفحات پر مشتمل ہے، پیش کی۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:۔

''مسٹر کیتھ نے سو برس (یعنی ۱۸۰۱ء سے ۱۹۰۰ء تک) کی فہرست دی ہے، اس فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سو برس کے عرصہ میں سورج اور چاند کا مشترکہ گہن رمضان مبارک میں پانچ مرتبہ ہوا ہے۔ حدائق النجوم کی فہرست میں ترسٹھ سال کے اندر رمضان مبارک میں تین گہنوں کا اجتماع لکھا ہے''۔

اس کے بعد انہوں نے کتاب سے ۴۶ برس کی فہرست نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ:۔

''یہ کتابیں عرصہ دراز ہوا، طبع ہوئیں لیکن اب تک کسی نے ان غلطی کا الزام نہیں لگایا''

پھر انہوں نے یہ دکھایا ہے کہ:۔

''۱۲۶۸ھ میں گہنوں کا پہلا اجتماع ہوا، اور ان گہنوں کی تاریخ وہی ۱۳/ اور ۲۸/ رمضان ہے، جن تاریخوں کو مرزا صاحب مہدی کا نشان کہتے ہیں، اس گہن کے دیکھنے والے اب ابھی موجود ہیں، اس وقت مرزا صاحب کی عمر گیارہ برس کی ہوگی۔ ۱۳۱۱ھ کے رمضان میں اس گہن کا ظہور امریکہ میں ہوا، اس وقت مسٹر ڈوی مدعی مسیحیت وہاں موجود تھا''

مولانا لکھتے ہیں کہ:۔

''مرزا صاحب نے اس گہن کو بھی اپنی تائید میں پیش کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ مہدی کے وقت میں دو گہن ہوں گے، حالانکہ کسی حدیث میں یہ مضمون نہیں ہے۔ اس صریح جھوٹ کے علاوہ اس گہن کا وجود ہندوستان میں نہیں ہوا جہاں مرزا صاحب کا وجود ہے، بلکہ اس ملک میں ہوا جہاں

ان کی طرح ایک دوسرا مدعی رسالت موجود ہے۔''(۱)

۱۳۱۲ھ میں تیسرا گہن ہوا، اور یہی وہ گہن ہے جسے مرزا صاحب نے اپنی مہدویت کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ مولانا آگے لکھتے ہیں:۔

''یہ گہن اس حدیث کا مصداق کس طرح ہوسکتا ہے جس کی نسبت حدیث (دار قطنی) میں نہایت صاف طور پر ارشاد ہے:۔ لم تکونا منذ خلق اللّٰہ السموات والأرض ......اس جملہ کے معنی یہ ہیں کہ جب سے آسمان وزمین اللہ تعالیٰ نے پیدا کئے ہیں اس وقت سے (لے کر اس مہدیؑ کے وقت تک) ایسا چاند گہن اور سورج گہن کبھی نہ ہوا ہوگا، یعنی وہ دونوں گہن ایسے بے مثل اور بے نظیر ہوں گے کہ اس سے پہلے کسی وقت ان کی نظیر نہیں مل سکتی۔''(۲)

اس کے بعد انہوں نے بہت تفصیل سے یہ ثابت کیا ہے کہ امام مہدی کی جو خصوصیات وصفات احادیث میں بیان کی گئی ہیں، ان میں سے کوئی بھی مرزا صاحب پر منطبق نہیں ہوتی۔

مولانا کی اس تصنیف 'شہادت آسمانی' کا طرز استدلال اور اسلوب بیان فیصلہ آسمانی سے بہت ملتا جلتا ہے۔ دلائل کی مضبوطی، مستند تاریخی حوالوں اور واقعات سے استدلال، اور حدیث وقرآن سے اس طرح استنباط کہ کسی شک وشبہ، احتمال آفرینی، بے یقینی کی گنجائش باقی نہ رہے، اور دوبارہ استفسار وسوال کی ضرورت ہی پیش نہ آئے اور مخالفین اس سے کوئی غلط فائدہ نہ اٹھا سکیں، مولانا کے اسلوب کی خصوصیت ہے، لیکن ردقادیانیت کے سلسلہ میں یہ اسلوب اور طرز تصنیف بہت نمایاں ہوکر اور نکھر کر سامنے آیا ہے۔

مولانا کی دوسری تصنیفات پر ایک نظر

اس کے علاوہ مولانا کی جو تصنیفات ردقادیانیت میں ہیں، ان میں چشمۂ ہدایت، چیلنج محمدیہ، معیار صداقت، معیار المسیح، حقیقت المسیح، تنزیہ ربانی، آئینۂ کمالات مرزا نامہ حقانی زیادہ مشہور اور ممتاز ہیں۔ کل کتابوں کی تعداد ۵۰ کے قریب ہے۔ اس کے علاوہ

---

(۱) دوسری شہادت آسمانی، ص۲۶ و ۲۷ (۲) ایضاً: ۲۷

بہت سے ایسے رسائل بھی ہیں جو پہلے چھپے تھے اس کے بعد ختم ہو گئے اور پھر چھپنے کی نوبت نہ آسکی اوراب ان کا سراغ لگانا بھی آسان نہیں۔

دراصل مولانا نے تنہا وہ کام کیا جو ایک اکیڈمی بھی اتنے بہتر اور کامیاب طریقہ پر نہیں کرسکتی۔ قادیانیت کے خلاف یہ سارا لٹریچر مولانا ہی کے زور قلم کا نتیجہ ہے، اور انہوں نے اس کے خلاف مکمل مواد فراہم کر دیا ہے، اور اس کے ہر ہر پہلو کا پورا تجزیہ کیا ہے۔

رسالہ 'چیلنج محمدیہ' عربی، فارسی اور اردو تین زبانوں میں ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا، اور اس کی خوب اشاعت ہوئی۔ ایڈیٹر الفضل اور خلیفہ قادیان کو کئی مرتبہ بھیجا گیا لیکن مسلسل سکوت کے سوا اور کوئی جواب نہ ملا۔ اس میں مرزا صاحب کو خود ان کی زبان سے جھوٹا ثابت کیا گیا ہے۔

''چشمہ ہدایت'' کے آخر میں اعلان کیا گیا کہ جو اس کا جواب دے گا اس کو دس ہزار روپیہ پیش کیا جائے گا۔ اس رسالہ میں مرزا صاحب کے ۱۸/اقوال نقل کئے ہیں اور اس سے ان کو مفتری اور کاذب ثابت کیا ہے، بار بار چیلنج کے بعد بھی کسی نے اس کا جواب دینے کی کوشش نہیں کی۔

ایک عام فہم اور واضح دلیل جس کا مولانا نے تقریباً اپنی ہر کتاب اور ہر رسالہ میں ذکر کیا ہے، اور قادیانیوں کو سوچنے کی دعوت دی ہے۔ وہ یہ ہے کہ مرزا صاحب کہتے ہیں کہ مہدی علیہ السلام کے نزول کی علامت یہ ہے کہ تمام کافر اسلام لے آئیں گے، اور دنیا سے فسق وفجور اٹھ جائے گا۔ وہ انسان کے انصاف پسند اور سنجیدہ ذہن سے اپیل کرتے ہوئے بار بار کہتے ہیں کہ غور کرو مرزا صاحب کے آنے سے کیا یہ بات حاصل ہوئی جو انہوں نے بیان کی ہے۔

'معیار صداقت' میں لکھتے ہیں:۔

> ''ایک فتویٰ مرزا صاحب اور ان کے خلیفہ اور صاحبزادہ کا یہ ہے کہ جو کوئی مرزا صاحب پر ایمان نہیں لایا، وہ کافر ہے، اس کے پیچھے نماز ہرگز جائز نہیں ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ دنیا میں جو تقریباً ۲۳/کروڑ مسلمان تھے، وہ مرزا صاحب

کے وجود سے سب کافر ہو گئے بجز قلیل گروہ کے، اور کوئی کافر مسلمان نہیں ہوا۔"(۱)

قادیانیوں نے آخر میں قرآن مجید کی آیات سے استدلال کرنے کی کوشش کی، اور توڑ موڑ کر اس کے معنی بیان کرنے شروع کئے۔ مولانا نے اس کے رد میں 'معیار المسیح' کے نام سے ایک رسالہ لکھا، اور ایک ایک دلیل کو لے کر اس کی غلطی ظاہر کی۔

مولانا کے ان رسائل کے جواب میں سب قادیانیوں نے مل کر ایک رسالہ 'اسرار نہانی' لکھا، اور اپنی ناکامی کو چھپانے کے لئے مولانا کو خاص طور پر ہدف بنایا اور کوشش کی کہ عام مسلمان مولانا سے بدظن ہو جائیں، اس کے بعد ان کو مرزا صاحب کی طرف متوجہ کرنا آسان ہوگا۔ اس کے لئے انہوں نے دو تنخواہ دار مبلغین رکھے، اور ان کے ذمہ یہ کام کیا کہ وہ گاؤں گاؤں پھر کر سیدھے سادے مسلمانوں کے دلوں میں مولانا سے نفرت پیدا کریں، اور ان کی زندگی کو ان کے سامنے گھناؤنا بنا کر پیش کریں تاکہ ان کی وقعت اور محبت لوگوں کے دلوں سے نکل جائے جو قادیانیت کے راستہ میں ایک بڑی رکاوٹ ثابت ہو رہی ہے۔

مولانا نے مولانا عبدالرحیم مونگیری کے نام ایک طویل مکتوب میں اس کا مفصل ذکر کیا ہے۔ نیز "صحیفۂ رحمانیہ" میں بھی اس کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے:۔

"چونکہ اس جماعت کو خدا سے واسطہ نہیں ہے، اس لئے جواب سے عاجز ہو کر فحش کلامی اور بیہودہ گوئی کر کے حضرت مخدوم بہاری اور حضرت مجدد الف ثانی علیہما الرحمہ وغیرہ بزرگوں کو در پردہ اور حضرت مؤلف فیصلہ آسمانی کو علانیہ گالیاں دینا اور عوام کو بہکانا شروع کیا ہے"۔(۲)

"مرزائی نبوت کا خاتمہ" نامی ایک رسالہ مولانا نے اور لکھا اور ختم نبوت کو ثابت کیا، یہ رسالہ ۱۹۱۴ء میں دہلی میں شائع ہوا۔ ۱۹۲۵ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا، لیکن کوئی قادیانی اس کا جواب نہ دے سکا۔

قادیانیوں کی طرف سے ایک دلیل یہ دی جانے لگی تھی کہ:۔

"مدعی کاذب اور مفتری نہ باقی رہ سکتا ہے نہ پھل پھول سکتا ہے، لیکن مرزا

(۱) معیار صداقت، ص ۱۶ (۲) صحیفۂ رحمانیہ" نمبر ۱۱ و ۱۲

صاحب کو برابر کامیابی ہو رہی ہے، اور لوگ ان کے دائرہ میں داخل ہو رہے ہیں، اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مرزا صاحب حق پر ہیں۔"

اس کے رد میں مولانا نے ایک رسالہ "عبرت خیز" لکھا اور اس غلط خیال کی تردید کی، اور قرآن مجید اور تاریخ و واقعات کے حوالہ سے اس دعویٰ کی کمزوری واضح کی۔

مکتوب بنام استاد فرمانروائے دکن

خواجہ کمال الدین نے حیدر آباد میں زور و شور سے قادیانیت کی تبلیغ شروع کی تھی، اور اس کے لئے ایسا اسلوب اختیار کیا تھا کہ لوگوں کے جذبات بھی زیادہ مجروح نہ ہوں اور وہ تدریجی طور پر قادیانیت کو قبول کرنے کے لئے تیار بھی ہو سکیں۔

انہوں نے "صحیفۂ آصفیہ" کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا اور اس میں بڑی چابکدستی کے ساتھ مولانا ہی کے الفاظ میں "زہر کی تخم پاشی" کی۔ بدقسمتی سے ان کو دربار میں بھی تقرب حاصل ہو گیا، اور دوسری طرف انہوں نے یہ اعلان شروع کیا، کہ ہمارا مقصد صرف اشاعت اسلام ہے، اس کا جو اثر مسلمانوں پر پڑا وہ ظاہر ہے بالخصوص انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان اس اعلان سے بہت متاثر ہوئے جو ایک انگریزی تعلیم یافتہ کی طرف سے برابر کیا جا رہا تھا۔

مولانا اس صورت حال سے بہت بے چین اور مشوش تھے، اس کے لئے انہوں نے نظام حیدر آباد کے استاد فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خاں صاحب (۱) کو ایک مفصل مکتوب میں اس کی طرف توجہ دلائی اور اپنے درد دل کا اظہار کیا، خط اس شعر سے شروع کیا ہے۔

---

(۱) فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خاں صاحب حیدر آبادی معقول و منقول دونوں میں یکتائے روزگار تھے، حیدر آباد میں عرصہ تک مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ کے ساتھ رہے، اور مختلف علوم و فنون میں کمال حاصل کیا۔ ۱۲۹۵ھ میں نظام حیدر آباد کے استاذ مقرر ہوئے سن ۱۳۳۰ھ میں ریاست کا شعبۂ احتساب سنبھالا۔ ۱۳۳۲ھ میں فضیلت جنگ کا لقب ملا، اور قلمدان وزارت اوقاف سپرد ہوا۔ اس تبحر علمی، فضل و کمال، اور درس و مذاکرہ و تصنیف و تالیف کے ساتھ عبادات و اذکار وغیرہ کا بھی بڑا اہتمام تھا، مولانا انوار اللہ خاں صاحب حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے مجازین میں تھے، متعدد تصنیفات یادگار چھوڑیں جن میں "افادۃ الافہام" جیسی ضخیم تصنیف بھی شامل ہے جو رد قادیانیت میں ہے۔ ۱۳۳۵ھ میں حیدر آباد میں انتقال کیا۔ (نزہۃ الخواطر جلد ۸ باختصار)

اگر بینی کہ نابینا وچاہ است وگر خاموش بہ نشینی گناہ است

خط میں مولانا لکھتے ہیں:۔

''کچھ عرصہ سے سن رہا ہوں کہ خواجہ کمال الدین صاحب وکیل اور لاہور مرید خاص مرزا غلام احمد صاحب قادیانی وہاں پہنچے ہوئے ہیں، اور تمام مسلمانوں میں بہت غل مچا دیا ہے، اور سنا جاتا ہے کہ ہمارے شہر یار دکن کی نظروں میں بھی مقبول ہو گئے ہیں، یہاں تک کہ ہر ایک کو ان سے بات کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ مجھے سخت حیرت ہے، باوجودیکہ وہاں کے فرمانروا آپ کو بہت مانتے ہیں، اور یہ بھی جانتے ہوں گے کہ کتاب 'افادۃ الافہام' آپ ہی نے لکھی ہے، اور بہت عمدہ کتاب لکھی ہے، پھر اس کے مقابلہ میں 'صحیفہ آصفیہ' خواجہ صاحب کا تقسیم ہو رہا ہے، یعنی تریاق کے بعد زہر کی تخم پاشی ہو رہی ہے اور آپ خاموش ہیں۔''

ایک جگہ لکھتے ہیں:

''خواجہ صاحب ایک گروہ کے لیڈر اور خوش بیان شخص ہیں، چونکہ اس وقت قدرتی طور پر انگریزی تعلیم یافتہ حضرات میں اسلامی جوش پایا جاتا ہے (اگرچہ اسلامی احکام سے انہیں واسطہ نہ ہو)۔

اس لئے خواجہ صاحب کی اس خوش آئند آواز سے کہ ہم اشاعت اسلام کریں گے۔ اکثر ان کے معاون اور مددگار ہو گئے ہیں، اگرچہ ان کی نیت اچھی ہے مگر حقیقت حال سے واقف نہیں ہیں، انہیں اب تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ اس پردہ میں کیا راز ہے..... مولانا!..... آپ سے یہ غفلت ہوئی کہ آپ نے پہلے سے وہاں کے فرمانروا کو خواجہ صاحب کے حالات سے اطلاع نہیں دی، اور وہاں کے معززین کو پورے طور سے آگاہ نہیں کیا''۔

قادیانیوں کی حکمت عملی اور مصلحت پرستی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''خواجہ صاحب نے ان اطراف میں بھی دورہ کیا اور ان کے بیان ہوئے، اس سے معلوم ہوا کہ وہ نہایت ذاتی مصلحت اور گہری پالیسی سے کام لے رہے ہیں جہاں کسی واقف کار ذی علم نے کوئی سوال کیا تو اس کے جواب میں یہ کہہ کر

ٹال دیا کہ اس وقت میں جواب کے لئے تیار نہیں ہوں، اور عوام میں بیان کے بعد اکثر یہ کہہ دیا کہ میں نے حضرت مسیح موعود، مہدی مسعود سے یہ کہہ لیا تھا کہ میں صرف اسلام پر لیکچر دیا کروں گا اور کچھ نہ کہوں گا، اب اس پر غور کیجیے کہ مرزائی محبت کا تخم مسلمانوں کے دلوں میں بونے کا کیسا عمدہ طریقہ وہ برتتے ہیں۔"(۱)

اس خط میں مولانا نے خواجہ کمال الدین کے طریقہ کار اور ان کے تمام دعووں اور اعلانات پر روشنی ڈالی ہے، اور ان خطرات کی نشان دہی کی ہے جو اس نئے فتنہ سے مسلمانوں کو درپیش ہیں۔

مولاناؒ کی تصنیفات کا اثر

مولانا کی ان تصنیفات ورسائل اور خطوط ومکاتیب نے اتنا کام کیا کہ بعض اوقات قادیانی مبلغ یہ علم ہوتے ہی کہ مولانا کے رسائل کی فلاں جگہ لوگوں میں عام اشاعت ہورہی ہے، وہ جگہ چھوڑ کر چلے گئے اور جب وہاں بھی ان رسائل نے ان کا تعاقب کیا تو ان کو کسی تیسری جگہ پناہ لینی پڑی، یہاں تک نوبت آئی کہ مولانا کا نام ہی قادیانیوں کی شکست کا رمز بن گیا۔

ان تصنیفات بالخصوص "فیصلۂ آسمانی" اور "شہادت آسمانی" کے مطالعہ سے غیر جانبدار شخص اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ قادیانیت کے رد میں جو لٹریچر اب تک تیار کیا گیا ہے اس میں یہ کتابیں بہت ممتاز مقام رکھتی ہیں۔ انہوں نے تردید قادیانیت میں جو اہم پارٹ ادا کیا ہے اور مسلمانوں کو جتنا فائدہ پہنچایا ہے، اسے کوئی مؤرخ نظر انداز نہیں کرسکتا۔

مولانا کے اس "قلمی جہاد" سے ہزاروں نہیں لاکھوں انسانوں کو فائدہ پہنچا۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اس جال میں پھنس چکی تھی، اور اندیشہ تھا کہ ایک کثیر تعداد اس فتنہ میں مبتلا ہوجائے گی۔ مولانا کی کوششوں سے یہ سب اس تحریک کا شکار ہونے سے بچ گئے، ان کتابوں اور رسائل کا اثر صرف بہار تک محدود نہ تھا۔ پنجاب، بنگال، مدراس، بمبئی، گجرات، حیدرآباد، سلہٹ، ڈھاکہ، نواکھالی، میمن سنگھ، جس جگہ قادیانیوں کے قدم پہنچے وہاں مولانا کی تصنیفات بھی ان کے تعاقب میں پہونچیں، اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یا تو

قادیانی بھاگنے پر مجبور ہوئے، یا خاموشی اختیار کرلی۔

برما اور افریقہ میں بھی مولاناؒ کی تصنیفات اور رسائل بڑی تعداد میں پہونچے اور اس کی وجہ سے قادیانیت کے جمتے ہوئے قدم متزلزل ہوگئے اور بہت سے مسلمان جو اس سے متاثر ہوئے تھے اس سے واقف ہوکر بیزار ہوگئے۔

صوبۂ سرحد میں بھی ان رسائل کی اچھی اشاعت ہوئی۔ متعدد رسائل کا انگریزی، گجراتی اور بنگلہ زبان میں ترجمہ بھی ہوا۔

کٹک اور اس کے اطراف میں قادیانیت نے خاصا زور پکڑ لیا تھا اور ان کی ایک مضبوط جماعت بن گئی تھی، جس کا دائرہ روز بروز وسیع ہورہا تھا لیکن وہاں کے مدرسہ سلطانیہ کے صدر مدرس مولانا سید محمد قاسم بہاری نے جلد ہی اس کے تریاق کی فکر کی اور مولانا کے رسائل منگوا کر اس کی اشاعت کی کوشش کی، اور اس کے نتیجہ میں ان اطراف میں یہ فتنہ بالکل ختم ہوگیا۔ کٹک سے مولانا کے ایک عقیدت مند مولانا کو ان حالات سے مطلع کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ''حضور کے رسالوں اور کتابوں کا اس ملک میں اچھا اثر پڑا، مسلمانوں کے عقائد بہت درست ہوگئے، ایک جم غفیر اور بڑی جماعت جو قادیانی ہونے والی تھی انہیں کتابوں کی بدولت قادیانی ہونے سے بچ گئی، اور اب یہ حالت ہے کہ کسی قادیانی کو اپنے مذہب سے دلچسپی نہیں رہی۔'' (۱)

بہار میں بہت سی مساجد پر قادیانیوں نے قبضہ کر رکھا تھا اور مسلمانوں نے صبر کرلیا تھا، لیکن مولانا کی ہمت افزائی اور پشت پناہی سے تین چار اہم مساجد کے سلسلہ میں مسلمانوں نے ہائی کورٹ تک مقدمہ لڑنے کا فیصلہ کیا اور کامیاب ہوئے۔ پنجاب میں اس سے قبل کئی مقدمے ہوئے تھے۔ بہار کی اس کامیابی کا اثر کچھ ایسا پڑا کہ اس کے بعد پنجاب میں مسلمانوں کو متعدد مقدموں میں کامیابی حاصل ہوئی، اور قادیانی ان کی مسجدوں سے بے دخل کیے گئے۔

---

(۱) صحیفۂ رحمانیہ، نمبر ۱۷

اگر کبھی برسوں کے بعد مرزا صاحب یا ان کے حامیوں کی طرف سے مولانا کی کسی کتاب کا جواب دیا گیا تو مولانا نے فوراً اس کی تردید میں رسالہ لکھا، اس کا اثر یہ پڑا کہ پھر دوبارہ ان کو ہمت نہ ہوئی، اور اس میدان میں ان کو اپنی کامیابی بہت دشوار نظر آنے لگی۔

چونکہ مولانا پیچیدہ مسائل اور علمی مباحث کو بھی سلجھا کر اور سادہ و دلنشیں انداز میں پیش کرنے کے عادی تھے، اس لئے عام مسلمانوں کے لئے اس سے فائدہ اٹھانا بہت آسان تھا، اور یہی مولانا کا مقصد بھی تھا۔

مولانا اکثر فرماتے کہ:۔

> ''اتنا لکھو اور اس قدر طبع کراؤ، اور اس طرح تقسیم کرو کہ ہر مسلمان جب صبح سو کر اٹھے تو اپنے سرہانے ردِ قادیانیت کی کتاب پائے۔''

اور حق یہ ہے کہ مولانا نے اس پر عمل کر کے دکھا دیا، اور ان کا یہ سوز و اضطراب، سیماب وشی و بے قراری اور جہادِ مسلسل اس بات کی تصدیق کے لئے بالکل کافی ہے۔

باب ششم

سلوک وارشاد اور اصلاح عام

تعلق باللہ اور اس کی اہمیت

مولانا کی کتاب زندگی کا ایک روشن اور آخری باب وہ ہے جو سلوک وارشاد اور تربیت واصلاح سے متعلق ہے اور ان کی اصلاحی خدمات، روحانی کمالات اور باطنی اذواق وکیفیات کا ترجمان ہے۔

یہ باب مولانا کی زندگی کے آخری دور ہی پر محدود نہیں، اس لئے کہ اوائل عمر ہی سے ان کو انسانی زندگی کے اہم ترین پہلو کی طرف پوری توجہ تھی، وہ اس کو زندگی کا حاصل اور اس کی اصل قیمت سمجھتے تھے، اور یہ متاع دل ان کو ہر شئے سے زیادہ عزیز اور محبوب تھی۔

ندوۃ العلماء کے تخیل اور اس کے طریقہ عمل اور سرگرمیوں میں روحانیت اور وسیع النظری کا جو حسین اور خوشگوار امتزاج اور توازن نظر آتا ہے وہ بلاشبہ مولانا کے اسی نقطۂ نظر اور طرز عمل کا نتیجہ ہے۔ ان کے نزدیک کامیابی کا اعلیٰ معیار اور ترقی کی آخری منزل کامیاب نظریات اور گرانقدر خدمات اور مقبولیت وشہرت نہیں بلکہ وہ صحیح، سچا اور گہرا تعلق ہے جو انسان کو خدا سے ہونا چاہئے اور معرفت کی وہ لذت اور محبت کا وہ سرور ہے جو اس کے ہر جذبہ، ہر تعلق اور ہر محبت پر محسوس اور نمایاں طور پر غالب ہو اور اس کے رگ وریشہ میں سرایت کر گیا ہو، اور مختصر الفاظ میں فدائیت اور محبت کی وہ شان ہے جو انسان کی ہر ہر

ادا سے ظاہر ہو رہی ہو، یہاں تک کہ اس کے پاس بیٹھنے والے، اس کو دیکھنے والے، بلکہ اس کو سننے اور پڑھنے والے بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں، اور اس کی پوری زندگی زبان حال سے کہتی ہو کہ:۔

ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر
مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں

یہ نہ مولانا کا کوئی ذاتی رجحان اور مذاق ہے، نہ ندوۃ العلماء کا کوئی نیا اور انوکھا تعلیمی تخیل، نہ کسی خاص طبقہ اور حلقہ کی محدود ترجمانی، یہ عین اسلام کی دعوت اور اسلام کی روح ہے اور اسلام ہی کی طرح ہر قدیم وجدید سے بالاتر اور آفتاب کی طرح ہمیشہ سے تازہ وتابندہ ہے، اسلام انسان سے خدا کے صرف نظری اور قانونی تعلق کا طلبگار نہیں ہے، وہ اس سے "جذباتی تعلق" کا بھی خواستگار ہے جو سعی وعمل، دعاومناجات، توکل واعتماد، صبر وشکر، ایثار وقربانی جیسے تمام اعمال، تعلقات اور جذبات کی جان ہے، رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ (۱) اور یحبھم ویحبونہ (۲) میں اسی معیار اور "گوہر مراد" کی نشان دہی کی گئی ہے، اور اسی آتش شوق کو بھڑکایا گیا ہے جو اس کو ہر لحظہ اور ہر آن پرسوز و بے قرار رکھتی ہے اور اس کی ہمت اور حوصلہ مندی، قوت وصلاحیت اور ولولہ عمل کو کمزور کرنے کے بجائے نئی روح اور نیا خون عطا کرتی ہے اور اس کی اس استعداد اور قابلیت کے لئے مہمیز کا کام کرتی ہے جس کے ذریعہ وہ خدا کی رضا ومحبت کو حاصل کر کے منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔

مولانا کی زندگی کے اس آخری اور تابناک باب میں اسی حیثیت سے روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے ان خصوصیات واوصاف وکمالات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو اگرچہ ان کی زندگی کے ہر دور میں ملتے ہیں، لیکن آخری دور میں بہت نمایاں ہو کر سامنے آئے ہیں۔

مونگیر کے قیام کا انتظام

مولانا کے قیام مونگیر اور مستقل سکونت پر باب چہارم کے آخری صفحات میں کچھ روشنی ڈالی گئی ہے، اس کو دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں، ہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ مولانا اس فیصلہ میں کسی خاص نتیجہ پر پہنچے بھی نہ تھے کہ ان کے بعض اہل تعلق

---

(۱) اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی۔ (۲) اللہ ان سے محبت رکھتا ہے وہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔

اورمریدین نے مولانا کو بہت التجا اور اصرار سے وہاں قیام کرنے کی دعوت دی، ان اہل تعلق میں دلاور پور کے معزز شاہ صاحبان کا خاندان اور حکیم احمد اللہ خاں اور حاجی تراب علی کے خاندان زیادہ نمایاں اور پیش پیش تھے، حاجی تراب علی صاحب نے ایک مرتبہ مولانا شاہ تجمل حسین بہاری (خلیفہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ) سے اپنی اس خواہش اور آرزو کا اظہار کیا، انہوں نے جواب دیا کہ اگر تم کو ایسی ہی عقیدت ہے تو ان کے لئے مکان بنواؤ، حضرت کانپور سے برداشتہ خاطر ہیں، ہم کوشش کریں گے کہ یہاں چلے آئیں۔ یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئے اور فوراً بولے کہ میرا باغ حاضر ہے قبول کرادیجئے، میں اس میں مکان بنادوں گا، پھر یہ خود کانپور گئے اور درخواست کی، لیکن مولانا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حاجی احمد اللہ صاحب کو جو اس زمانہ میں علیل تھے، حضرت کی آمد کی خبر ملی تو انہوں نے اس کار خیر میں سبقت لے جانے کی کوشش کی اور مولانا شاہ تجمل حسین کے ذریعہ سفارش کروائی، بہرحال یہ سعادت ان ہی کے لئے مقدر تھی چنانچہ یہ باغ مولانا نے قبول کیا۔(۱)

حکیم احمد اللہ خاں کو مولانا سے کمال درجہ عقیدت اور محبت تھی۔ خود مولانا نے بعض مواقع پر ان کے خلوص وجذبات کی تعریف کی ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ مولانا نے باوجود اس کے ان کا باغ نسبتاً چھوٹا تھا اس کو قبول کرنا پسند کیا۔ اس باغ میں کچھ درخت آم کے تھے اور باقی زمین زیر کاشت تھی، درختوں کے پاس حکیم صاحب نے ایک مختصر مکان بنوادیا، اس کے بعد بعض اہل تعلق کی کوششوں سے زنانہ مکان بھی بہت جلد تیار ہوگیا۔ حکیم صاحب کے انتقال کے بعد مولانا کے قیام کے دو تین سال کے اندر ان کی بیوی نے مسجد کے پاس ذاکرین وشاغلین کے لئے حجرے بنوادیئے، اور رفتہ رفتہ یہ ایک جزیرہ سا بن گیا جہاں نفس کے کچلے ہوئے اور مادیت کے مارے ہوئے نہ جانے کتنے انسانوں کو پناہ ملی، اور ان کو اس شفقت ودلسوزی وغمخواری بلکہ دلدہی اور ناز برداری کا اندازہ ہوا جو اللہ کے مخلص اور محبوب بندوں کا خاصہ ہے، اسی شفقت ومحبت کے سایہ میں انکی اصلاح

(۱) کمالات محمدیہ، ص ۱۶۹ بہ تغیر واضافہ

ہوئی اور وہ ایمان ویقین کی روشنی اور محبت وتعلق کی اصل دولت سے بہرہ مند ہوئے جو اگر جان دے کر بھی ملتی تو ارزاں تھی۔

''گر ایں سودا بجاں بودے چہ بودے''

مونگیر کا پہلا سفر

مونگیر سے آمد ورفت اور بیعت وارشاد کا تعلق اگر چہ نمایاں طور پر ۱۳۱۳ھ میں مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ کے انتقال کے بعد ہی قائم ہوا، لیکن مونگیر کا سب سے پہلا اور بڑا سفر وہ تھا جس میں عقیدت ومحبت اور شیفتگی وگرویدگی کے عجیب وغریب مناظر دیکھنے میں آئے اور بغیر کسی اطلاع اور اعلان کے اس طرح عام رجوع اور خلقت کا ہجوم ہوا جس کی توجیہ اس حدیث شریف کے سوا کسی ظاہری چیز سے نہیں ہوسکتی کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو دوست رکھتا ہے تو اس کے فرشتے مخلوق میں یہ اعلان کر دیتے ہیں کہ فلاں کو اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے تم بھی دوست رکھو۔ کے راستے سے ہوا، اس سفر میں بارہا ایسا ہوا کہ جب بھی اسٹیشن پر کچھ دیر گاڑی رکی لوگوں کا ہجوم ہو گیا، اگر زیادہ وقت ملا تو دس کوس تک کے لوگ ملاقات کے لئے آئے، بعض اوقات پانچ پانچ سو آدمی ایک ساتھ مرید ہوئے، اکثر ہندوؤں کو دونوں ہاتھ جوڑ کر مولانا کو سلام کرتے ہوئے دیکھا گیا، اور جب کسی نے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ تو انہوں نے یہ کہا کہ گرو جی جاتے ہیں۔

صاف نظر آرہا تھا کہ قلوب کی حالت تبدیلی ہوگئی ہے، جن لوگوں کو مولانا سے کوئی انس نہ تھا بلکہ وہ لوگ بھی جو مولانا کے نام تک سے اچھی طرح واقف نہ تھے خود بخود مولانا کی طرف کھنچنے لگے، اور جس طرح ایک ہوا چلتی ہے اور خاص وعام میں کوئی تمیز نہیں کرتی، اسی طرح اس 'باد بہاری' سے اپنے ظرف واستعداد کے مطابق ہر شخص مستفید ہوا۔ صاحب کمالات محمدیہؒ نے اس سفر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

۱۳۱۰ھ کا سفر سفر ہمارے پیش نظر ہے۔ اللہ اکبر! اس کی تفصیل یہ ہے کہ بعض معززین مونگیر آپ کو کانپور لینے گئے، آپ تشریف نہیں لائے، اس کے بعد آپ کے ایک ذی علم دوست نے خط لکھا اس میں یہ شعر تھا۔

ہمہ دلہا گرفتارت ہمہ جانہا خریدارت
ہمہ مشتاق دیدارت کہ روزے جلوہ فرمائی

مرشد سے تعلق

مولانا فرماتے ہیں کہ: اس شعر نے عجب اثر کیا، معلوم ہوا کہ لسان الغیب سے یہ شعر نکلا ہے، اسی وقت مونگیر کا قصد کیا۔

فرماتے تھے:۔

''جس وقت ریل پر سوار ہوا، معلوم ہوا کہ حضرت پیر و مرشد میرے ہمراہ ہیں، پاس بیٹھے ہیں، تمام راستہ یہ حالت رہی کہ کسی وقت تو حضرت مرشد علیہ الرحمہ پاس بیٹھے معلوم ہوتے تھے اور کسی وقت تو اپنی صورت مرشد کی معلوم ہوتی تھی۔ غالباً آپ کانپور سے پٹنہ پہلے تشریف لائے پھر مونگیر، اس وقت مخلوق کی گرویدگی اور عقیدت دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ جہاں آپ ایک دن کے لئے اترے وہاں دس دس کوس کے لوگ جمع ہوجاتے، تعجب یہ ہوتا تھا کہ جس مقام پر پہلے سے آپ کے اترنے کی خبر نہیں ہے اور اتفاق سے اترنا ہوگیا کچھ دیر کے بعد لوگوں کا ہجوم ہوگیا، دوسرے روز دس دس کوس تک کے لوگ حاضر ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا کہ ریل گاڑی اسٹیشن پر ٹھہری ہے اور ہندو اس گاڑی کی طرف ڈنڈوت کررہے ہیں، کسی نے دریافت کیا کہ کون ہیں؟ وہ جواب دیتے کہ گروجی جاتے ہیں۔ بیعت کے وقت پانچ پانچ سو کے مجمع کو ایک ایک مرتبہ مرید ہوتے ہوئے تو میں نے دیکھا ہے اور دس بیس بلکہ سو پچاس کا مل کر مرید ہونا تو تمام دن رہتا تھا۔ یہ بھی میرے پاس لکھا ہوا موجود ہے کہ ایک ایک مرتبہ کے دورہ میں دو دو سو گاؤں کے لوگ ایک ایک ضلع میں مرید ہوئے۔''(۱)

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق

اس ایک سفر سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ۱۳۱۰ھ جب ایک طرف ان کے ذہن میں 'ندوۃ العلماء' کی تصویر ابھر رہی تھی، اور اب اس خاکہ میں صرف رنگ بھرنا باقی تھا، عین

(۱) کمالات محمدیہ، ص ۹۳ و ۹۴

اسی زمانہ میں سلوک وارشاد، روحانی تربیت و اصلاح اور تزکیۂ احسان کے شعبہ میں انسانوں کی ایک بڑی تعداد ان سے فیضیاب ہورہی تھی، اور ان کو وہ ہردلعزیزی اور مقبولیت حاصل ہونا شروع ہوگئی تھی جو اس راہ کے کاملین اور شعبہ کے مجتہدین کا حصہ ہے۔

عجیب بات ہے کہ ندوۃ العلماء کی بنیاد کے ساتھ ساتھ تصوف واحسان کی بنیاد بھی پڑی اور دونوں کا سفر تقریباً ایک ساتھ شروع ہوا، اور اس جب تک مولانا محمد علی ندوہ کے ناظم رہے یہ دونوں شعبے پورے اہتمام اور نگہداشت کے ساتھ برابر پرورش پاتے رہے، اور قلب ودماغ کا یہ حسین توازن قائم رہا جس پر صحیح اور صحت مند اسلامی معاشرہ کے بقاء وترقی اور انسانی زندگی کے متوازن اور متناسب نشوونما کا انحصار ہے، اور جو ہر زمانے کا نازک ترین اور مشکل ترین فریضہ رہا ہے۔

ندوۃ العلماء کے گیارہ سالہ دورنظامت میں جس کی مختصر تاریخ آپ پڑھ چکے ہیں، متعدد ایسے دوروں کا اتفاق ہوا جس کے آغاز کی کہانی اوپر گزری ہے، جب تک مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ حیات تھے، وہ آنے والوں سے خاص طور پر یہ پوچھتے تھے کہ ہمارے مولانا محمد علی سے بھی ملے یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہوتا تو ملاقات کی تاکید کرتے، اور بعض وقت سکوت اختیار کرتے، مولاناؒ کے انتقال کے بعد قدرتی طور پر یہ سارا حلقہ مولانا محمد علیؒ سے وابستہ ہوگیا۔ دوروں اور بیعت وتوبہ کی مجلسوں کی تعداد بڑھ گئی، اور ندوہ کی زبردست سرگرمیوں اور مشغولیتوں کے ساتھ مسلمانوں کی روحانی اصلاح وتربیت اور تعمیر سیرت کا کام بھی برابر جاری رہا، اور ندوہ سے علیحدگی کے بعد اس کا دائرہ اور وسیع ہوگیا۔

استغناء وعالی ظرفی

اس زمانہ میں متعدد بار مولانا کے سامنے ملازمت کرنے یا کسی عہدہ ومنصب کو قبول کرنے کا سوال آیا، لیکن مولانا اس کو قبول کرکے دین وایمان کی اس دولت کو محدود کرنے پر کسی طرح تیار نہ ہوئے جو خدا کے حکم سے ان کے ذریعہ خلق خدا میں تقسیم ہورہی تھی۔

ایک مرتبہ مولانا مرادآباد تشریف لے گئے اور مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولاناؒ نے دیکھتے ہی فرمایا:۔

''ہمارے پاس ایک رئیس آئے تھے وہ ہم سے ایک عالم چاہتے ہیں، دو سو روپیہ ماہوار دیں گے اور کچھ پڑھانا ہوگا، تم چلے جاؤ۔''

مولانا نے کہا کہ:۔

''مولوی احمد حسن صاحب کانپوری یا مولوی عبدالکریم صاحب کو بھیج دیجیے۔''

ارشاد ہوا کہ:۔ ''ہم تم سے کہتے ہیں۔''

مولانا نے عرض کیا کہ:۔

''اگر حکم ہوتا ہے تو مجھے کوئی عذر نہیں۔''

ارشاد ہوا:۔

''حکم نہیں ہے، تمہارا جی چاہے چلے جاؤ۔''

مولانا نے فرمایا کہ:۔

''حضرت! جی تو نہیں چاہتا ہے''۔ آپ خاموش ہو گئے۔ (۱)

اسی طرح ایک مرتبہ حافظ عبدالکریم صاحب نے (جو حیدرآباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے، اور مولانا سے محبت رکھتے تھے) اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ مولانا ہائی کورٹ میں درجۂ اول کی منصفی قبول کرلیں، کام سے مناسبت ہو جانے کے بعد ہائی کورٹ کے جج کی حیثیت سے تقرر جلد ہو جائے گا، لیکن مولانا نے قبول کرنے سے انکار کردیا۔ حافظ صاحب نے اس خیال سے کہ اس میں سود کی ڈگری لینا پڑتی ہے، منصب قضا کی پیشکش کی، لیکن مولانا نے اس سے بھی معذرت کردی اور کہا کہ:۔

''حافظ صاحب! میں قاضی اور مفتی کچھ نہیں ہوتا، آپ معاف کریں۔'' (۲)

ایک بار حیدرآباد سے پھر کسی ملازمت کی پیشکش ہوئی اور مولانا فضل رحمٰنؒ نے پوچھا کہ:۔

''حیدرآباد میں تمہیں لوگ بلاتے ہیں؟۔''

مولانا نے عرض کیا:۔ ''جی ہاں!''۔ مولانا فضل رحمٰنؒ نے کہا کہ:۔ ''پھر جاتے کیوں نہیں، چلے جاؤ؟'' ایک بار ایک رئیس کی ملازمت سے مولانا کے کہنے کے باوجود انکار کرچکے تھے اس لئے دوبارہ انکار سے شرم آئی اور حیدرآباد روانہ ہو گئے لیکن دل نہ لگا اور

---

(۱) کمالات محمدیہ، ص۵۲ و ۵۳ (۲) ایضاً ص ۵۳۔

چھوڑ کر چلے آئے۔(۱)

خدا کی قدرت یہ ہوئی کہ حیدر آباد سے واپسی کے بعد جو مالی دشواریاں کبھی کبھی پہلے پیش آتی تھیں وہ بھی جاتی رہیں۔ ''مصنف کمالات'' مولانا کی زبان سے اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

''جب سے حیدر آباد سے لوٹنا ہوا اس وقت سے کبھی خرچ کی طرف سے دقت نہیں ہوئی، اور باوجودیکہ خرچ چوگنا ہوگیا مگر ہمیشہ فراخ دستی سے زندگی بسر ہوتی رہی''۔

فرماتے ہیں کہ:۔

''کبھی یہ خطرہ ہوا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ جب سے حیدر آباد سے آیا ہوں فراخ دستی سے گزر ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ اس کی وجہ یہ خیال میں آئی کہ ہم نے اللہ کے واسطے چار سو روپیہ ماہوار کی نوکری چھوڑی، اللہ تعالیٰ بڑا غیور ہے، اس نے اپنے فضل سے یہ ثمرہ دیا کہ نہایت عمدگی سے وہ بات حاصل ہوگئی جو حیدر آباد کی منصفی بلکہ ججی سے حاصل ہوتی، اور اس میں جو آفتیں اور ذمہ داریاں اور معصیت ہوتی اس سے بالکل نجات بخشی، الحمد للہ علی احسانہ، سچ ہے۔ ومن یتق اللہ یجعل له مخرجاً ویرزقه من حیث لا یحتسب(۲)

ایک مرتبہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ نے فرمایا کہ:۔

''ہمارے مولوی محمد علی بہت غنی ہیں۔''

ایک صاحب نے عرض کیا کہ:۔

''حضرت بہت روپیہ والے ہیں؟۔''

ارشاد ہوا:۔

''بڑے احمق ہو، روپیہ کہیں کوئی غنی ہوتا ہے، الغنی غنی النفس (اصل غنا دل کا غنا ہے۔''(۳)

---

(۱) کمالات محمدیہ، ص۵۴ بہ تغیر واضافہ (۲) جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں ان کے لئے اللہ تعالیٰ کوئی سبیل پیدا کر دیتا ہے، اور ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے گمان بھی نہیں ہوتا۔

(۳) کمالات، ص:۵۵۔

امراء کی دعوت سے اجتناب

امراء اور اصحاب ثروت کی دعوت سے ہمیشہ پہلو تہی کرتے تھے، ہاں اگر اس میں کوئی دینی فائدہ اور دینی مصلحت ہوتی تو پھر کوئی عذر نہ کرتے، ایک دینی کام اور خدا کی نعمت سمجھ کر قبول کر لیتے۔

حیدر آباد کے زمانۂ قیام میں ایک مرتبہ نواب خورشید جاہ بہادر نے مولانا کی دعوت کی، لیکن مولانا تشریف نہ لے گئے، حالانکہ یہی نواب خورشید جاہ تین مرتبہ کانپور میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہو چکے تھے۔

نواب صاحب کے بخشی نے (جو دعوت کا پیغام لے کر مولانا کے پاس گئے تھے) جب بہت اصرار کیا تو مولانا نے کہا کہ:۔

> ''دعوت قبول کرنے کے لئے ہمارے ہاں کچھ شرائط ہیں، ان میں ایک شرط یہ ہے کہ دعوت کرنے والا خود آ کر خواستگار ہو، بغیر اس کے ہم نہیں جاتے۔ بخشی صاحب نے کہا کہ نواب صاحب تو تین مرتبہ کانپور میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو چکے ہیں، یہاں آنے میں انہیں کیا عذر ہو سکتا تھا لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے اس وقت نہیں آ سکے۔ اس کہنے کے باوجود مولانا اس دعوت میں شریک نہ ہوئے''۔(۱)

حیدر آباد کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا کے علمی مشاغل بھی جاری تھے۔ مکتوبات امام ربانی کے متعدد نسخے مولانا کو حیدر آباد میں ملے۔ مولانا کے پاس نسخۂ مرتضوی تھا، اور وہ غلط تھا، چنانچہ دوسرے نسخوں کو سامنے رکھ کر مولانا نے اس کا مقابلہ کیا اور تصحیح کی، اس حالت میں عجیب وغریب واردات وکیفیات طاری ہوئیں، اور محسوس روحانی ترقی معلوم ہوئی۔

مولانا فضل رحمٰن صاحبؒ کے بلند کلمات

مولانا فضل رحمٰنؒ سے اجازت کے بعد جس کا ذکر کتاب کے شروع میں گزرا ہے،

---

(۱) کمالات، ص ۵۵

خود بخود اور اچانک یہ بات مشہور ہوگئی کہ مولانا کو خلافت بھی حاصل ہوئی ہے۔ خود مولانا فرماتے ہیں کہ:۔

"جا بجا سے خطوط میں خلیفہ حضرت مولاناؒ لکھا ہوا آنے لگا، اور لوگ اگر دریافت کرنے لگے، کانپور کے ایک تاجر نے (جو مولانا فضل رحمٰن صاحبؒ کے خدام میں سے تھے) یہ شہرہ سنا تو مولانا سے حقیقت حال دریافت کی، مولانا نے کہا کہ حضرت قبلہؒ موجود ہیں، ان سے جا کر دریافت کر، وہ اسی روز یا اس کے دوسرے روز مولاناؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دریافت کیا، مولانا فضل رحمٰن رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:۔ ہاں! ہم نے اللہ کا نام بتانے کی اجازت دی ہے، اور کون بڑی بات ہے، ان کی روح ارواح متقدمین میں سے ہے، ایسے لوگ ہر زمانہ میں کم ہوتے ہیں۔" (۱)

مونگیر میں خلقت کے ہجوم اور لوگوں کی وارفتگی اور شیفتگی کو دیکھ کر مولانا نے حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کو ایک خط بھیجا جو "کمالات محمدیہؒ" میں محفوظ ہے، اس خط سے اس مقبولیت و مرجعیت، محبوبیت اور جمعیت خاطر کی تصدیق ہوتی ہے جس کی تفصیل اوپر گزری ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"ایں کمینہ خادم دور افتادہ باصرار بعض احباب از کانپور بمونگیر رسیدم از توجہات عالیات دریں جا بہر نوح جمعیت ظاہری و باطنی یافتم الحمد اللہ علی ذلک، مردمان برائے دخول سلسلہ آں قبلہ ہجوم کردند و بعض را حسب ارشاد سابق داخل سلسلہ نمودم و بعض را براجازت جدیدہ موقوف واشتہ ام، چہ ارشاد می شود۔" (۲)

اس زمانہ میں لوگوں نے عادت اور معمول کے مطابق چہ میگوئیاں بھی شروع کردیں، اور مولانا کی خلافت ایک مختلف فیہ مسئلہ بن گئی، بعض لوگوں نے اپنی غلط فہمی یا حسد کی وجہ سے مولانا کے ساتھ نامناسب انداز میں گفتگو کی۔ اس طرح کی باتیں جب زیادہ پھیلیں تو مولانا قدرتی طور پر اس سے کسی قدر متاثر اور ملول ہوئے، اور مولانا فضل رحمٰنؒ کو ایک خط لکھا، اور ان حالات سے مطلع کیا۔

---

(۱) کمالات محمدیہ، ص۲۲ باختصار (۲) ایضاً: ۲۷

مولاناؒ نے اس کے جواب میں ان کو لکھا کہ ان باتوں کو کچھ زیادہ اثر نہ لیں۔ اور ان کے لئے بلند کلمات ارشاد فرمائے۔ لکھتے ہیں:۔

''خیر اللہ شاہ تم سے تکرار کرتا ہے، تمہارے مرتبہ کو نہیں جانتا ہے، اس بات کا خیال نہ کرو، ایک زمانہ ہوگا کہ کثیر خلقت تمہارے پاس آ کر مرید ہوگی، اور تم سے فیض ہوگا اور تعلیم پائیں گے'' (۱)

مولانا شاہ تجمل حسین بہاری ''مصنف کمالات رحمانی'' جو مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کے خواص میں ہیں، انہوں نے ایک مرتبہ مولانا فضل رحمٰن صاحبؒ سے دریافت کیا کہ: مولانا محمد علی آپ کے خلیفہ ہیں؟ فرمایا کہ: ''ہم اس قابل نہیں ہیں کہ ہم ان کو خلیفہ کہیں، وہ بڑے شخص ہیں۔'' (۲)

عام وعظ وتقریر سے بے رغبتی

مولانا عام واعظین اور مقررین کی طرح تقریر کرنے کی طرف کچھ زیادہ مائل نہ تھے، بلکہ مجالس میں بے تکلف اور سادہ گفتگو کرنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ بہت ضرورت ہوئی تو مختصراً کچھ فرماتے تھے، لیکن سننے اور دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ ان مختصر جملوں میں جو تاثیر ہوتی تھی وہ دوسروں کے وعظ وتقریر میں نہیں ہوتی تھی۔

فراغت وتکمیل کے بعد لوگوں نے جب تقریر کا اصرار کیا تو مولانا کی طرف سے انکار ہوا۔ اصرار زیادہ بڑھا تو انہوں نے کہا کہ مولانا فضل رحمٰن صاحبؒ جیسا فرمائیں گے میں ویسا کروں گا چنانچہ مولاناؒ سے دریافت کیا، مولاناؒ نے فرمایا کہ:۔

''بس جب دو چار آدمی پاس آ کر بیٹھے خدا اور رسولؐ کا حکم انہیں سنا دیا، یہی وعظ ہے، اور ایسے طریقے سے وعظ کہنا کہ خواہ مخواہ مشیخت پائی جائے اور نفس موٹا ہو، نہیں چاہیئے۔'' (۳)

چنانچہ مولاناؒ کا زیادہ تر وقت تخلیہ ہی میں گزرتا تھا۔ اگر کسی سے کچھ کہنا سننا ہوتا تو علیحدہ گفتگو کرتے تھے لیکن دو گھنٹے باہر گزارتے، اور اگر آدمی جمع ہو جاتے تو مولانا اس

---

(۱) کمالات رحمانی، ص ۴۵ (۲) کمالات رحمانی، ص ۴۶ (۳) کمالات محمدیہ، ص ۴۵۔

موقع پر کچھ مناسب اور ضروری باتیں بہت بے تکلفی اور سادگی کے ساتھ ان کے سامنے کہتے۔ یہی باتیں دلوں کو اسیر کرنے کے لئے کافی ہوتیں۔ بعض اوقات لوگوں پر اتنا اثر ہوتا کہ ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں اور دل بے قرار ہو جاتے، کم آدمی ہوں یا زیادہ مجمع ہو، مولانا اسی سادہ و دلنشیں انداز میں گفتگو کرنے کے عادی تھے۔

بعض بعض مرتبہ ایسا ہوا کہ بڑے بڑے اختلافات مولانا کے چند کلموں کی بدولت رفع ہو گئے۔ سیکڑوں آدمیوں کی اصلاح چند کلمات سے ہو گئی۔ بعض وقت ان کے ایک بار "اللہ" کہنے نے لوگوں کے دلوں کو گرما دیا، اور مجلس کا رنگ ہی بدل گیا، یہ دراصل مولانا کے اخلاص کی برکت اور۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

کا معاملہ تھا کہ بغیر کسی خاص اہتمام اور خوش بیانی کے وہ نتائج حاصل ہو رہے تھے، جو بڑے بڑے جلسوں اور شاندار تقریروں سے بھی حاصل نہیں ہوتے، اور گر ہوتے بھی ہیں تو دیرپا نہیں ہوتے۔

تکمیل علم کے بعد سے آخری ایام تک مولانا کا یہی رویہ اور طرز عمل رہا، وہ کبھی پیشہ ور کی حیثیت سے پبلک کے سامنے نہیں آئے، اور نہ اس طرز کے وعظوں اور تقریروں کو پسند کیا، ہاں اگر ضرورت ہوئی تو اس سے گریز نہیں کیا، البتہ صرف کام کی بات کرنے پر اکتفا کیا، اپنی زبان دانی اور علم کا اظہار کبھی نہیں کیا، اور نہ اپنے کو مرشد اور رہنما سمجھ کر لوگوں کو خطاب کیا۔

رجوع عام

۱۳۲۰ھ، ۱۹۰۲ء کے آخر میں مولانا مونگیر میں قیام پذیر ہوئے۔ اسی وقت سے لوگوں کا ایسا رجوع ہوا کہ جیسے وہ اس کے منتظر ہی بیٹھے تھے۔ پھر یہ حال ہوا کہ جس گاؤں یا جس ضلع میں مولاناؒ کے قدم پہنچے وہاں فسق و فجور اور بد دینی اور بد دیانتی کا خاتمہ ہو گیا۔

جو لوگ نماز سے دور بھاگتے تھے اور شراب وغیرہ کے عادی تھے، وہ نہ صرف خود نمازی ہو گئے بلکہ نماز کے داعی اور مبلغ بن گئے، اور ان کو خدا سے ایسا تعلق اور رابطہ پیدا

ہو گیا، جو اتقیاء اور صلحاء کے یہاں نظر آتا ہے۔

مرجھائی ہوئی کلیاں اور خشک پتے اگر موسم بہار میں کسی وقت تر وتازہ اور شاداب ہو جائیں تو زیادہ تعجب نہ ہونا چاہیے، لیکن ایمان اور ہدایت کی اس "بادِ بہاری" نے جس طرح مرجھائے ہوئے دلوں کو مردہ دلوں کو نئی زندگی بخشی وہ کم از کم ان اطراف کی تاریخ کا ایک ایسا واقعہ ہے جس کو کوئی مؤرخ فراموش نہیں کر سکتا۔

بعض مرتبہ ایسا ہوا کہ پورے پورے موضع میں ایک یا دو شخص باقی بچے اور باقی سب تائب ہو گئے، اور پھر کسی موقع پر یہ دونوں شخص بھی اس جماعت سے آملے۔

محمد علی حسنؒ مصنف "کمالاتِ محمدیہ" نے جو بعض دوروں میں مولاناؒ کے ساتھ تھے اس قسم کا ایک چشم دید واقعہ قلمبند کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

"۱۳۲۰ھ میں موضع ہرسنگھ پور (ضلع دربھنگہ) کے بعض لوگ آپ کو لے گئے، یہاں اس کے اطراف میں اکثر بے نمازی، تاڑی باز، تعزیہ پرست تھے، یہ خادم بھی ہمراہ تھا، سات یا آٹھ روز اس موضع میں قیام رہا، وہاں کے کل سکنا بجز دو شخصوں کے مرید ہوئے، اور تعزیہ پرستی سے توبہ کر کے پکے نمازی ہو گئے۔ اس کے اطراف کے لوگ ۱۰، ۱۰ کوس تک کے آ آ کر تائب ہوئے۔ لوگ متحیر تھے کہ وہ تاڑی باز جن کی عمر نشہ میں گزری اور کبھی خیال نہیں آسکتا تھا کہ یہ نشہ چھوڑیں گے، جن کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی واعظ یا منع کرنے والا ان کے موضع میں پہونچا انہوں نے یا تو واعظ کو وہاں سے نکالا یا خود وہاں سے چلے گئے، وہ لوگ خود بخود آ کر توبہ کرتے تھے اور نماز کے پابند ہو جاتے تھے۔ حیرت ہوتی تھی کہ یہاں نہ وعظ کا کوئی جلسہ ہے کہ لوگ چلے آتے ہیں، نہ خوش الحانی سے بیان ہوتا ہے کہ لوگ اس سے متاثر ہوتے ہیں، نہ کوئی تاکید کر رہا ہے اور نہ ڈانڈا لئے پھرتا ہے کہ نشہ چھوڑو نماز پڑھو (جیسا کہ بعض واعظین کو سنا گیا) غرضیکہ ظاہری اسباب میں سے کچھ نہیں ہے مگر جوق جوق چلے آ رہے ہیں اور تائب ہوتے جاتے ہیں، پھر یہ نہیں کہ چند روز اثر ہوا، آج کئی برس ہوئے ہم ان حضرات کو دیکھ رہے ہیں اور سن رہے ہیں کہ وہی نماز کی پابندی ہے اور نشہ وغیرہ کا ذکر نہیں ہے، نقصان اٹھاتے ہیں مگر

سو نہیں لیتے۔ دوسرے سال پھر اسی موضع میں گئے، وہاں تو سب لوگ فیضیاب ہو چکے، بجز دو شخصوں کے، مگر اطراف وجوانب کے لوگ بہت فیضیاب ہوئے، اور وہاں کے ان دو صاحبوں سے ایک تو موجود نہ تھے اور ایک صاحب موجود تھے وہ نشہ وغیرہ اور فسق وفجور میں مبتلا تھے اور وہاں کے معززین میں تھے، ایک روز حضرت قبلہؒ نے انہیں بلوایا، اس وقت مجمع تھا، اتفاق سے ہمارے برادر طریقت جناب شاہ حافظ رحمت اللہ صاحب مظفر پوری (۱) بھی حضرت قبلہؒ کی زیارت کے لئے آئے تھے اور اس مجمع میں موجود تھے مگر جلسہ میں گریہ وزاری کا غل ہو گیا اور ہر ایک پر عجب حالت طاری ہوگئی۔ جو صاحب مذکور بلائے گئے وہ بے اختیار بولے:۔ ''لیجئے ہاتھ، توبہ کرتا ہوں'' جس وقت ہمارے حضرت قبلہؒ نے ہاتھ پکڑ کر کسی قدر جوش میں فرمایا:۔ ''کہو اللہ ایک ہے۔'' اسم ذات کو آپ نے ذرا بلند آواز سے فرمایا، اس لفظ کے فرماتے ہی تمام حاضرین جلسہ پر کیفیت طاری ہوگئی، اور سبھوں نے بے اختیار اسم ذات کا نعرہ بلند کیا، بعض بیہوش ہو گئے، اور اکثر کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے، کثرت گریہ سے شور مچ گیا۔ (۲)... ...اس کے بعد اس موضع سے بعض لوگ حضرت قبلہؒ کو موضع جمال پور اور بلیا لے گئے جو وہاں سے قریب ہے، اندازاً آٹھ کوس ہے، وہاں کے لوگ بھی بے نمازی اور نشہ خوری میں مبتلا تھے، وہاں بھی یہی ہوا کہ دو روز کے قیام میں سب تائب ہو کر نماز کے پابند ہو گئے۔'' (۳)

سب سے بڑی کرامت

مولانا فرماتے تھے کہ:۔

''سب سے بڑی کرامت اتباع سنت ہے، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ انسان میں سنت کی پیروی اور شریعت کی اتباع کس درجہ ہے اور اس سے مخلوق کو کتنا فائدہ پہونچ رہا ہے، کشف وکرامت وغیرہ اصل نہیں۔''

ایک مرتبہ مولانا نے بہت تفصیل کے ساتھ اس بات پر روشنی ڈالی کہ:۔

---

(۱) خلیفہ مولانا سید محمد علی مونگیریؒ۔ (۲) کمالات محمدیہ ص ۱۳۹ و ۱۴۰ (۳) کمالات محمدیہ ص ۱۳۹ و ۱۴۰

”لوگ کشف وکرامات دیکھتے ہیں اور جو بات دیکھنے کی ہے وہ نہیں دیکھتے وہ دو امر ہیں، اول تو شریعت پر استقامت یعنی شریعت محمدیہ کی کامل پابندی ہو کہ کوئی سنت ومستحب ترک نہ ہوتا ہو، اور محرمات کیا مکروہات سے بھی کامل اجتناب ہو، اگر یہ نہیں ہے تو عجوبہ باتیں مثلاً کسی پر اثر ڈالنا، کسی کو بے ہوش کردینا، چھو چھا کرنا، کسی کے مرض کو سلب کرلینا وغیرہ تو ہنود کے ہاں گوشائیں بھی کرتے ہیں، اور اب سنتے ہیں کہ عیسائیوں میں بھی بعض لوگوں نے ایسی باتیں نکالی ہیں، تو پھر کیا کوئی مسلمان انہیں ولی اللہ اور درویش کامل کہے گا؟ کبھی نہیں کہے گا، پھر اللہ والوں میں ایسی باتیں تلاش کرنا نادانی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر کرامت دیکھنے کی ہے تو یہ ہے کہ اس کی ذات سے، اس کے فیض صحبت سے، کتنے مردہ دل زندہ ہوتے ہیں، یہ کرامت مردہ کو زندہ کرنے سے زیادہ لائق قدر ہے، اور اس کے کامل ہونے کی دلیل ہے۔“(۱)

اور حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی سب سے بڑی کرامت وہ اتباع سنت اور اصلاح وتربیت ہے جس کے فیض واثر سے ہزاروں لاکھوں انسان حقیقی انسانیت سے روشناس ہوئے اور یقین ومعرفت کی دولت سے بہرہ یاب ہوئے اور انہیں مرنے کا ہنر اور جینے کا سلیقہ آیا، دنیا کی حقیقت ان پر آشکارا ہوگئی، اور ان کے قلب کی دھڑکنیں آخرت کی زندگی سے وابستہ ہوگئیں جو انسان کی ساری زندگی کا حاصل ومقصود ہے، اس معیار سے دیکھئے تو مولانا کا کارنامہ بہت ممتاز نظر آتا ہے اور ان سے جو فائدہ مسلمانوں کو پہونچا اس کا دائرہ بہت وسیع معلوم ہوتا ہے۔

تاثیر وانقلاب آفرینی

اس تربیت واصلاح اور بیعت وتوبہ کے ساتھ آپس کے اختلافات جس طرح ختم ہوئے اور بعض بڑے بڑے طویل نزاع دیکھتے دیکھتے جس طرح رفع ہوئے وہ خود مولانا کا ایک بڑا کارنامہ ہے اور ان کے سوانح وکمالات میں ممتاز جگہ پانے کے قابل

---

(۱) کمالات محمدیہ، ص: ۱۴۰

ہے، مولانا کے مختصر جملوں اور معمولی نصیحتوں سے تاثیر وانقلاب آفرینی کے وہ مناظر سامنے آئے جو اولیاء متقدمین کے ہاں نظر آتے ہیں، اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی انسان کی قوت وتاثیر کا نتیجہ نہیں بلکہ معیشت الٰہی اور توفیق الٰہی کا کرشمہ ہے اور خدا کو منظور ہے کہ ان کے ہاتھوں سے رشد وہدایت کا یہ فیض اس طرح جاری ہو کہ بیک وقت پورے پورے عاقے اور انسانوں کی کثیر تعداد فیضیاب ہو۔

بھاگل پور کے مسلمانوں میں ایک بات پر کچھ اختلاف ہو گیا تھا، اگرچہ اس کا آغاز دیہات کی پنچایت سے ہوا تھا لیکن آخر میں اتنا بڑھا کہ دیہات اور شہر ہر جگہ مسلمان دو فریقوں میں بٹ گئے اور جنگ وجدال کا بازار گرم ہو گیا، یہاں تک نوبت پہونچی کہ ایک ایک دن میں دیوانی اور فوجداری کے بیس بیس پچیس پچیس مقدمات داخل ہونے لگے، مسلمانوں کے سر برآوردہ لوگوں کے علاوہ ضلع حکام نے بھی مصالحت کی بہت کوشش کی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

مولانا بھاگل پور تشریف لے گئے تو لوگوں نے اس موقع کو غنیمت جانا، فریقین کے کچھ نمائندے اور وکلاء مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صلح کے لئے درخواست کی، مولانا نے یہ درخواست منظور کی اور پندرہ دن کے بعد ہزاروں آدمیوں کا اجتماع ہوا۔ مولانا نے چند ہی کلمات کہے ہوں گے کہ جلسہ کا رنگ بدل گیا، اور وہ لوگ جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، وہ بھائیوں کی طرح گلے مل گئے کہ گویا عید ہو گئی، اور یہ سب اس طرح چشم زدن میں ہوا کہ دیکھنے والے محو حیرت تھے۔ اس عجیب واقعہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مصنف ''کمالات'' لکھتے ہیں:۔

> ''شاہ جنگی کے تالاب عید گاہ کے میدان میں ہزاروں آدمیوں کا مجمع ہوا، پہلے جناب مولانا حافظ تجمل حسین صاحب نے قرآن شریف ہاتھ میں لے کر وعظ فرمایا، چونکہ ان میں ظرافت بہت ہے، دو چار کلمے ایسے فرمائے جو سب حاضرین کو ناگوار معلوم ہوئے، مارے رعب داب کے کچھ بول نہ سکے، چپ چاپ رہے، جب مولانا موصوف نے دیکھا کہ کچھ اثر نہ ہوا تو ناامید وخفا ہو کر گاڑی میں سوار ہو گئے، وقت مغرب قریب تھا، آپ وضو کرنے کو اٹھے، نماز مغرب پڑھ کر کچھ دیر تک اوراد وظائف میں مصروف ہوئے اور سب انتظار میں کھڑے رہے، فریقین

کے کار پرداز کاغذات ودستاویزات بغل میں دابے تھے، اور اپنے اپنے ثبوت لئے تھے، اتنے میں ہمارے حضرت قبلہ مسجد کے اندر سے برآمد ہوئے اور مسند پر عصا ٹیک کر کھڑے ہوکر دو چار کلمے زبان فیض ترجمان سے فرمانے پائے تھے کہ حاضرین جلسہ پر عجیب اثر پیدا ہوا، سب پر گریہ طاری ہوا، اور چیخ پکار ادھر ادھر ہونا شروع ہوئی، سب کا دل امنڈ آیا، اور لوگ دوڑ دوڑ کر پائے مبارک پر گرنے لگے، جب اور بڑھا تو دھکے کی نوبت پہونچی، مگر پروانہ وار سب جان دیتے تھے، وہ نظارہ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے، اب تک وہ نظارہ سامنے آنکھوں کے گھومتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ الغرض ہمارے حضرت قبلہؒ نے ہاتھ کے اشارہ سے ارشاد فرمایا کہ آپس میں گلے مل جاؤ، بس پھر کیا تھا ہر شخص جوش میں نہایت ذوق وشوق سے آپس میں گلے ملنے لگا اور ایک کو ایک مبارکباد دینے لگا، عید ہوگئی۔" (۱)

اسی طرح بھاگل پور میں مقلدین وغیر مقلدین کے درمیان ایک طویل نزاع تھا جو کسی طرح ختم نہیں ہورہا تھا، متعدد ممتاز علماء اور مقررین صلح کرانے آئے لیکن ناکام واپس آئے، آخر میں وہاں کے چند لوگون نے مولانا کو دعوت دی اور انہوں نے ایک دن ایک رات وہاں قیام کیا، اور رات کے وقت چند مرتبہ لوگوں کے سامنے کچھ کلمات کہے، اس کا اس قدر اثر ہوا کہ صبح کو یہ سب گروہ جو کل تک برسرپیکار تھے نہ صرف اس جھگڑے سے تائب ہوئے بلکہ مولانا کے ہاتھ پر بیعت بھی کی، بہت سے وہ لوگ جو اہل دل اور مشائخ سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ رکھتے تھے اور اپنی محدود دنیا سے باہر سوچنے کے عادی نہ تھے، وہ بھی مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے ان کی مجلسوں میں بیٹھے، اور بیعت ہوکر واپس ہوئے۔

مخدومی مولوی سید عزیز الرحمٰن صاحب (۲) نے عم مخدوم معظم ومولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ سے اپنے ایک واقعہ کا ذکر کیا، جس سے مولانا کی اثر آفرینی پر روشنی پڑتی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ایک دور میں ان کے دل میں کچھ شکوک اور وسوسے ایسے پیدا ہوئے

---

(۱) کمالات محمدیہ، ص ۱۶۲ و ۱۶۳ (۲) مولوی سید عزیز الرحمان حسنیؒ مولانا حکیم سید عبدالحیؒ ناظم ندوۃ العلماء کے پھوپھی زاد بھائی تھے، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے دور اول میں تعلیم پائی، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے بیعت تھے، بہت خصوصیات کے مالک اور ذاکر وشاغل بزرگ تھے۔

جس سے سخت الجھن اور گھبراہٹ پیدا ہوئی اور یہ سمجھ میں نہ آیا کہ کس سے رجوع کیا جائے، انہوں نے اپنے بھائی مولانا سید عبدالحی سے اپنی اس پریشانی اور فکر کا اظہار کیا، مولانا نے ان کو مشورہ دیا کہ مولانا محمد علیؒ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ایسے شکوک وشبہات مولانا سے کیسے رفع ہو جائیں گے، لیکن ان کی خدمت میں مونگیر حاضر ہوئے، کہتے ہیں کہ مولانا چارپائی پر تشریف رکھتے تھے، اپنے پاس بٹھالیا، چند منٹ میں حاضر رہے کی سعادت حاصل ہوئی، درود شریف پڑھنے کی ہدایت کی، اسی وقت گاڑی جاتی تھی، جوانی کا زمانہ تھا، بعض قدیم رفیق درس جن کا قیام مونگیر میں تھا اتفاق سے موجود نہ تھے، اس لئے دلبستگی کا کوئی سامان نظر نہ آیا، ہم روزہ واپسی ہوگئی، لیکن سارے وسوسے اور شکوک یک لخت زائل ہو گئے، پھر ان کا کبھی حملہ نہیں ہوا۔

پولیس کے ایک داروغہ جو اپنی بے رحمی، بے عنوانی اور رشوت ستانی میں مشہور تھے، ایک مرتبہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے، مولانا کو دیکھ کر اور ان کی باتیں سن کر اس قدر متاثر ہوئے کہ بیعت کی اور ساری برائیوں سے توبہ کی، اور اس کے بعد ان کی یہ حالت ہوئی کہ وہ آنکھ جو آنسوؤں سے ناآشنا تھی، بات بات پر اشکبار ہونے لگی، حج کا اس قدر شوق پیدا ہو گیا کہ اس کا ذکر سنتے ہی بیقرار ہو جاتے اور رونے لگتے، ایک بار حج کر چکے تھے لیکن سیری نہ ہوئی، پھر ارادہ تھا لیکن طبیعت خراب ہوگئی، اسی عالم شوق وورافتگی میں مولانا کو ایک خط لکھتے ہیں اور اپنی حالت بیان کرتے ہیں:۔

> ''حرمین شریفین کا ذکر آتے ہی چیخ مار کر رونے کو جی چاہتا ہے مگر الحمد للہ حتی الوسع ضبط سے کام لیتا ہوں، آنکھوں سے مجبور ہوں، بے اختیاری ہے ورنہ اس اس سے بھی ضبط کرتا۔ حضرت درد علیہ الرحمہ کا ایک شعر اس وقت یاد آگیا، اس کے فضل سے اور حضور کی ہمت سے اگر ایسا ہو جاؤں تو زہے نصیب ؎
>
> زردی رخ رونا ہر دم کا دو ہیں شاہد خوب ہمارے
> چاہت کا اقرار کیا ہے کیونکر اب انکار کریں (۱)

---

(۱) کمالات محمدیہ، ص ۱۴۲ و ۱۴۳

بعض مرتبہ ایسا ہوا کہ بعض خوش قسمت حضرات نے کسی خاص کیفیت اور حال کے وقت دعا کی درخواست کی اور کسی تمنا کا اظہار کیا اور خدا کے حکم سے اسی وقت قلب کی حالت بدل گئی اور یہ حالت برابر قائم رہی۔

محمد فضل الدین مستری جو لاہور کے رہنے والے تھے اور جمال پور میں (جو مونگیر سے پانچ میل کے فاصلہ پر ہے، ایک بڑے ٹھیکہ دار تھے اور مولانا کے ہاں ان کی آمد ورفت بھی تھی، ۱۹۰۱ء میں جب مولانا نے زنانہ مکان تعمیر کروایا، اس وقت ان صاحب نے بڑی مدد کی اور جب مولانا نے تعمیر مکان کا معاوضہ لینے کو کہا تو صاف معذرت کردی اور ایک خاص تمنا کا اظہار کیا۔ کمالات محمدیہ (اضافات) میں اس واقعہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

> ''فضل دین مستری کا بیان ہے کہ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ مکان میں نے اس واسطے نہیں بنوایا کہ آپ سے اس کی قیمت لوں، میں ایک بڑا ٹھیکدار ہوں، اس مکان کے بنوانے سے مجھ پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ مولانا فرمایا کہ پھر کس لئے بنوایا ہے؟ مستری صاحب نے کہا کہ اگر وعدہ کیجئے تو عرض کروں۔ فرمایا کہ مجھ پر تمہارا احسان ہے، اگر میرے بس میں ہے تو وعدہ کرتا ہوں، کہو کیا بات ہے۔ فضل دین مستری نے عرض کیا کہ میں بہت سے بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، ممالک اسلامیہ کی بھی سیاحت کی ہے، جوانی سے صرف ایک میری تمنا ہے کہ میرا قلب جاری ہوجائے اور میں نے اسی مقصد سے یہ مکان بنوایا ہے۔ مستری صاحب نے خود مجھ سے کہا کہ حضرت علیہ الرحمہ کو جوش آیا اور وہ کھڑے ہوگئے اور میرے پاس آکر یہ کہا قمیص اٹھاؤ، میں نے قمیص اٹھائی اور اپنا سینا کھول دیا۔ آپ نے شہادت کی انگلی سے میرے قلب کو ٹھوکر ماری اور فرمایا:۔ ''میاں قلب یوں جاری ہوتا ہے۔''(۱)

---

(۱) یہ واقعہ مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے اضافات کمالات محمدیہ میں لکھا ہے۔ فضل دین مستری مرحوم نے مولانا سے یہ واقعہ اس وقت بیان کیا جب وہ ۱۹۳۴ء میں مونگیر آئے، یہ بھی کہا کہ وہ دن ہے اور آج کی گھڑی، الحمد للہ کبھی قلب غافل نہیں ہوا۔

مولانا کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ تھا کہ ان کی ہر گفتگو، ہر موعظت اور ہر نصیحت 'دل کی آواز' تھی، اور اس دل کو خدا سے گہرا تعلق تھا، ان کے تعلق باللہ اور اخلاص دردمندی نے ان کے الفاظ میں وہ تاثیر پیدا کر دی تھی جو اکسیر یا کیمیا کا خاصہ ہے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جہاں بڑی بڑی تقریریں اور علمی بحثیں اور مناظرے ناکام رہتے تھے، مولانا کے سادہ اور مختصر کلمات حد درجہ مؤثر ثابت ہوتے اور محفلوں کا رنگ بدل جاتا۔

مریدین کا تعلق و شیفتگی

دوسری بات جو نمایاں طور پر نظر آتی ہے اور جس سے کوئی تذکرہ نگار صرف نظر نہیں کر سکتا، وہ گرویدگی و شیفتگی ہے جو مولانا کے اہل تعلق کو مولانا سے تھی۔ مولانا میں اس قدر محبوبیت تھی کہ اپنے تو اپنے بیگانے بھی ان کی طرف میلان اور کشش محسوس کرتے تھے، اور متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے تھے۔ اس عام رجوع، خلقت کے ہجوم اور عقیدت و محبت میں اس بات کو بڑا دخل تھا، اور اس کی وجہ سے ان کے رشد و ارشاد کا سلسلہ بیحد وسیع ہو گیا تھا۔

پٹنہ کے مشہور حکیم اور عالم مولانا عبد الباری مرحوم نے مولانا سے بیعت کی درخواست کی، مولانا نے ٹالنا چاہا، دس بارہ روز تک وہ برابر درخواست کرتے رہے، اور مختلف طریقوں سے ان کو جواب دیتے رہے۔ آخر میں حکیم صاحب نے کہا کہ حضرت! میں سب کچھ یہاں پاتا ہوں اور کہیں میری تسلی نہیں ہوتی، آپ مرید کر لیجئے۔ اس وقت مولانا نے ان سے بیعت لی۔ پھر ان کا یہ حال ہوا کہ علالت کے دوران بار بار اس تمنا کا اظہار کرتے تھے کہ کاش میری جان مولانا کے سامنے نکلے۔ پھر انہوں نے آدمی بھیج کر اس خواہش کا اظہار کیا۔ دس روز کے اندر اندر ان کے سترہ تار اس مضمون کے آئے۔ مولانا یہ حالت دیکھ کر قاری نور محمد صاحب کے ساتھ تشریف لے گئے اور ان کو تسکین ہوئی۔

حکیم صاحب کی شیفتگی کی یہ حالت تھی کہ سوتے سوتے جب آنکھ کھلتی تو فرماتے دیکھو حضرت مولاناؒ تشریف لائے ہیں۔ خدام کہتے ہیں کہ اس وقت رات ہے، کہاں تشریف لا سکتے ہیں۔ یہ سن کر خاموش ہو جاتے، پھر اسی طرح فرماتے۔ (۱)

---

(۱) کمالات، ص: ۱۱۵۔

کمالات محمدیہ کی مصنف محمد علی حسن صاحبؒ ایک مرتبہ سخت علیل تھے، اسہال کی شکایت تھی، اور دستوں کی کثرت سے ضعف حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا، اسی درمیان میں ان کو اطلاع ملی کہ مولاناؒ ان کے مکان سے چار میل کے فاصلہ پر تشریف فرما ہیں۔ یہ سنتے ہی از خود رفتہ اور بیقرار ہو گئے، اور بیماری کی پرواہ کئے بغیر کسی نہ کسی طرح وہاں پہونچ کر زیارت سے مشرف ہوئے۔

جس وقت ان کو خبر ملی تھی اس وقت عیادت کے لئے کئی آدمی پاس موجود تھے، ان سے خوشامد کر کے کہنے لگے کہ کہاروں کو بلا دو۔ لوگ ان کے ضعف اور علالت کی وجہ سے تیار نہ ہوتے تھے۔ آخر کار وہ مجبور ہو کر بے ساختہ رونے لگے۔ اس وقت ان لوگوں نے یہی مناسب سمجھا کہ کہار بلا دیئے جائیں، چنانچہ مولانا کی خدمت میں روانہ ہوئے۔ کمالات محمدیہ میں لکھتے ہیں کہ:۔

> ''جیسے جیسے نزدیک پہونچتے گئے طبیعت اچھی ہوتی گئی، حتی کہ کوئند (وہ جگہ جہاں مولانا آکر مقیم ہوتے تھے) بلا استعانت خود ہی سواری سے اترے''۔(۱)

کوئند کے پاس ایک موضع ''مہونی'' تھا، بعض محبین کے اصرار پر دو چار گھنٹہ کے لئے وہاں بھی تشریف لے گئے، اس سے پہلے مولانا کبھی یہاں نہ آئے تھے۔ بعض عشاق فرط شوق میں پالکی کے ساتھ دوڑ رہے تھے۔

مولانا نے خلاف معمول ایک جگہ پالکی رکھنے کا حکم دیا اور لوگوں سے پوچھا کہ یہاں پر کسی بزرگ کا مزار ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہاں سے چند ہی قدم کے فاصلہ پر شاہ شہاب الدین گجراتی (۲) کا مزار ہے، جنہیں عوام 'شہابا شہید' کہتے ہیں۔ آپ نے کچھ دیر فاتحہ پڑھ کر کہاروں کو چلنے کے لئے اشارہ فرمایا۔

مصنف کمالات لکھتے ہیں:۔

> ''بہت سے لوگوں کو اس گاؤں کے بیعت سے مشرف فرمایا، غلاموں کی خوشی کا

---

(۱) کمالات محمدیہ۔ (۲) شہاب الدین گجراتی خواجہ سہاب الدین سہروردیؒ کے مجاز تھے، اس جگہ (جو اس زمانہ میں جنگل تھی) آکر ڈیرا ڈالا، اور پوری زندگی عبادت و ریاضت میں گزار دی، ایک روز ڈاکوں نے شہید کر دیا۔ (کرامات محمدیہ، ص ۷)

عجب عالم اور جوش وخروش کی نرالی کیفیت تھی، اور ہر شخص زبان حال سے گویا یہ کہہ رہا تھا"۔

کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید

کہ سایہ بر سرش اوراخت چوں تو سلطانے (۱)

ایک قصبہ میں چند نوجوان جن کا گانے بجانے کے سوا اور کوئی مشغلہ نہ تھا اور شراب وغیرہ کے عادی تھے۔ وہاں جب مولانا تشریف لے گئے اور طالبین کا ہجوم ہوا تو وہ بھی بیعت کے طالب ہوئے، مولانا ٹالتے رہے، انہوں نے دوسروں کے ذریعہ کہلوایا، کئی روز تک یہی ہوتا رہا۔ مؤلف "مقامات محمدیہ" لکھتے ہیں:۔

"ایک روز وہ آئے اور آپ نے ناصحانہ کلمات فرمانا شروع کئے، اور انہیں گریہ شروع ہوا، دیر تک روتے رہے، اس کے بعد حضرتؒ نے فرمایا کہ آؤ اب مضائقہ نہیں، اسی وقت انہیں مرید کیا، سب جانتے ہیں کہ اسی وقت سے پھر وہ ان نامشروع امور کے گرد تک نہ گئے، اور نہایت پابند صوم وصلوٰۃ اور درود وظائف کے ہوگئے، لوگ ان کی حالت دیکھ کر متحیر ہوتے ہیں، یوں تو اہل اللہ کی دعا سے بہت امور پیدا ہی ہوا کرتے ہیں، مگر ان کی صحبت کے فیضان سے مردہ دلوں کا زندہ ہوجانا بڑی کرامت ہے۔"

اس سفر میں بیعت کرنے والوں کا بہت ہجوم رہا، بیس اور پچیس میل تک کے لوگ آ کر بیعت ہوئے، ان میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھے۔

مونگیر کے ایک رئیس کریم بخش مرحوم جو تعیش کے دلدادہ اور کھلے ہوئے فسق وفجور میں مبتلا تھے اور شراب کے اس قدر عادی تھے کہ سب چھوڑنا ان کے لئے آسان تھا لیکن اس کو چھوڑنا ناممکن تھا، ان کی زندگی بھی مولانا کے فیض صحبت سے ایسی تبدیلی ہوئی کہ رنگ ہی دوسرا نظر آنے لگا اور یہ تبدیلی بھی ایک خاص واقعہ سے ہوئی:۔

"ایک مرتبہ معمول کے مطابق شراب کا دور چل رہا تھا، کریم بخش نے جام ہاتھ میں لیا تو دیکھا کہ مولانا چلے آرہے ہیں، گلاس ہاتھ سے چھوٹ گیا اور محفل چھوڑ کر گھر چلے گئے۔ ایک گھنٹہ کے بعد کھانے سے فارغ ہو کر جب ان کی بیوی نے

---

(۱) کرامات، ص:۷

جام آگے بڑھایا تو پھر نیت بدل گئی، گلاس ہاتھ میں ٹھیک آیا بھی نہ تھا کہ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے مولانا سامنے صحن میں کھڑے ہیں، کانپ گئے، اور بیہوش ہو کر گر پڑے، جب ہوش آیا تو بات سمجھ میں آئی، اگر چہ رات کافی ڈھل چکی تھی، لیکن اسی وقت غسل کیا، کپڑے بدلے اور مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے، بقیہ شب مسجد میں گزاری اور صبح مولانا کی زیارت سے مشرف ہوئے، اور تجدید بیعت کی۔" (۱)

مولانا کا دوسرا سفر حج

مولانا کا دوسرا سفر حج اسی بے سروسامانی کی حالت میں ہوا جس حالت میں پہلا سفر ہوا تھا مولانا نے حسب عادت لوگوں کو اس کی اطلاع بھی نہیں دی۔ بظاہر تنگی اور دشواری تھی لیکن سارے کام بہت آسانی اور خوشی کے ساتھ انجام پا رہے تھے اور پورا اطمینان اور فراغت حاصل تھی۔ اپنے ایک عقیدتمند میاں ابراہیم خاں کو مکہ معظّمہ سے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"اب مدینہ طیبہ کا ارادہ ہو رہا ہے مگر اختیار سرکار ہے، جب تک چاہیں یہاں رکھیں اور جب چاہیں وہاں لے جائیں، یہ بھی اسی کی قدرت ہے کہ ہم سے ضعیف وناتواں کو یہاں آرام سے لایا اور آرام سے رکھا، جس طرح کے مصارف ہوئے اور ہو رہے ہیں، امیروں کا کام ہے۔" (۲)

اس مدت میں مولانا نے جو خطوط اپنے مریدین اور خلفاء کو بھیجے ان میں ہر خط فنائیت اور خود شکنی اور شکر وعبودیت کا مظہر ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی عظمت وکبریائی اور اپنی پستی، بے مائگی اور بے بسی کا استحضار مولانا کو ہر وقت رہتا تھا اور کسی وقت یہ حقیقت ان کی نظروں سے اوجھل نہ ہوتی تھی۔

یہ سفر ۲۸ ر رمضان ۱۳۲۶ھ میں ہوا، اور ۱۳۲۸ھ میں واپسی ہوئی، لیکن اس دوسال کے قیام کے حالات بہت مختصر ملتے ہیں، اتنا سے ضرور چلتا ہے کہ مولانا کا فیض وہاں بھی جاری رہا، اور بہت سے علماء اور اہل طلب بیعت سے سرفراز ہوئے، ان میں شیخ محمد جعفر مطوف ؒ اور شیخ ابوبکر حماد مکی مدرس ؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس موقع پر ممباسہ کے ایک

---

(۱) کمالات محمدیہ (اضافات) باختصار ص ۳۱۲ (۲) کمالات محمدیہ، ص ۲۵۷۔

عالم شیخ حاجی ابراہیم بھی مرید ہوئے اور خلافت سے بھی سرفراز ہوئے۔ افریقہ جاکر اسلام کی تبلیغ شروع کی، اور سیکڑوں غیر مسلموں کو مشرف باسلام کیا، یہ بزرگ مولانا کی آمد سے پہلے مدینہ منورہ میں مقیم تھے، اور روزانہ مسجد نبویؐ میں درود وسلام کے بعد دعا کرتے کہ مرشد کی طرف رہنمائی ہو۔ ایک روز خواب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ ارشاد فرمایا کہ میرا لڑکا اس سال حج بیت اللہ کو آرہا ہے اس سے مرید ہوجانا، ۱۳۰۵ھ میں ان کو مولانا کی تشریف آوری کی اطلاع ہوئی، بیساختہ دل کو ان کی طرف کشش ہوئی اور حاضر ہوکر بیعت کی۔ پھر عقیدت ومحبت کا یہ حال ہوا کہ ایک روز مولانا کی پرتکلف دعوت کی۔ اور اپنے تمام ملبوسات راہ میں بچھادیئے تاکہ مولانا اس پر قدم رکھ کر اندر تشریف لائیں، مولاناؒ اپنے زمانہ قیام میں برابر ان کی تربیت کرتے رہے اور آخر میں خلافت بھی عطا فرمائی۔ ان کے پاس ایک رجسٹر تھا جس میں تقریباً ۷۰۰ نومسلموں کے نام درج تھے۔(۱)

شیخ ابوبکر حماد مکیؒ نے جو مولاناؒ کے مرید تھے، مولانا کو اپنے خط کے ساتھ چائے اور فنجان کا ایک سیٹ تحفۃً بھیجا تھا۔ اس کے جواب میں مولانا ان کو عربی میں خط لکھتے ہوئے اپنے سلسلہ کی اجازت وخلافت دیتے ہیں۔(۲)

> "فعليكم أن تجتهدوا في احياء سنن من شرفتم بجواره وافتخرتم بفخاره، فيالها من فخار، وعليكم بغاية السعي في احياء شريعته الغراء، وطريقته الفيحاء، باخلاص النية وحسن الطوية، وعليكم اخذ البيعة عني خلافة لمن يريد أن يدخل في سلك احبائي وطريقة مشائخي الكريم الخ."

---

(۱) حاجی ابراہیمؒ کے صاحبزادہ حاجی محمد صاحب نے مولانا منت اللہ رحمانی کے نام ایک مکتوب میں یہ سب باتیں درج کی ہیں، حاجی محمد صاحب اس حج میں اپنے والد کے ساتھ تھے۔

(۲) اس خط سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کا عربی اسلوب کتنا سلیس، شگفتہ اور تصنع وتکلف سے پاک تھا اس زمانہ میں ہندوستان میں جس اسلوب کا رواج تھا، یہ اسلوب اس سے بہت مختلف ہے اور اس میں خاصی روانی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے۔

حج سے واپسی پر مخلوق سے دل گرفتگی اور خلوت پسندی کا رجحان بڑھ گیا، اس کے ساتھ کتابوں سے رغبت زیادہ پیدا ہوگئی لیکن ارشاد واصلاح اور تزکیہ وتربیت کا کام پوری طرح جاری رہا، اور اس فیاض اور شفاف چشمہ سے نہ معلوم کتنے تشنہ کاموں نے اپنی تشنگی اور خستگی دور کی، اور کتنے گم گشتگان راہ کو منزل کا سراغ ملا۔

مولانا کے اثرات اور فیض وتربیت وارشاد صرف بہار اور غیر منقسم ہندوستان تک ہی محدود نہ تھا، ہندوستان کے باہر بھی ان کے خلفاء اور مسترشدین کے ذریعہ اور حجاز میں خود ان کے زمانۂ قیام میں جس کی مدت دونوں حج ملا کر تین سال ہوتی ہے، یہ شمع سرد دلوں کو گرماتی رہی اور طالبان حق اس سے ایمان کی حرارت اور یقین کی طاقت حاصل کرتے رہے۔

یہ صحیح ہے کہ اس کا مرکز بہار ہی تھا، اور بہار میں بھی مونگیر، بھاگل پور، دربھنگہ اور عظیم آباد میں خاص طور پر مولانا کے مریدین کی بہت بڑی تعداد تھی، لیکن اس کے علاوہ بنگال کے لوگ بھی برابر آتے رہتے تھے اور بیعت کر کے واپس ہوتے تھے۔

مولانا کے پہلے سفر حج کے بعد جس کی تفصیل گزر چکی ہے اس کا ایک سلسلہ قائم ہوگیا تھا، ان آنے والوں میں اہل علم حضرات کی بھی خاصی تعداد ہوتی تھی، حیدرآباد، بھوپال، بمبئی، دہلی کے لوگ بھی خاصی تعداد میں بیعت ہوئے۔ ہندوستان کے باہر حجاز کے علاوہ زنجبار، ممباسہ، کابل، غزنی، خراسان اور روس وچین تک کے اہل طلب اور علماء خدمت میں حاضر ہوکر مستفید ہوئے اور یہ دولت بیدار لے کر واپس ہوئے، ان میں سے بعض نے اپنی پوری زندگی ہندوستان میں گزار دی اور یہیں آسودۂ خاک ہوگئے۔

ایک ممتاز چینی عالم کی بیعت وارادت

ان غیر ملکی مسلمانوں میں ایک ممتاز چینی عالم مولانا نور الحق کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے، جو اپنے ملک کے ایک ممتاز اور مشہور عالم ہونے کے باوجود اہل حق کی جستجو میں نکل کھڑے ہوئے۔ حج کے ارادہ سے چلے تھے لیکن کوئی جذب اندروں کشاں کشاں ہندوستان لے آیا، اور بالآخر مولانا کے یہاں حاضر ہوکر اپنی ساری زندگی یہیں گزار دی۔ ان کی ملاقات مولانا سے کانپور ہی میں ہوئی تھی۔ مولانا ان کے متعلق فرماتے ہیں کہ:۔

''کبھی دومنٹ بھی ان کو ضائع کرتے نہیں دیکھا گیا، ان کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے اسلاف کی روش اور طریقہ یہی ہوتا ہوگا''۔

مصنف ''کمالات محمدیہ'' نے ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

''ملک چین کے رہنے والے اور وہاں کے مشہور اور مستند علماء میں تھے، ان کی ذات سے اس ملک (چین) میں بہت فیض ہوا، تقریباً دو ہزار طلبہ نے آپ سے علوم عربیہ پڑھا، بہت معزز خاندانی عالم تھے، کسی وقت آپ کے اجداد فغفور چین کے وزیر تھے۔ مکان سے حج کے ارادہ سے چلے، صاحب تصانیف تھے، بعض تصانیف چھپوانا بھی چاہتے تھے، سلوک باطنی کا بھی شوق تھا۔ اس وقت حضرت اقدس کانپور میں رونق افروز تھے، آپ وہاں تشریف لائے اور حضرتؒ کے پاس مسجد دلاری میں قیام فرمایا۔ خاندان نقشبندیہ میں آپ مرید ہوئے اور تعلیم سے سرفراز ہوئے اور ایک سال تک ایسی محنت کی کہ لوگ متحیر ہوگئے۔ حضرت اقدسؒ فرماتے تھے کہ کبھی نہ دیکھا کہ دو منٹ بھی کسی سے فضول بات کی ہو یا کسی طور اپنا کوئی وقت ضائع کیا ہو۔ شب کو بعد عشاء لیٹ رہتے تھے اور ٹھیک ۱۲ بجے اٹھ کر تہجد و وظائف میں مشغول ہو جاتے تھے، اشراق کی نماز تک یاد خدا میں مشغول رہتے تھے، چاشت کی نماز کے بعد فوراً پڑھانے بیٹھ جاتے، دو طالب علم چینی ہمراہ تھے، انہیں پڑھاتے تھے، پھر شرح وقایہ کا حاشیہ لکھتے تھے اور اسے چھپوانا چاہتے تھے، کیونکہ چین کے علماء میں یہ کتاب نہایت مستند داخل درس ہے۔ علم حقائق و تصوف میں آپ کی کتاب ''نشر اللطائف'' میں نے حضرتؒ کے کتب خانہ میں دیکھی ہے۔ حضرتؒ ان کی نسبت فرماتے تھے کہ یادگار سلف تھے ان کی حالت دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے بزرگوں کا یہ طریقہ اور یہ روش ہوگی، انہوں نے اپنی عمر میں اس قدر کام کئے کہ سمجھ میں نہیں آتا، آپ کا انتقال کانپور میں ہی ہوا، جدید گورستان میں آپ کا مزار پختہ بنا ہے۔''(۱)

---

(۱) کمالات محمدیہ، ص ۲۵۷

درویشی وسلطانی

طالبین کے ہجوم اور کثرت کا یہ عالم تھا کہ اکثر کھانے کے وقت سوسو آدمی دستر خوان پر کھانا کھاتے۔ ذاکرین وشاغلین کے لئے کافی تعداد میں حجرے تھے۔ زائرین کے لئے مہمان خانے تھے، جہاں لوگ آکر کئی دن ٹھہرتے اور فیض صحبت وتربیت حاصل کر کے واپس ہوتے۔

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اپنے چشم دید مشاہدات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ”خاکسار نے براہ راست حضرت مولانا محمد علی مونگیری نور اللہ مرقدہ سے سنا تھا کہ ان کے پیر ومرشد مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ نے ایک دفعہ رخصت کرتے ہوئے ایک مٹھی چنے آپ کی گود میں ڈال دیئے اور فرمایا کہ: لو یہ دنیا دیتا ہوں۔ گو دینے کو تو صرف ایک مٹھی چنے ہی حضرتؒ نے دیئے تھے، لیکن حق سبحانہ وتعالیٰ نے مولانا محمد علی صاحب قدس سرہ کو دین کے سوا دنیا میں بھی رفاہیت وکشادگی وفراخی عطا فرمائی تھی۔ شاید بڑے بڑے نوابوں اور امیروں کے لئے آپ کی زندگی کا یہ رخ قابل رشک بنا ہوا تھا۔ خاکسار نے خود دیکھا تھا کہ صرف چاء خانقاہ رحمانیہ میں خرچ ہوتی تھی، پندرہ سیر یا آدھ من روزانہ سے کم شکر کے صرفہ کا تخمینہ اس کے لئے نہیں کیا جاسکتا۔ ایک باغ میں کوٹھی، مسجد، خانقاہ سب کا انتظام غیب سے کیا گیا تھا۔“(۱)

مولانا کے بعض دوروں اور لوگوں کے ہجوم شوق کی کچھ تفصیلات گزشتہ اوراق میں پیش کی گئی ہیں لیکن یہ کوئی اتفاقی واقعات نہ تھے، مولانا کے اکثر وبیشتر سفروں کا یہی حال تھا کہ ہر اسٹیشن پر بڑی تعداد میں لوگ ملاقات واستفادہ کے لئے حاضر ہوتے حالانکہ بعض اوقات کوئی اطلاع بھی نہ ہوتی، بعض وقت ایسا ہوا کہ صاحب خانہ کو ایک ہزار آدمیوں کی ضیافت کرنی پڑی۔ ضعف بڑھ جاتا تو پالکی پر آمد ورفت ہوتی، اس وقت معمولی فاصلوں میں کہاروں کی نوبت کم آنے پاتی، علماء اور اشراف اپنے کاندھوں پر پالکی اٹھانے کو سعادت سمجھتے، اور بلا جھجک یہ خدمت انجام دیتے۔

---

(۱) سوانح قاسمی (جلد سوم) ص ۹۴

مستقل قیام کی صورت میں معمول یہ تھا کہ ظہر کی نماز کے بعد عام نشست ہوتی، عموماً ۵۰، ۶۰ آدمی اس نشست میں ضرور ہوتے تھے، بعض دن اس تعداد میں اضافہ بھی ہوجاتا، تہجد کے لئے تین بجے بیدار ہوتے تھے اور اس وقت تقریباً ایک گھنٹہ کے لئے خصوصی نشست ہوتی تھی۔(۱)

مصنف ''کمالات رحمانی'' نے درویشی وسلطانی کے اس عجیب وغریب اجتماع کے متعلق لکھا ہے:۔

''مولوی صاحب موصوف باوجود اہل وعیال وخانقاہ جس میں کثیر خلقت آکر ٹھہرتی ہے بس متوکل علی اللہ ہیں، کھانا امیرانہ ہے، ایک رئیس آئے اور شام کو کثرت سے لالٹین میں تیل بھرتے جو دیکھا تو کہا کہ خدا جانے کتنے کمرے ہیں، ایک بڑے نواب کی شان سے آپ کی زندگی ہے اور عمارت وباغ اور اس کے ملازم کثیر دیکھ کر لوگوں کو حسد ہوتا ہے، اور سب کی عقل حیران ہے کہ عمارت کا کارخانہ اتنا بڑا ہے کہ کسی امیر کا نہیں ہے، مسافر غیر متناہی آتے ہیں، کھاتے ہیں اور بعض ایک ہفتہ اور بعضے ایک مہینہ ٹھہرتے ہیں۔''(۲)

چار لاکھ مریدین

مولانا شاہ تجمل حسین بہاریؒ خلیفہ مولانا فضل رحمٰن رحمۃ اللہ علیہ ومصنف ''کمالات رحمانی'' نے اپنی کتاب میں مولانا کا ذکر کرتے ہوئے ان کے مریدین کی تعداد چار لاکھ بتائی ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

''مولانا فضل رحمٰن قدس سرہ کی فقیری اور مولویت کو بجز مولوی مولانا محمد علی صاحب خلیفہ اعظمؒ کے کسی نے نہیں پھیلایا، چار لاکھ کے قریب مریدین آپ کے ہیں، ہند میں، عرب میں، افریقہ میں، زنجبار وغیرہ ہیں۔''(۳)

اگر اس اندازہ کو مبالغہ یا حسن عقیدت پر محمول کیا جائے تب بھی اس میں شک نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے مریدین کا حلقہ بہت وسیع تھا اور ہزاروں سے یقیناً متجاوز ہوچکا تھا۔

---

(۱) مقالہ متعلقہ سوانح مولانا منت اللہ رحمانی، ص ۷۴ و دیگر مصادر (۲) کمالات رحمانی، ص ۵۲ (۳) ایضاً

حاجی امداداللہ صاحبؒ نے بھی مولانا کو چاروں سلسلوں کی اجازت عطا کی تھی، ایک تسبیح، ایک چادر، اور ایک ٹوپی بطور خرقہ کے بھیجی تھی، اجازت نامہ حاجی صاحبؒ نے ''ضیاء القلوب'' پر اپنے قلم سے تحریر فرمایا ہے۔(۱)

تربیت واصول تربیت

مولانا کے انداز تربیت اور اصول تربیت میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں اور بنیادی معلوم ہوتی ہے، وہ ''محبت'' اور ''اطاعت'' ہے۔ یعنی ایک طرف مسلمان کا دل سوز و گداز اور عشق و محبت سے لبریز ہو، دوسری طرف وہ طریق سنت اور جادۂ شریعت سے ایک قدم منحروف نہ ہو اور دونوں کے حدود وآداب کا ہر وقت خیال رکھے، وہ ضبط محبت، شرط محبت کے قائل تھے، اور خود ان کی زندگی بھی اسی کا نمونہ تھی۔

دوسری طرف وہ ہر مسترشد سے اصلاح وتربیت کا قریبی اور عملی تعلق قائم رکھتے تھے، یہ تعلق اس نوعیت کا تھا کہ ہر شخص یہ سمجھتا کہ میرے حال پر مولانا کی شفقت وعنایت سب سے زیادہ ہے۔ مولانا کے مسترشدین اور خلفاء کی تحریروں، خطوط اور تصانیف میں اس کا بکثرت اظہار ملتا ہے۔ فراخ دلی اور وسیع النظری مولانا کے خمیر اور افتاد طبع میں داخل تھی، اس لئے سختی اور تشدد کی نوبت ہی نہ آتی تھی، وہ ان کے حالات کی خبر رکھتے تھے اور بعض اوقات تربیت کے ساتھ اگر ضرورت ہوتی تو خود ان کی مالی اعانت کرتے، اپنی ذات کے لئے ان سے خدمت لینے اور ان کی اعانت قبول کرنے کی نوبت شاید آتی ہی نہ تھی۔

زیادہ سے زیادہ اس سلسلہ میں جو چیز ملتی ہے وہ قرض ہے، جو بہت شدید ضرورت کے وقت مولانا کسی اہل تعلق سے لیتے تھے، پہلے حج میں مولانا کے پاس واپسی کے لئے روپیہ نہ تھا، اس وقت ایک صاحب نے کچھ رقم پیش کرنی چاہی، مولانا نے اس کو قرض کی حیثیت سے قبول کیا اور جلد ادائیگی کی۔ کسی کی تنبیہ اور رہنمائی اس انداز میں نہ کرتے تھے کہ اس کی دل شکنی ہو اور لوگوں کو بلاضرورت اس کا علم ہو۔

---

(۱) مقالہ از مولانا رحمانی وکمالات محمدیہ

مولانا عبدالعزیز بہاری مصنف ''کراماتِ محمدیہ'' بیان کرتے ہیں کہ:۔

''مظفر پور کے قیام کے زمانہ میں ایک بار حضرت اقدسؒ کے آستانہ پر بسواری ریل مونگیر آرہا تھا، صاحب پور کمال میں جس خانہ میں بیٹھا تھا کہ ایک بازاری عورت میرے منع کرنے کے باوجود اسی خانہ میں آکر بیٹھ گئی، اور کچھ اس طرح بے حجابانہ طور سے سامنے آکر بیٹھی کہ احتیاط کرنے پر بھی اس پر نگاہ پڑ جاتی تھی، بشریت کے تقاضے سے خواہ مخواہ دل میں برے خیالات پیدا ہوئے، جب حاضر دربار فیض سے آثار ہوا اور حضرت اقدسؒ کی ملازمت سے شرف یاف ہوا تو مجلس عام تھی، کچھ دیر کے بعد آپ نے فرمایا کہ جناب امیر المؤمنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی مجلس میں ایک ایسا شخص وارد ہوا جو راستہ میں کسی نامحرم پر نظر بد کئے تھا اور آپ کی مجلس میں بیٹھ گیا، آپ کی طبیعت اسے دیکھ کر منغض ہوئی اور فرمایا کہ میرے پاس ایسے لوگ آتے ہیں کہ ان کی آنکھوں سے زنا ٹپکتی ہے جس کی نسبت آپ نے یہ الفاظ فرمائے تھے وہ سن کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ یا امیر المؤمنین خدا کی طرف سے اس وقت آپ کو الہام ہوا جو آپ نے ایسا ارشاد فرمایا؟ آپ نے جواب میں فرمایا کہ مجھ کو الہام نہیں ہوا بلکہ مومن کی فراست ہے، اس کے بعد یہ حدیث پڑھی:۔''اتقوا فراسة المؤمن فانه ينظر بنور اللّٰه'' اس تذکرہ کے بعد حضرت اقدس نے فرمایا کہ نامحرم پر نظر بد سے گناہ بے لذت کے سوا کیا فائدہ ہے۔ جامع اوراق نے غور کیا کہ یہاں پر سوا میرے کوئی ایسا شخص نہیں معلوم ہوتا جو اس جملہ کا مخاطب ہو۔''(۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ طریقہ اور دستور تھا کہ اپنی مجالس میں عمومی بات کہتے تھے، اور سمجھنے والا سمجھ جاتا تھا، مولانا نے اصلاح و تربیت میں اسی اصول کو ہمیشہ مدنظر رکھا، اور ایسے مواقع پر ہمیشہ عمومی بات کہنے پر اکتفا کیا، یا اشارہ اور کنایہ سے کام لیا، بے تکلف خادموں اور قریبی تعلق رکھنے والوں سے بھی مولانا اسی انداز میں بات کرنا پسند کرتے تھے اور دل شکنی سے بہت بچنا چاہتے تھے۔ یہ نبویؐ طریقہ تربیت ان طالبان حق

(۱) کراماتِ محمدیہ، ص ۱۴

کے لئے بہت مفید اور مؤثر تھا، جس میں ہر طبقہ اور ہر استعداد کے لوگ تھے۔ اس میں انسانی فطرت اور نفسیات کی پوری رعایت تھی، اور انسان کے معاندانہ اور جوابی جذبہ کو ابھرنے اور قبول اصلاح میں رکاوٹ بننے کا موقع بھی بالکل نہ ملتا تھا۔

اس انتظام وپیش بندی کے بعد انہوں نے محبت کی اس دعوت عام کا اعلان کیا، جس میں کسی کی کوئی تفریق اور امتیاز و تخصیص نہ تھی، انہوں نے اپنے مخلصین اور اہل تعلق سے بارہا فرمایا کہ:۔

"شروع میں کچھ محنت ضرورت ہے، جب دل محبت سے بھر جائے گا تو پھر برسوں کا کام گھنٹوں اور منٹوں میں ہونے لگے گا" (۱)

ان کے نزدیک سارا تصوف اور سارا مجاہدہ، اور روحانی کمال یہ ہے کہ آدمی سب کچھ کرے لیکن ان کا دل ہر وقت خدا میں لگا رہے۔ وہ کہتے تھے کہ:۔

"اصل یہ ہے کہ خدا سے رابطہ اور واسطہ پیدا ہوا۔"

مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ کے حوالہ سے انہوں نے ایک قول نقل کیا ہے کہ:۔

"بہت سے لوگ میرے پاس آئے جن کا ہر بن موذا کر تھا مگر انہیں خدا سے کوئی واسطہ نہ تھا"۔ (۲)

ایک مرتبہ فرمایا:۔

"آنکھ سے دیکھو، کان سے سنو، ہاتھ سے کام کرو، اور دل کو اس کے ساتھ مشغول رکھو" (۳)

مولانا فرماتے تھے کہ:۔

"مرشد کی تلاش میں عجلت سے کام نہ لینا چاہئے، جسے دیکھے کہ شریعت کا پورا پابند ہے، عبادت اور معاملات میں ٹھیک ہے، اس کی صحبت میں خدا یاد آتا ہے، دنیا کی محبت میں کمی ہوتی ہے، اس سے بیعت کرلے۔"

---

(۱) نصائح بنام مولوی شرافت حسین صاحب۔ (۲) نصائح بنام مولوی شرافت حسین صاحب۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ قیامت کے روز بہت سے علماء، قراء، اور زہاد ایسے ہوں گے جن کو عذاب دیا جائے گا اور کہا جائے گا جس مقصد کے لئے یہ سب تم نے کیا تھا وہ تمہیں حاصل ہوگیا اب یہاں تم کو کیا چاہئے۔ (۳) ایضاً

بالخصوص علماء اور تعلیم یافتہ حضرات بیعت کی درخواست کرتے تو ان کو اکثر یہ فہمائش کرتے، عوام اور خواندہ لوگوں سے یہ بات نہ کہتے تھے کہ ان کے لئے یہ جستجو اور تلاش بھی مشکل ہے۔

طالبین و مسترشدین کے لئے ایک قانون نہ تھا بلکہ ہر شخص کو اس کی استعداد و صلاحیت اور حالات کے مطابق ہدایات اور مشورے دیتے تھے۔ عام طور پر قرآن مجید کی زیادہ تلاوت پر زور دیتے تھے، اس کے بعد ورد و استغفار و ذکر وغیرہ۔ استغفار کے متعلق یہ فرماتے تھے کہ:۔

> ''پچھلی شب آنکھ کھل جائے تو اس وقت نہایت توجہ اور حضور قلب سے اپنے گناہوں کا خیال کرو اور استغفار پڑھا کرو، اللہ تعالیٰ نے اچھے لوگوں کی جو خوبیاں بیان کی ہیں اس میں یہی فرمایا ہے کہ:۔
>
> "بالاسحار یستغفرون۔"(۱)

ذکر و شغل کی حکمت اور فائدہ بیان کرتے ہوئے مولانا ایک بہت اہم حقیقت کی طرف توجہ دلاتے ہیں:۔

> ''صوفیاء کرام نے جو ذکر و شغل بیان فرمائے ہیں، ان کا اصلی مقصود یہ ہے کہ احکام شرعی جیسا ہونا چاہئے اسی طرح پر ادا ہونے لگیں، حدیث شریف میں آیا ہے:۔ان تعبد ربك كانك تراه وان لم تكن تراه فانه يراك ۔یعنی کمال ایمان اس مرتبہ کو پہونچ جائے کہ عبادت کے وقت غلبۂ محبت سے اس قدر اسے حضوری ہو کہ گویا خدا کو دیکھ رہا ہے، وہ اس کے ساتھ موجود ہے اور ادنیٰ مرتبہ حضوری کا یہ اشارہ ہوا کہ یہ خیال بندھ جائے کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔''(۲)

طلب اور ہوس کا فرق

اسی ضمن میں مولانا طلب اور ہوس کے فرق کو بیان کرتے ہیں جس کو محسوس نہ کرنے کی وجہ سے اکثر لوگ بہت جلد بددل اور شکستہ خاطر ہو جاتے ہیں، اور انہیں یہ پتہ نہیں چل پاتا کہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ ان کی طلب حقیقی طلب نہیں بلکہ طلب کی تصویر ہے، ہوس

---

(۱) کمالات محمدیہ:۱۱۶ (۲) ایضاً

جلد تھکتی ہے۔ جلد مایوس ہوتی ہے، لیکن طلب اس سے بالاتر ہے، منزل کی دوری اس میں اور قوت پیدا کردیتی ہے، اور وہ کسی وقت بھی ہمت ہارنا نہیں جانتی، وہ بددلی اور مایوسی سے ناآشنا ہے اور خستگی اور درماندگی اس کے لئے زادراہ ہے۔

مولانا فرماتے ہیں:۔

''طالب اس زمانہ میں گویا مفقود ہیں، اول تو کسی کو یاد خدا کا خیال ہی نہیں ہوتا، بلکہ ان باتوں کو کوئی بدعت کہہ کر لوگوں کو ہٹاتا ہے، کوئی کہتا ہے ترقی سے مانع ہیں، اب اگر کسی کو توجہ ہوئی تو طلب نہیں ہوتی، ہوس ہوتی ہے، جس طرح کوئی شخص کسی چیز کو عمدہ سمجھ کر خواہش کرتا ہے، اسی طرح اس کی بھی خواہش بعض کرتے ہیں، طلب میں اور ہوس میں بڑا فرق ہے، طالب کسی وقت محنت سے نہیں تھکتا اور وہ محنت اسے گراں نہیں معلوم ہوتی ہے، دوسری بات یہ ہے کہ وہ حصول طلب سے کبھی مایوس نہیں ہوتا، اس وقت کے طالبوں میں یہ بات نہیں پائی جاتی، تھوڑے دنوں میں تھوڑی سی محنت کر کے تھک جاتے ہیں اور مایوس ہو کر چھوڑ دیتے ہیں، اس لئے وہ محروم رہ پاتے ہیں۔'' (۱)

مولانا ان اوراد و وظائف پر اصرار مفید نہ سمجھتے تھے جو اکثر صوفیہ و مشائخ کے یہاں رائج ہیں، اور عمومی اصلاح و تربیت کے لئے ان کا یہ ارشاد تھا کہ:۔

''شریعت پر عمل کرو، جو وظائف حدیثوں میں آئے ہیں ان پر عمل کرنا کافی ہے، صوفیاء کرام نے جو وظائف تعلیم فرمائے ہیں وہ انہیں کے لئے زیبا ہیں جو خاص اسی کام کے ہو جاتے ہیں، اگر تم نے کچھ کیا اور وہ پورے طور پر نہ ہوا، تو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ (۲)

احکام شریعت میں فرق مراتب

ایک بڑی غلطی اور بے احتیاطی جس میں عوام تو عوام بعض وقت علماء تک گرفتار ہو جاتے ہیں یہ ہے کہ وہ احکام شرعیہ کے فرق مراتب کا پورا لحاظ نہیں کر پاتے، وہ ان چیزوں پر جو شرعی نقطۂ نظر سے دوسرے احکام اور تعلیمات کے مقابلہ میں کم اہم ہیں، زیادہ زور دیتے ہیں، اور

(۱) کمالات محمدیہ، :۱۲۱ (۲) ایضاً، ص:۱۲۲

بعض اہم ترین شعبے سہل انگاری کا شکار ہوجاتے ہیں، مولانا کے طریقۂ تربیت میں اس بات کا بہت خیال رکھا گیا ہے، وہ چاہتے تھے کہ شریعت میں جو چیز جس درجہ کی ہو اس کو اسی درجہ پر رکھا جائے، اور اس میں مذاق اور رجحان کو بے جا مداخلت کی اجازت نہ دی جائے، بلکہ شریعت کی حکمت و مصلحت اور اس کے حکم کو مقدم رکھا جائے۔ مولانا کہتے ہیں:۔

''طالب خدا کو اور شریعت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے چلنے والے کو بہت ضرور ہے کہ جو حکم جس مرتبہ کا ہے اس پر رکھے، کمی و بیشی نہ کرے، اور اپنے اعتقاد میں وہی مرتبہ اس کا سمجھتا رہے، مستحب اور واجب و فرض نہ خیال کرے، یعنی مستحب کے تارک کو ایسا برا اور لائق ملامت نہ سمجھے، جیسا کہ تارک فرض و واجب کو سمجھنا چاہئے، کیونکہ مستحب کا ترک جائز ہے، اس وجہ سے اگر کسی نے ترک کر دیا تو وہ ملامت کا مستحق نہیں ہوسکتا، خصوصاً اس وقت میں کہ شریعت پر چلنا دشوار ہوگیا ہے۔ یہاں زیادہ غور طلب اور ضروری یہ کہنا ہے کہ اگر کوئی شخص مستحب کو بدعت کہہ دے اور اس سے انکار کرے تو اس کا کیا حکم ہے، اس وقت اسی بنیاد پر بہت جھگڑے رہتے ہیں اور اکثر طرفین سے افراط و تفریط ہوجاتی ہے، ایسے کم حضرات دیکھے جاتے ہیں جو افراط و تفریط کو چھوڑ کر میانہ روی اختیار کریں، اور عوام کو امر حق اس طرح سمجھائیں کہ وہ سمجھ جائیں کہ اس قدر زیادتی کی ہے، اور اس قدر غلط ہے اور اس قدر صحیح امر ہے، جس پر ہمیں عامل ہونا چاہئے۔ مستحب کی دو قسمیں ہیں، وہ مستحب جن کا ثبوت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے یا خلفاء راشدینؓ کے قول و فعل سے ثابت ہے، اسے کوئی بدعت نہیں کہہ سکتا، اور جو کہے وہ غلطی کرتا ہے۔ باقی رہا وہ مستحب جس کا ثبوت صرف اگلے بزرگوں کے قول و فعل سے ہوتا ہے، اسے کوئی بدعت کہے اور اس پر عمل نہ کرے تو اس کی مختلف حالتیں ہیں، عمل نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کا خیال ہے کہ اس فعل کو اگر سب کرنے لگیں گے اور ہمیشہ کرتے رہیں گے تو عوام اسے ضروری مثل فرض و واجب و اعتقاد کرنے لگیں گے، اور عوام کو اس غلط اعتقاد سے بچانا ضرور ہے، یا کوئی بڑے پایہ کا شخص ہے، وہ جانتا ہے کہ اگلے بزرگوں نے یہ فعل جس مصلحت سے کیا ہے، وہ مصلحت اس وقت نہیں ہے، اور جناب رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یا خلفائے راشدینؓ نے اسے کیا نہیں، اس لئے نہیں کرتا، ایسا شخص ملامت کے لائق نہیں ہوسکتا بلکہ تعریف کے لائق ہے۔ مسلمانوں کا اور خصوصاً اہل علم کا ایسے فعل کو بدعت کہہ کر اس قدر دشوار کرنا کہ باہم فتنہ وفساد قائم ہوجائے، نہایت برا ہے۔''(۱)

انسان کی صفات سے تعلق

مولانا کے تعلقات لوگوں سے کچھ اس قسم کے تھے کہ تلخی اور ناگواری یا اختلاف کی نوبت ہی نہ آتی تھی، وہ لوگ جن کو مولانا سے کسی وجہ سے اختلاف تھا وہ بھی مولانا کے اکرام وضیافت، لطف صحبت، فیض تربیت اور بعض اوقات مالی اعانت سے محروم نہ رہتے تھے اور مولانا علم کے باوجود ان کا اسی طرح اکرام کرتے تھے اور محبت وشفقت سے پیش آتے تھے۔ کمالات (حصۂ اضافات) میں ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ جس سے نہ صرف مولانا کی مذکورہ بالا روش پر روشنی پڑتی ہے بلکہ ان کی فراست ایمانی کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ تعلقات انسان کی صفات سے ہونا چاہئیں نہ کہ اس کی ذات سے اور وہی تعلق محکم اور پائدار ہوتا ہے، جو صفات واخلاق کی بنیاد پر قائم ہو:۔

''خانقاہ کے زمانۂ قیام میں ایک صاحب برابر خانقاہ آیا کرتے تھے، مولانا مونگیریؒ ان کا بڑا خیال کرتے اور ان کی کافی امداد کیا کرتے، لیکن ان کا حال یہ تھا کہ خانقاہ میں بیٹھ کر مولانا مونگیریؒ کی مخالفت میں بولتے، ہم لوگ سنتے تو بڑی ناگواری ہوتی، لیکن محض اس خیال سے کہ ان کی جاہ مان بہت بڑھی ہوئی ہے کچھ بول نہیں سکتے تھے، ایک دفعہ بعد عصر تشریف لائے اور بعد مغرب مسجد میں بیٹھ کر تبصرے اور شکایتوں کا دفتر کھلا، مجھے بڑی تکلیف پہنچی، اور تہیہ کیا کہ صفائی کے ساتھ حضرت مونگیریؒ کی خدمت میں اسے عرض کروں گا۔ معمول یہ تھا کہ حضرت مونگیریؒ صبح کی نماز سے پہلے بھی چاء پیتے تھے، اور اس وقت تنہا رہتے تھے لیکن چاء میں کسی کو بلا کر شریک کرلیا کرتے، جس شب کا یہ واقعہ ہے اس صبح چاء پر میری طلبی ہوئی، موقع

---

(۱) کمالات محمدیہ، ص: ۱۲۹ و ۱۳۰

تنہائی کا میسر ہوا میں نے بڑی تکلیف کے ساتھ صورتحال عرض کی۔ جواب میں فرمایا:۔خدا کی کوئی مخلوق نہ عیب سے خالی ہے نہ ہنر سے، مجھے اللہ تعالیٰ نے نوجوانی ہی سے لوگوں کو پہچاننے کا ایک ملکہ عطا فرمایا ہے، جب میں کانپور میں تھا تو عورتیں اپنے ہونے والے داماد کو لا کر مجھے دکھلاتیں اور جو رائے میں ان کے متعلق دیتا وہ اکثر صحیح ثابت ہوتی، اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ ایک شخص کو دیکھ کر اس کا عیب و ہنر میری نظر میں آجاتا ہے، اور یہ دونوں اس کے فطری ہوتے ہیں اس لئے کبھی زائل نہیں ہوتے، عام طور پر لوگ کسی شخص سے تعلقات پیدا کرتے ہیں جس وقت اس شخص کا عیب ظاہر ہوتا ہے، تعلقات خراب ہوجاتے ہیں۔ میں تعلقات شخص سے پیدا نہیں کرتا بلکہ اس کی اس خوبی سے تعلق قائم کرتا ہوں جو فطری ہے اور ہمیشہ رہتی ہے، اس لئے میرے تعلقات خراب نہیں ہوتے۔'' (۱)

مولاناؒ کے مکاتیب

مولانا کے خطوط علم و معرفت کا بہت بڑا ذخیرہ اور تصوف کے حقائق و معارف کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

ان کا سب سے بڑا وصف ان کے معانی اور مضامین کی بلندی اور گہرائی کے ساتھ اسلوب کی سادگی اور پرکاری ہے، ان میں زیادہ تر ان حقائق اور مسائل کی طرف توجہ کی گئی ہے جن سے کم و بیش ہر طالب حق کو واسطہ پڑتا ہے، یا اس مرتبہ کمال کی نشاندہی کی گئی ہے جو اس کے قلب و روح کو اس کمال کے حصول کے لئے بے چین کردے اور اس کے سینہ میں ایک نہ بجھنے والی شمع روشن کردے، تقریباً ہر خط میں سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ خدا سے ایک ایسی نسبت یا رابطہ پیدا کرنا چاہئے جو قلب کو کسی وقت غافل نہ ہونے دے، اور انسانوں کو ایک ایسا روحانی سرور اور لذت و کیفیت عطا کرے کہ دنیا کی ساری دلفریبیاں اور رعنائیاں اس کے سامنے ہیچ اور بے مزہ معلوم ہوں، اس کا کوئی دن، کوئی وقت اور کوئی ساعت خدا کی محبت اور اس کے دیدار اور ملاقات کے شوق اور آخرت

---

(۱) کمالات محمدیہ،ص ۳۱۷، ۳۱۸، بحوالہ مولانا عبداللطیف صدر دینیات (عثمانیہ یونیورسٹی)

کے استحضار سے خالی نہ جائے اور یقین واعتماد، سرخوشی وسرمستی اور حضور وسرور کی ایک غیر مرئی حالت اس طرح قائم ہو کہ زندگی کی کسی ہم سے اہم مشغولیت اور بڑی سے بڑی مصروفیت میں بھی اس میں فرق نہ آئے

ناخوش آں وقتے کہ برزندہ دلاں بے عشق رفت
ضائع آں روزے کہ برمستاں بہ ہشیاری گذشت

لیکن یادرہے کہ شریعت کا دامن کسی حالت میں بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے، عالی ظرفی اور کمال یہ ہے کہ عشق ومحبت کی آگ سینہ میں سلگ رہی ہو، لیکن حدود وآداب ہر وقت ملحوظ رہیں، اور سکر ووارفتگی میں بے ادبی اور بے تکلفی کا کوئی ایسا کلمہ زبان سے نہ نکلے جو شریعت وسنت کے معیار سے فروتر ہو۔ مولانا عصمت اللہ (۱) صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"بزرگوں کی دو حالتیں ہوتی ہیں، ایک اتباع شریعت کی اور دوسری عشق ومحبت کی، بعضوں پر اتباع شریعت غالب ہوجاتا ہے اور نسبت عشقیہ مغلوب ہوجاتی ہے، اور بعضوں پر عشق ومحبت کا غلبہ ہوتا ہے اور بوجہ غلبہ حالت کے بعض احکام شریعت کا لحاظ نہیں رہتا، مگر جن بزرگوں کو خدا نے عالی ظرف اور بلند حوصلہ پیدا کیا ہے ان پر دونوں حالتیں طاری ہوتی ہیں اور وہ دونوں کو اپنے موقع اور محل پر رکھتے ہیں" مرج البحرین یلتقیان بینهما برزخ لا یبغیان."(۲)

شاہ رحمت اللہ مظفر پوریؒ نے جو مولانا کے خلفاء میں ہیں، تعلیم وتلقین کی اجازت چاہی تھی اور کچھ تعویذ وغیرہ کے متعلق دریافت کیا تھا۔ مولانا کو ان کو جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اللہ کا نام جو پوچھے بتانا چاہئے، مگر اپنی اصلاح کا خیال مقدم رہے، اگر تمام دنیا نجات پاجائے اور ہم رہ جائیں تو ہمیں کیا، ہم سا بدنصیب کون؟ ہمارے

---

(۱) مولانا عصمت اللہ صاحب بختاور گنج مؤ (اعظم گڈھ) کے رہنے والے تھے، جید عالم اور قادیانیت کے زبردست حریفوں میں ان کا شمار تھا، رد قادیانیت میں انھوں نے بڑی خدمت انجام دی۔ ایک مرتبہ تقریباً ۱ہزار مسلمان (جن کے متعلق یہ اندیشہ تھا کہ عنقریب قادیانی ہونے والے ہیں) مولانا کی سعی اور تقریر کے اثر سے اس فتنہ سے محفوظ رہے۔ مولانا محمد علی سے عقیدت ومحبت کا خاص تعلق تھا، مولانا احمد حسن کانپوری کے ارشد تلامذہ میں تھے، مدرسہ احمدیہ (آرہ) میں عرصہ تک درس دیا، نزہۃ الخواطر (جلد ہشتم) میں ان کا تذکرہ موجود ہے۔ (۲) کمالات محمدیہ ص ۲۶۷

مقدس مذہب اسلام کا اصل اصول توحید ہے، مگر یہ زبانی توحید نہیں جو اس وقت کے نا آشنا حضرات کی زبان زد ہے بلکہ وہ حالت جس سے مسلمان کے دل میں اسی ایک کی محبت کا جوش ہو، اس کی زبان پر اسی واحد کا نام ہو، اور اس کی آنکھوں میں وہی ایک سما جائے۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

اس قدر رہتا ہے مجھ کو آپ کی باتوں کا دھیان
جب کوئی بولا صدا کانوں میں آئی آپ کی

جب تک یہ حالت پیدا نہ ہو، نہ عبادت میں خلوص ہوتا ہے، نہ اس میں لطف آتا ہے، صرف ایک رسم ادا ہوتی ہے۔"

آگے لکھتے ہیں:۔

"زبان سے وظیفہ پڑھنے سے کچھ نہیں ہوتا، دل ادھر لگانا چاہئے تاکہ وہ دل میں بس جائے، ماسوا اللہ سے نکل جائے۔ تعویذ وغیرہ تو پیر و مرشد علیہ الرحمۃ نے تعلیم ہی نہیں کیا تھا بلکہ جو معلوم تھا وہ بھی بھلا دیا۔ ہاں یہ فرمایا کہ زبان میں وہ بات پیدا کرو کہ وہ تعویذ ہو جائے"۔

خط کو الفاظ پر ختم کرتے ہیں:۔

"مجھے شاہ اور ناظم (۱) نہ لکھا کیجیے، گدا کو شاہ کہنا شاہوں کے ساتھ بے ادبی اور اس گدائی کی ہنسی ہے۔" (۲)

وحدت وجود کے متعلق مولانا کا اہم مکتوب

وحدت وجود تصوف کا ایک ایک معرکۃ الآراء مسئلہ ہے، اور اس پر اس قدر لکھا جاچکا ہے کہ اس کا احاطہ مشکل ہے، لیکن اس کا بیشتر حصہ اس قابل نہیں ہے کہ عام مسلمانوں کے ہاتھوں میں دیا جائے، اور وہ اس کو سمجھ سکیں اور مستفید ہوسکیں، مسئلہ کی نزاکت و وسعت اور معانی کی گہرائی کی وجہ سے اس کا سمجھنا ہر کس و ناکس کے لئے بے حد

---

(۱) یہ ۱۳۲۱ھ کی بات ہے، مولانا حال ہی میں ندوہ سے مستعفی ہوئے تھے، اور مونگیر میں قیام تھا، اس لئے بعض لوگ اس وقت تک خطوط میں مولانا کو ناظم لکھتے تھے۔ (۲) کمالات محمدیہ: ۲۶۷

دشوار ہے، اور نہ اس پر تکمیل دین کا انحصار ہے۔ مولانا بھی اس بات کے قائل نہ تھے کہ اس کی عام طور پر تبلیغ و اشاعت کی جائے، اور ہر سالک اور طالب حق کے سامنے اس کو ضرور بیان کیا جائے۔ لیکن مصنف مقامات محمد یہ کے ایک سوال کے جواب میں مولانا نے اس اہم نازک اور پیچیدہ مسئلہ کی تشریح کی، کہ نہ اس کا شریعت کے اصولوں اور احکام اور مقاصد سے کوئی تضاد باقی رہا، نہ اس کو صحیح طور پر سمجھنا دشوار۔ مکاتیب محمد یہ حصہ دوم کا پہلا مکتوب اسی بیان میں ہے، مولانا لکھتے ہیں:۔

''تم وحدت وجود اور وحدت شہود کی نسبت دریافت کرتے رہو کہ کون حق ہے اور دونوں کا حاصل کیا ہے۔ اور تو یہ جان لو کہ یہ ان عقائد ضروریہ میں نہیں ہے جس کا جاننا اور ماننا ہر مسلمان پر ضرور ہو، یہ مسئلہ اس قدر نازک ہے اور علماء اور عرفاء کی عقل حیران ہے، پھر عوام کا کیا ذکر ہے۔''

اب وحدت وجود کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''صوفیہ کی اصطلاح میں وجود مطلق خدا تعالیٰ کو کہتے ہیں اور وجود کے معنی ''موجود'' ہیں، اس لئے وجود کا حاصل یہ ہوا کہ موجود صرف ایک ذات ہے اور دوسرے عالم اور اس میں جس قدر نیرنگیاں ہیں وہ اس کے وجود کے اطوار اور اس کی شانیں (حالتیں) ہیں، جس طرح دریا میں لہریں اور موجیں طرح طرح کی اٹھتی ہیں، کسی وقت اس دریا کی سطح پر حباب جسے بلبلہ کہتے ہیں، کثرت سے نظر آتے ہیں، کسی وقت دریا کا پانی سردی سے جم کر یخ ہو جاتا ہے اور چمکتی ہوئی چٹانیں دکھائی دیتی ہیں، مگر حقیقت میں اسی دریا کا پانی ہے، جو طرح طرح کی شانوں (حالتوں) میں نظر آتا ہے۔ مگر دریا ایک متناہی چیز ہے، اس کی مختلف حالتیں کتنی ہی ہوں متناہی ہوں گی، اور اس ذات بیچوں کی ذات غیر متناہی ہے اس کی کچھ انتہا نہیں، ہمیشہ ہر وقت میں ازل سے لے ابد تک بے شمار طوار سے اس کی شانوں کا ظہور ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا، اور اس کی مرضی کے مطابق نئے نئے رنگ سے اس کی جلوہ گری ہوتی ہے۔ کل یوم ہو فی شان فی کا یہی مطلب ہے، اب یہاں نازک بات یہ ہے کہ جس طرح اس موج یا حباب کو دریا نہیں کہتے اور

دریا میں جو عظمت وشان ہے اور جو اس کی قدرت ہے وہ اس موج وغیرہ میں نہیں ہے، اسی طرح بے چون وبچگوں کی شانوں کو خدا نہیں کہہ سکتے۔ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:۔ ''عارف خدارا عین ہمہ واندوہ ہمہ بنید بے آنکہ، ہیچ یکے را خدا گوید، وخدا ورائے ہمہ باید، بے آنکہ دوئی درمیان آید، عارف ہمہ ضد درضد است وحیرت درحیرت۔''

لیکن مولانا کہتے ہیں کہ:۔ ''یہ وہ حالت اور علم ہے کہ موسیٰ کلیم اللہ کو جب یہ حالت پیش آئی تو ان کی زبان بھی بند ہوگئی اور سینہ گھٹنے لگا''۔ ویضیق صدری ولا ینطلق لسانی کی تفسیر کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

''جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ فرعون کے پاس جاؤ اور میری توحید اور میری عظمت وکبریائی اس سے بیان کرو، حضرت موسیٰ علیہ السلام جمال ذات کے مشاہدہ میں متحیر اور مستغرق تھے، عرض کیا کہ تیرے جمال وجلال شاہدہ میں نہ دل قابو میں ہے، نہ زبان چلتی ہے، پھر فرعون سے جاکر کیونکر یزی عظمت وشان بیان کروں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قول کا یہ مطلب اہل تصوف بیان کرتے ہیں اور اس کا لطف وہی اٹھا سکتے ہیں جن کو فضل خداوری نے مرتبۂ احسان تک پہونچایا ہے اور واعبد رک کان تراہ کرنے والے ہیں۔ مفسرین نے جو ظاہری معنی بیا کئے ہیں وہ بھی صحیح ہیں قرآن مجید میں ظاہری اور باطنی معنی ہونا حدیث سے ثابت ہے۔''

خط کے آخر میں لکھتے ہیں:۔

''جب بندہ اس ذات الٰہی اور اس کی صفات کی ماہیت سے ناواقف ہے اور عقل اس کے ادراک سے عاجز ہے، اب جس نے کچھ کہا اپنے علم اور اپنی حالت کے بموجب کہا۔ اے عزیز! جب اس بات میں کلام خدا اور اس کے رسول کے کلام سے فیصلہ نہ ہوا، تو معلوم ہوا کہ مشیت الٰہی نے اس کا فیصلہ نہ چاہا، اس لئے کہ ہماری عقل سے باہر بات تھی، یا جس وجہ سے ہو، اس کے فیصلہ کے درپے ہونا اپنے اوقات عزیز کو ضائع کرنا ہے اپنا کام کرنا چاہئے، پھر اس کی طرف

سے اس پر جو منکشف ہوا سے ماننا چاہئے اور دوسرے کو معذور سمجھنا چاہئے اور اگر اصحاب حال میں ہے تو اسے سکوت کرنا چاہئے۔"(۱)

مشاہدۂ ذات وصفات اصل ہے نہ کہ کشف وکرامت

مولانا نے اپنے ایک مفصل مکتوب میں مجدد صاحبؒ کے بعض معترضین کے جواب میں لکھا ہے کہ:۔ اس اعتراض کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ مجدد صاحبؒ سنت وشریعت کے بے حد پابند تھے اور اسی کو اصل سرمایہ سمجھتے تھے، اس لئے ان کا یہ طریقہ اور مسلک ان لوگوں کو پسند نہ آیا جو انوار سنت سے ناواقف اور رموز شریعت سے ناآشنا ہیں، وہ کہتے ہیں کہ:۔ ایسے مجدد (یعنی مجدد الف ثانیؒ کی تصریح اگرچہ ہمارے علم میں نہیں پائی جاتی ہے مگر کسی حدیث کے خلاف بھی نہیں ہے۔ حدیث میں یہ ہے کہ ہر صدی کے شروع میں مجدد ہوگا، آپ کی پیدائش دسویں صدی کی ہے اور گیارہویں صدی کے شروع میں آپ کے فیضان کا نشو ونما ہوا جو زمانہ الف ثانی کی ابتدا کا ہے، اس لئے جس طرح آپ کو گیارہویں صدی کا مجدد کہہ سکتے ہیں اسی طرح دوسرے ہزار کا بھی مجدد کہہ سکتے ہیں، کوئی لقب حدیث کا مخالف نہیں ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ تارکین دنیا نے دل کو یکسو کرنے کے جو طریقے نکالے ہیں ان میں بہت کچھ اثر ہے اور ان کی مشق سے لذت وسرور بھی اس قدر ملتا ہے کہ دنیا کی کسی شے میں وہ لذت نہیں ہے، کسی کو غائبانہ چیزوں اور پوشیدہ حالتوں کا علم ہونے لگتا ہے کسی کو انوار کثرت سے نظر آتے ہیں، ان کا مقصد لطف اٹھانا، عجائبات دیکھنا اور کرشمے دکھانا ہوتا ہے، اس میں وہ ایسا گرفتار ہوتے ہیں کہ مشاہدۂ ذات وصفات اور جمال وجلال تک ان کی رسائی ہی نہیں ہوتی، وہ اصل دولت سے محروم رہتے ہیں اور اپنے حال میں مست، لیکن اولیاء اللہ کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے، ان کا مقصد کشف وکرامات نہیں، بلکہ مشاہدۂ ذات وصفات ہوتا ہے بلکہ وہ اس لطف سے اور اس کشف وکرامات اور عجائبات سے متنفر ہوتے ہیں اور بعض اوقات اس کو اپنی ترقی اور حصول مقصد کی راہ میں ایک 'رکاوٹ' سمجھتے ہیں۔

"ان کا اصلی مقصد یہ ہوتا ہے کہ قلب میں اللہ کی یاد اور خیال کے سوا کچھ نہ رہے، اور شریعت کے احکام مثل طبعی ضرورتوں کے ہو جائیں، یہ حضرات اس لطف سے اور کشف وکرامت اور عجائبات سے متنفر ہو جاتے ہیں، اور اس ذات بیچوں وبچگوں اور بے کیف وکم کے مشاہدہ میں ڈوبے رہتے ہیں اور سرکار ذو الجلال کی عظمت وشان ان کے دلوں میں ایسی سما جاتی ہے کہ "إذا ذكر الله وجلت قلوبهم" کے مصداق ہوتے ہیں، یعنی جب انکے روبرو اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل تھرا جاتے ہیں، انہیں میں زیادہ عالی مرتبت وہ ہیں جن کی نسبت اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔ "رجال لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله" یعنی ایسے مرد ہیں کہ تجارت (دنیا کا کاروبار) خرید وفروخت انہیں اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔ "دل بہ یار دست بکار" انکی حالت ہوتی ہے، سبحان اللہ عجب معاملہ ہے کہ دل میں تو جوش محبت خداوندی نے کسی کی جگہ نہ چھوڑی، مگر ظاہر میں سب کچھ کر رہے ہیں، صحابہؓ کی یہی شان تھی اور ان کے طفیل سے حضرات نقشبندیہ مجددیہ کے کاملین میں بھی ایسا دیکھا گیا، ان کی حالت قدرتی طور پر لوگوں کے دلوں کو کھینچتی ہے، یہاں مسمریزم اور تسخیر جھک مارتی ہے، جو اس حالت میں اثر ہے وہ اس میں ہرگز نہیں کہ بغیر قصد وارادہ اور بلا کچھ کئے دل کھنچے جاتے ہیں، خصوصاً جب غلبۂ حالت کے وقت ان کے روبرو کوئی آجاتا ہے تو اس کا دل بیتاب ہو ہی جاتا ہے"۔(۱)

انوار ومکاشفات کی مثال

مولاناؒ نے اپنے خطوط میں اس بات کو کھول کھول کر بیان کیا ہے کہ سالک کو ہر وقت ہوشیار اور بیدار رہنا چاہیے کہیں ایسا نہ ہو کہ انوار ومکاشفات اور عجائبات وغیرہ میں پڑ کر وہ اصل مقصد سے غافل ہو جائے۔ مجدد صاحبؒ نے بھی اپنے ایک مکتوب میں جوش میں آکر یہ لکھا ہے کہ:۔

"اگر انوار ومکاشفات وغیبی احوال ہی مقصود ہیں تو اس دنیا میں قدرت خداوندی کی نیرنگیاں اور حسن فطرت کے مناظر آخر کیا کم تھے"۔

مولانا کہتے ہیں کہ:۔

"ان تجلیات وانوار کی حیثیت ایسی ہے کہ جس طرح ظاہری مسافر کو راستہ

---

(۱) مکاتیب محمدیہ (حصہ اول): ص ۳۷

میں طرح طرح کی چیزیں اور طرح طرح کے مناظر نظر آتے ہیں لیکن وہ ان کی طرف توجہ کیے بغیر یا ایک اچٹتی نگاہ ڈال کر اپنی منزل مقصود کے خیال میں مستغرق رہتا ہے، اسی طرح راہ سلوک کے مسافروں کو دوران سلوک میں مختلف قسم کی تجلیات نظر آتی ہیں جو کبھی انعام کے طور پر ہوتی ہیں اور کبھی امتحان کے طور پر!"

اپنے ایک مسترشد کو اس بات سے آگاہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"جس طرح ظاہری مسافر کسی مقام کو جاتا ہے تو راہ میں بہت سے عجائب اور غرائب بھی دیکھتا ہے، کہیں چمن ہے، کہیں سبزہ ہے، کہیں پہاڑ ہے، کہیں نفیس عمارت ہے، کسی مقام پر ناچ رنگ ہے، کہیں راگ باجا ہے، غرض کہ انواع واقسام کے تماشے دیکھنے اور سننے میں آتے ہیں، اب اگر کسی کھیل وتماشہ کی طرف اس نے توجہ نہ کی اور کسی پہاڑ، چمن اور لہلہاتے سبزہ زار پر اس نے نظر ڈالی اور سیدھے راستہ پر چلا گیا تو منزل مقصود پر جلد پہونچے گا، اور اگر کسی طرف متوجہ ہو گیا تو خدا حافظ ہے، یا تو اس میں پھنس کر رہ گیا اور نہ پھنسا تو اس کی دیکھ بھال میں دیر تو ضرور لگے گی، اسی پر سالک راہ باطن کو قیاس کرنا چاہئے، اس راہ میں بھی حسب استعداد سالک کو عجائب وغرائب دیکھنے اور سننے میں آتے ہیں، انمیں سے بعض رحمانی اور بعض شیطانی ہوتے ہیں، کسی کو نہایت خوش آیند نغمہ وسرور کی آواز آنے لگتی ہے، کوئی خواب وبیداری میں انوار دیکھتا ہے، اور کسی کو امور غائبانہ اور واقعات آئندہ کا کشف ہونے لگتا ہے، کسی کو روحانیت سے زیادہ علاقہ ہو جاتا ہے، وہ اکثر ارواح طیبہ سے ملا کرتا ہے، بہر حال وہ سب غیر مطلوب ہیں، سالک کو ان پر نظر نہ چاہئے"۔(۱)

ذکر کی بے اثری اور برے خیالات کی ایک بڑی وجہ

مولانا ایک مکتوب میں اس بات کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ بہت سے لوگ ذکر کرتے ہیں لیکن یہ فکر نہیں کرتے کہ دوسری طرف وہ ایسے کاموں میں مشغول ہیں یا ایسی

(۱) کمالات محمدیہ:۲۲۶

صحبت میں گرفتار ہیں جس کی وجہ سے قلب ذکر کا پورا اثر قبول نہیں کرتا، اور اگر کچھ اثر ہوتا ہے تو جلد زائل ہو جاتا ہے اس کے اسباب زیادہ تر تین ہوتے ہیں، کسی گناہ کا ارتکاب، صحبت کی خرابی، مشتبہ مال۔

وہ کہتے ہیں کہ طلب خدا اور وصول الی اللہ نہایت مشکل چیز ہے، اس کو آسان سمجھ کر سہل انگاری اور غفلت سے کام لینا سخت غلطی اور نادانی ہے:۔

> ''طلب خدا اور وصول الی اللہ نہایت مشکل چیز ہے، دنیا میں کوئی شے ایسی مشکل نہیں، ہاں جس پر اللہ تعالیٰ آسان کر دے، اگر کسی گدا کے گھر میں بادشاہ چلا آئے تو یہ بادشاہ کی بندہ نوازی و سرفرازی ہے بغیر اس کے اگر وہ گدا اپنی خواہش اور اپنی سعی سے اپنے گھر میں لانا چاہے تو عقل میں نہیں آتا، بہت ہی دشوار معلوم ہوتا ہے'':۔

اس کے بعد لکھتے ہیں:۔

> ''ذکر میں یا کسی عبادت میں لذت کا نہ ہونا اور وسوسوں کا زیادہ آنا اس کے بہت اسباب ہیں (جس میں ایک) صحبت ناجنس (۱) ہے، اب تمام دن تو ناجنسوں کی صحبت میں رہا ہے جس سے قلب میں تاریکی اور نجاست آ گئی ہے، پھر وہ تھوڑی یاد (ذکر) سے کیونکر جاتی رہے، اور اگر کچھ زائل ہوئی تو کل پھر وہی صحبت ناجنس موجود ہے، جو کیف آج آیا تھا وہ کل کی صحبت نے زائل کر دیا، قلب اللہ نے مختلف بنائے ہیں، بعض ایسے شقی القلب ہوتے ہیں کہ ان کی صحبت، ان کے پاس سے گزر جانا، طالب کے قلب کو ایسا خراب کر دیتا ہے کہ عرصہ کی محنت برباد ہو جاتی ہے، طالب کو چاہئے کہ اس کا خیال رکھے کہ جس کی صحبت سے اس کا قلب زیادہ منتشر ہو اس سے جہاں تک ہو سکے بچے، اور اس کی شناخت اس طرح کرے کہ جس روز ذکر میں زیادہ بے لطفی ہو تو غور کرے کہ اس کا سبب کیا ہے، آج

---

(۱) بازاروں میں ضرورت سے زائد آمد و رفت، زیادہ ہنسی مزاق، غیبت و نکتہ چینی اور بلا کسی وقفہ کے (جس میں دل خدا کی طرف متوجہ ہو سکے اور آخرت کا خیال آئے) طویل دنیاوی بحثیں اور گفتگوئیں راقم سطور کے نزدیک صحبت ناجنس میں آئیں گی۔

میں کس کے پاس بیٹھا ہوں، میں نے آج کیا کیا ہے، کیسا کھانا کھایا ہے، کوئی گناہ تو نہیں کیا ہے، کھانا مال حرام سے یا مشتبہ مال سے نہیں تھا، خوب غور کے بعد جو معلوم ہو اس سے پرہیز کرے اور اس وقت نہایت عاجزی سے خدا کی طرف متوجہ ہو کر توبہ کرے اور عہد کرے کہ پھر ایسا نہ کروں گا، اگر ایسا کرو گے تو ضرور ذکر میں لذت آنے لگے گی اور بغیر توبہ ذکر کی لذت کا خواہاں ہونا نادانی ہے۔‘‘(۱)

جو نعمت ناشکری کی وجہ سے چھین لی جاتی ہے پھر ملتی نہیں

ایک خط میں مولانا لکھتے ہیں کہ اس حالت کے حصول کے بعد ادنیٰ ناقدری اور زبان یا عمل سے اظہار ناشکری ساری ترقی کو خاک میں ملا سکتی ہے، اور جو نعمت ناشکری کی وجہ سے چھین لی جاتی ہے پھر نہیں ملتی، اس حالت اور کیفیت کی حفاظت سے ذرا سی غفلت بھی سم قاتل ہے، اور اس کا نتیجہ حرمان نعمت اور قہر منعم ہے:۔

’’قلب پر اگر خدا کے فضل کی بارش ہو اور عمدہ جذبات اور واردات اس طرف سے آئیں تو اس کی قدر اور حفاظت ضرور ہے، ورنہ نعمت عظمیٰ کی ناشکری ہوگی جس کا نتیجہ حرمان نعمت اور قہر منعم ہے، اور جو نعمت ناشکری کی وجہ سے چھین لی جاتی ہے پھر نہیں ملتی ہزار سر پٹکے، بہت ہوشیار رہنا چاہئے، حفاظت یہ ہے کہ جن اعمال کی وجہ سے وہ نعمت ملی ہے اس پر استمرار اور دوام شکر و عجز کے ساتھ اس کے منافیات سے اجتناب رکھے۔‘‘(۲)

ذکر کی لذت سے بڑھ کر دنیا میں کوئی لذت نہیں!

مولانا غلام محمد صاحب ہوشیار پوری کو ذکر کی اہمیت بتاتے ہوئے ایک خط کے آخر میں یہ الفاظ لکھتے ہیں:۔

’’مولانا ان باتوں کو دل میں جگہ دیجئے اور خوب غور کر کے اس پر عمل کیجئے اللہ کی یاد اور اس کی عبادت میں وہ لذت و کیفیت ہے کہ دنیا کی کوئی لذت اس کے عشر عشیر کو نہیں پہونچتی، اللہ کی یاد سے قلب کو ایسا اطمینان ہو جاتا ہے کہ کسی امیر

---

(۱) کمالات محمدیہ، ص ۲۳۱ (۲) مکاتیب محمدیہ (حصہ دوم) ص، ۷۱

ونواب وبادشاہ کونہیں ہوسکتا''الا بذکر اللہ تطمئن القلوب'' ارشادِ خداوندی ہے، اہلِ علم سے نہایت تعجب ہے کہ اطمینانِ قلب اور راحت کے لئے دنیا کے اسباب میں پریشان ہوتے ہیں اور ارشادِ خداوندی پر نظر نہیں کرتے، زیادہ لکھنا فضول ہے، میں نے غالباً زبانی بھی کہا تھا کہ پہلے اسم ذات کی مشق کرنا چاہیے، یہاں تک کہ ہر رگ وپے سے یاد ہونے لگے اور اس کی یاد سے تمام جسم زبان بن جائے، مولانا طالب کی جب یہ حالت ہوتی ہے، اور خود بخود تمام جسم سے ذکر ہونے لگتا ہے تو اس قدر کیفیت ملتی ہے جس کی حد وانتہا نہیں، اور بے اختیار اس کی زبان سے یہ جاری ہوتا ہے ؂

بادشاہی سے تو بہتر ہے گدائی تیری (۱)

ایک اعتراض کا جواب

بعض ملحدین اور بے دین اور ان کے فریب میں آئے ہوئے بعض مخلص مسلمانوں کے دلوں میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ خود ہی کفر وایمان کا خالق ہے اور اس نے کسی کو ہدایت کی ہے اور کسی کے لئے جہنم کا فیصلہ فرمایا ہے تو اس نے گناہ پر وعید اور نیکی پر وعدہ کیوں کیا ہے اور اس میں کون سی مصلحت ہے۔ مولانا نے اس کی مثال دے کر یہ بتایا ہے کہ اس اعتراض کی اساس ہی غلط ہے۔ ایک معترض کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

''پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ عالم میں جو کچھ موجود ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ملک ہے، وہ مالک اور انسان مملوک ہے۔ یہ بات ہر شخص سمجھتا ہے کہ مالک کو اپنے ملک میں ہر طرح کا تصرف جائز ہے، مملوک کو یہ حق نہیں ہے کہ مالک کے کسی طرح کے تسلط کو خلافِ عدل کہے۔''

اس کے بعد اس کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں:۔

''بعض کے پاس گائے، بیل، بکری، بکرے بہت ہوتے ہیں، ان میں کسی کو فروخت کر دیتا ہے، کسی کو پرورش کرتا ہے، اور خوب کھلا کر اسے موٹا کرتا ہے اور

(۱) کمالاتِ محمدیہ، ص ۵۰

صرف اس کا دیکھنا اس کو پسند ہوتا ہے، کسی کا دودھ پیتا ہے، کسی کو ذبح کر کے کھا جاتا ہے، کسی پر بوجھ لادتا ہے غرض کہ وہ مالک ان جانوروں سے مختلف طور کا برتاؤ کرتا ہے کہ بعض بظاہر ان کے لئے اچھے ہیں اور بعض برے ہیں، مگر کیا ان جانوروں کو یہ حق ہے کہ ناانصافی کا الزام اپنے مالک کو دیں"۔(۱)

مقصود لذت وکیفیت نہیں بلکہ رضائے الٰہی ہے

ایک صاحب نے مولانا کی خدمت میں حاضری کا اشتیاق ظاہر کیا تھا، اور تجارت وکاروبار سے بے رغبتی کا اظہار کیا تھا۔ مولانا ان کو لکھتے ہیں:۔

"یہ ضرور ہے کہ ذکر وغیرہ میں جو لذت وکیفیت ہے وہ تجارت وغیرہ میں نہیں، حالانکہ تجارت کی مدح میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں، اور امانت دار تاجر کو بشارت بھی دی گئی ہے، لیکن طالب کا مقصود رضائے الٰہی ہونا چاہئے نہ کہ لذت وکیفیت۔"

ایک جگہ مولانا نے اس کا بھی اظہار کیا ہے کہ بعض وقت یہ لذت وکیفیت سالک کے لئے حجاب بن جاتی ہے، اور اس کی مزید ترقیات رک جاتی ہیں، تجارت کی فضیلت بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"جب تجارت کی یہ فضیلت ہے، پھر طالب خدا کو اس میں کیا عذر ہو سکتا ہے، البتہ اس راہ میں وہ لذت وکیفیت نہیں یا بہت دشوار ہے، جو حضرات صوفیہ کے شغل میں ہے، مگر طالب کو اللہ کی رضامندی ہی مقصود ہونا چاہئے۔ نہ کسی کی لذت وکیفیت، اس لئے طالب خدا کو چاہئے کہ جو طریقہ اس سے ہو سکے اور خدا اور رسولؐ سے اس طریقے میں خدا کی رضامندی ثابت ہو، اسے اختیار کرے۔"(۲)

مولانا کہتے ہیں کہ وصال وکمال اصل نہیں "رضائے دوست" اصل ہے، اگر دوست کی رضا ہجر میں ہے تو ہجر ہی وصال ہے۔ مایوس ہونا اور اپنے کئے کو کم سمجھنا سب سے بڑی غلطی ہے اور محبت کی کمی کی نشانی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

---

(۱) مکاتیب محمدیہ (حصہ دوم)۔(۲) ایضاً:۵۱

''یہ خیال کہ ہم اس قدر درود شریف پڑھتے ہیں یا ایسی حالت رہتی ہے اور پھر زیارت سے محروم ہیں۔ اس سے دو باتیں مترشح ہوتی ہیں:۔ ایک یہ کہ اس قدر پڑھنے کو کوئی چیز سمجھنا، دوسرے مایوس ہونا، یہ دونوں باتیں کم فہمی اور غلبۂ محبت کی کمی نشانی ہیں، سچے محبوں کی یہ حالت ہوتی ہے جو اس شعر سے ظاہر ہو رہی ہے ؎

ہجر یکہ بود رضائے دلبر
از وصل ہزار بار خوشتر

ہماری بندگی اور اطاعت کا یہ تقاضا ہونا چاہئے کہ اپنی اطاعت اور فرماں برداری کا خیال بھی دل میں نہ ہو، ہر وقت اپنے کو قصور وار سمجھے، اور دل میں قلق ہو کہ ہم سے کچھ نہیں ہو سکتا، اپنے کئے کو کچھ سمجھنا بڑی غلطی ہے، وہ ذات مقدس جو ہمارے وہم و خیال سے برتر ہے، اس کے حبیب ﷺ کی کیا شان ہوگی؟۔ اس کو سمجھ کر یہ خیال کرنا چاہئے کہ ہماری کیا ہستی ہے، اور ہمارے عمل کیا چیز ہیں جو اس سرکار میں پسندیدہ ہوں، اور اس کی وجہ سے ہم پر بندہ نوازی ہو، اور یوں بھی خیال کرنا چاہئے کہ بزرگوں نے پچیس پچیس ہزار مرتبہ درود شریف پڑھا ہے، روتے روتے رخساوں پر داغ ہو گئے ہیں، پھر ہمارے ہزار دو ہزار کی کیا مقدار ہے، اس ادنیٰ مقدار پر، اور کسی وقت آنسو نکل آنے پر کیا خیال کریں، کمسنی میں جب اس فقیر کو زیارت کا شوق ہوا تو تنہا بیٹھ کر گھڑیوں روتا تھا اور جس نے جو وظیفہ بتا دیا وہ پڑھتا تھا اور برسوں یہی حال رہا مگر کسی وقت مایوسی نہیں ہوئی، جب سرکار کی بندہ نوازی ہوئی تو بہت کچھ ہوئی، پھر اس کے بعد محرومی ہوئی جب تک شومیٔ بخت ہوئی یا سرکار کو شوق کا زیادہ کرنا اور سچی محبت کا امتحان منظور ہوا مگر الحمد للہ کبھی مایوسی نہیں ہوئی، بلکہ شوق بڑھتا ہی رہا'' (۱)

وظیفہ کی کمیت نہیں، کیفیت درکار ہے

مولانا نے جابجا اپنے مکتوبات و ارشادات میں اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ وظائف اوراد کی کثرت کی اتنی ضرورت نہیں جتنی ضرورت اس بات کی ہے کہ دل کو ماسوی اللہ سے پاک کیا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ وظیفہ کی کثرت زیادہ قابل اعتبار نہیں، بلکہ وہ

---

(۱) مکتوبات (جلد دوم) ص، ٦٧ و ٦٨

کیفیت توجہ کے قابل ہے جو وظیفہ کی روح اور اس کی اصل قیمت ہے، اس لئے دنیا کے کاموں میں مشغول رہنے کے ساتھ اس کی کوشش کرنا چاہئے کہ خدا سے تعلق اور نسبت کسی وقت منقطع نہ ہو، اور دل ہر وقت اس کی یاد سے معمور ہو، اور اس کے لئے ہر قربانی اور ایثار آسان اور خوشگوار ہو جائے۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

''بہت زیادہ وظیفہ پڑھنا مفید نہیں ہے، بلکہ اس میں کوشش کرنا چاہئے کہ دل میں اللہ پاک کی محبت بس جائے، دنیا کی کسی چیز کی وقعت قلب میں نہ رہے، جو کام کرے اللہ پاک کے لئے کرے، ایسی حالت پیدا ہو کہ اللہ کے لئے جان و مال نثار کرنا آسان ہو جس کے دل میں اللہ کی محبت بس جاتی ہے اس کو جان و مال نثار کرنا فقط آسان نہیں ہوتا بلکہ اس قدر مسرت ہوتی ہے کہ اس کا بیان نہیں ہو سکتا۔'' (۱)

ترک دنیا نہیں، اصلاح دنیا

مولانا یہ سمجھتے تھے کہ اسلام کا مطالبہ یہ نہیں کہ دنیا کو ترک کر دیا جائے، بلکہ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ اس کی اصلاح کر کے اس کو آخرت کی تیاری کے لئے استعمال کیا جائے۔
اپنے مخصوص احباب کو مولانا نے چند نصیحتیں کی تھیں، ان میں سے ایک بات یہ تھی:۔

''اے عزیزو! میں یہ نہیں کہتا کہ ہر ایک تارک الدنیا ہو کر مسجد میں بیٹھ جائے، بلکہ یہ کہتا ہوں کہ اس پر عمل کرو "اصلحوا دنیاکم واعملوا آخرتکم" یعنی اپنی دنیا کی اصلاح کرو اور آخرت کے لئے عمل کرو، دنیا کے کمانے میں اللہ کا خیال رہے یعنی دنیا اس طرح کماؤ کہ جس سے اللہ بھی راضی رہے، یعنی حلال طریقہ سے کماؤ اور اس میں اللہ کے حقوق کا خیال رکھو، اور پھر حقوق العباد کا اس سے بھی زیادہ خیال رہے، کیونکہ اللہ بے نیاز ہے، اسے تمہاری پرواہ نہیں، اور بندے محتاج ہیں، اس لئے حقوق العباد کا خیال بہت ہی ضروری ہے، ورنہ اس کی معافی مشکل ہے۔'' (۲)

''حجاب'' بھی عنایت ہے

سالک کی زندگی میں کبھی کبھی ایسے وقفے آتے ہیں کہ اس کے اور خدا کے درمیان

(۱) مکتوبات (جلد دوم) ص ۶۷، ۶۸ (۲) ایضاً ۷۵

ایک حجاب سا معلوم ہوتا ہے اور ایسا نظر آتا ہے کہ اس کی ''نظر کرم'' متوجہ نہیں ہے، سالک کے لئے یہ ایک زبردست امتحان اور آزمائش کا وقت ہے۔ مولانا کہتے ہیں کہ اس حجاب کو ہمیشہ حجاب ہی نہ سمجھنا چاہئے، کبھی کبھی یہ شوق کو بڑھانے کے لئے اور طالب کو تڑپانے کے لئے بھی ہوتا ہے۔ اپنے ایک مخصوص ارادت مند اور مسترشد کو ایک خط میں یہ الفاظ لکھتے ہیں:۔

''خوب یاد رکھو کہ طالب کبھی محروم نہیں رہتا اور کچھ دنوں حجاب میں رہ کر شوق کو بڑھانا اور اس کو تڑپانا بڑی عنایت ہے، اور انجام ظاہر ہے''۔

کششیکہ کہ عشق دار دنگذاردت بدینساں
بجنازہ گر نیائی بمزار خواہی آمد(۱)

ارشاد رحمانی

مولانا کی مختصر لیکن اہم تصانیف ''ارشاد رحمانی'' ہے جو سلوک و آداب طریقت کے موضوع پر ہے، اور اس میں آج بھی تاثیر باقی ہے کہ پڑھنے والے کا دل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا اور اس کے قلب پر مصنف کے اخلاص وللّٰہیت کا عکس پڑتا نظر آتا ہے، یہ کتاب کا سب سے بڑا اور بنیادی وصف ہے۔

اس کتاب میں مولانا نے مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کے حوالہ سے ایک جگہ چند اشعار لکھے ہیں اور لکھا ہے کہ مولانا فرماتے تھے کہ:۔

''ان اشعار کو درد و سوز کے ساتھ پڑھنے سے روحانی بالیدگی، صفائی باطن اور سرور و کیف حاصل ہوتا ہے''۔

تقریباً یہی بات مولانا کی اس تصنیف کے متعلق بھی کہی جاسکتی ہے، اس کے مطالعہ سے بھی قلب میں ایک قسم کا سوز و گداز، روحانی سرور اور باطنی اطمینان حاصل ہوتا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم تھوڑی دیر کے لئے ایک نئی فضا اور نئے عالم میں پہونچ گئے ہیں اور ہمارے قلب کی حالت خاصی بدل گئی ہے، اس میں گناہ سے نفرت اور نیکی کی رغبت پیدا ہوگئی ہے، اور اللہ تعالیٰ سے ایک قسم کی نسبت کا احساس ہونے لگا ہے، یہ فائدہ اور تاثر

خواہ کتنا عارضی اور محدود کیوں نہ ہو، بہت قیمتی ہے، اور اگر یہ حالت چند لمحات کے لئے بھی پیدا ہو جاتی ہے تو وہ ہماری زندگی کا سب سے بیش قیمت اور کار آمد حصہ ہے، اور بہت قدر اور حفاظت کے قابل ہے۔

یہ کتاب مولانا نے مولانا فضل رحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے کئی سال قبل لکھی تھی، مولانا فضل رحمٰن صاحبؒ نے نے اس کو پورا ملاحظہ فرمایا، اور اس پر عبارت لکھی: ''یا الٰہی ازیں رسالہ مومناں را نفع شود:۔ حرره فضل رحمن غفره الله تعالى ولآبائه وأبنائه و مريدية.

کتاب دراصل مولانا فضل رحمٰن کے ملفوظات وارشادات پر مشتمل ہے لیکن اس میں خود مصنف کے ابتدائی حالات اور کیفیات کا بھی ذکر ہے اور دوسرے متعدد فوائد ہیں، کتاب کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس کے ۱۷یا ۱۸ ایڈیشن شائع ہوئے، اور بکثرت لوگوں کو اس سے روحانی فائدہ ہوا، اور یہ کتاب ان کے ایمان ویقین میں ترقی کا باعث ہوئی، مولانا فضل رحمٰنؒ کے حجرے کے طاق میں یہ کتاب برابر رہتی تھی۔

کتاب میں لطائف واذکار کا بھی بیان ہے لیکن اس انداز میں کہ ایک مبتدی اور عام آدمی کی طبیعت بھی اس سے متوحش نہیں ہوتی، اور نہ کسی موقع پر بلاضرورت اصرار اور بیجا تشدد کا احساس ہوتا ہے۔

مولانا فضل رحمٰنؒ کے ہاں بھی تسہیل اور طالب قوت واستعداد کا بڑا خیال واہتمام تھا۔ مولانا محمدؒ کو سوء تنفس کی وجہ سے ذکر واثبات میں کچھ دشواری ہوتی تھی۔ مولانا سے حال عرض کیا، تو مولاناؒ نے فرمایا کہ:۔

''زیادہ نہیں تو تین ہی بار کر لیا کرو، اگر بیٹھا نہ جائے تو لیٹے لیٹے سہی''۔

مولانا یہ لکھ کر فرماتے ہیں:۔

''سبحان اللہ کیا تسہیل ہے، یہ بھی اتباع سنت ہے کہ کیونکہ الدين يسر حدیث نبویؐ ہے۔ حضرات نقشبندیہ نے لکھا ہے کہ ذکر نفی واثبات تین سو مرتبہ سے کم نہ ہونا چاہئے مگر حضرت قبلہؒ نہ مجھ سے کسی مقدار کی تعین فرمائی اور نہ کسی اور

طالب کو دیکھا گیا، اس کی وجہ بھی تسہیل ہے۔‘‘(۱)

ذکر کے ایک بڑے فائدہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے مولانا اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:۔

’’اگر ماسوا خدا کے کسی سے دل کو تعلق ہو جائے، یا کوئی بری عادت دل میں جگہ پکڑ جائے تو ذکر نفی و اثبات میں اسی شے کی نفی کرے۔ مثلاً کسی کو مال کی محبت ہے تو اس کے دور ہونے کے لئے لاالہٰ کہتے وقت یہ خیال کرے کہ اللہ کی محبت میرے قلب میں ہے، اسی طرح جو مانع پیش آوے اس کو اسی طرح رفع کرے اور جب تک وہ رفع نہ ہو اسی طریقہ کو کئے جائے، بفضلہٖ تعالیٰ وہ مانع دور ہو جائے گا، خوب تجربہ ہوا ہے۔‘‘(۲)

حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ بھی تصور شیخ کی تعلیم نہیں دیتے تھے، لیکن کہتے تھے کہ:۔

’’بے اختیار تصور میں آجانا اور بات ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے، خود صحابہؓ کو ایسا ہوتا تھا، چنانچہ بعض صحابہؓ کا مقولہ ہے:۔ کأنی انظر إلیٰ وبیض ساقیہ۔‘‘(۳)

مولانا نے ایک مرتبہ دریافت کیا کہ:۔

’’حضرت! تصور شیخ کو رابطہ کہتے ہیں؟۔‘‘

ارشاد ہوا کہ:۔

’’تصور یا بے تصور شیخ کی محبت ہونی چاہئے، ہم نے کبھی نہیں کیا۔ ہم تو وہی باتیں کرتے تھے، جو حدیث میں آئی ہیں، اسی سے کلمہ لا الہ الا اللہ جاری رہتا تھا، یاد رکھو کہ جو بات شریعت کے اتباع اور ان اعمال سے حاصل ہوتی ہے جو حدیث میں آئے ہیں وہ کسی سے نہیں ہوتی۔‘‘(۴)

ایک مرتبہ مولانا محمد علیؒ نے دریافت کیا کہ:۔

’’کوئی خاص درود شریف ارشاد ہو جس کے پڑھنے سے زیارت رسول اللہ صلی اللہ ہوا کرے۔‘‘

ارشاد ہوا:۔

’’کوئی خاص درود شریف نہیں ہے، خلوص پیدا کرنا چاہئے‘‘، تھوڑے تامل

---

(۱) ارشاد رحمانی، ص ۱۲ (۲) ایضاً، ص ۱۲، ۱۳ (۳) ایضاً (۴) ایضاً

کے بعد ارشاد ہوا کہ:۔ ''البتہ حضرت سید حسنؒ رسول نما کو اس درود کا عمل تھا'' اللھم صل علے محمد وعشرتہ بعد د کل معلوم لك'' اس سے خود انہیں بھی زیارت ہوتی تھی، اور جسے وہ بتا دیتے تھے اسے بھی ہو جاتی تھی۔'' (۱)

ایک مرتبہ مولانا کو خیال ہوا کہ انہیں حضرتؒ کی صحبت میسر نہیں، دوسرے لوگ اس سعادت کو حاصل کر رہے ہیں اور ہر وقت خدمت میں حاضر رہتے ہیں۔ یہ خیال دل میں آیا ہی تھا کہ مولانا ارشاد فرمایا:۔

''رہنے سے کیا ہوتا ہے، جو بات ہونے والی ہوتی ہے وہ ایک گھڑی میں ہو جاتی ہے۔'' (۲)

ایک مرتبہ فرمایا کہ:۔

''نیک بختی اور شے ہے اور ولایت اور چیز ہے، ولایت محض عنایت خداوندی سے ہوتی ہے۔ حضرتؒ کے پاس بیس بیس برس لوگ رہے اور حضرتؒ فرماتے تھے کہ ہم بہت چاہتے ہیں مگر کچھ نہیں ہوتا، اور جس کو وہ چاہتا ہے ایک توجہ سے ہو جاتا ہے۔'' یہ ارشاد فرما کر آپ کھڑے ہوگئے اور فرمایا کہ:۔ ''پڑھنے پڑھانے سے کیا ہوتا ہے دیکھو میں کچھ قرآن شریف پڑھ لیتا ہوں اور تھوڑا سا کچھ اور۔'' پھر لطف میں آ کر فرمایا کہ:۔ اللہ رسولؐ پر جان قربان کرنا چاہئے، اس سے سب کچھ ہوتا ہے، اور چند شعر پڑھے جن میں سے دو شعر یہ ہیں۔

سحر میں سامری کے کیا قدرت تیری آنکھوں میں جو اثر دیکھا
ہجوم داغ نے میرے یہ گلفشانی کی کہ اس نے آپ تماشے کو مہربانی کی

مولانا فرماتے ہیں:۔

''یہ باتیں میری طرف خطاب کر کے فرمائیں، اگرچہ اور صاحب بھی بیٹھے تھے، اس سے میری اندرونی حالت میں عجیب لطف کا تغیر ہوا۔ سبحان من نوّر قلوب العارفین بنور العرفان۔'' (۳)

مولانا کے ارشادات وملفوظات کے بعد مولانا نے چند صفحات میں بہت اختصار

---

(۱) ارشاد رحمانی ص ۱۴ (۲) ایضاً ص ۱۷ (۳) ایضاً ۳۰

جامعیت اور وضاحت کے ساتھ سلوک وتزکیہ اور اس راہ کی اولین شرائط اور مطالبات بیان کئے ہیں جن کا مطالعہ ہر طالب خدا کے لئے بے حد مفید ہے۔

اذواق وکیفیات

انسان کی عظمت وبلندی کا سب سے بڑا معیار خدا اور خلق خدا کے نزدیک یہ ہے کہ اس کا ظاہر وباطن ایک ہو، اور اس کی خلوت اس کی جلوت سے مختلف نہ ہو، اور مومن کامل اور ولی کی عظمت وکمال کا معیار یہ ہے کہ سکر ووجد کی حالت میں بھی کوئی ناروا کلمہ اس کی زبان سے نہ نکلے، اور پیمانۂ محبت چھلکنے نہ پائے، اگر کسی کو جذب وکیفیت، شوق وسرمستی اور درد وسوز کا حصہ بہت کم ملا ہے تو اس کی ہوشمندی اتنی قابل قدر اور لائق تعریف نہیں، جتنی اس شخص کی کہ جس کے اندر عشق ومحبت اور ذوق وشوق کا طوفان برپا ہو، لیکن بیرونی سطح میں کوئی اضطراب نظر نہ آتا ہو۔

یہ اذواق وکیفیات (جیسا کہ بعض اولیاء اللہ کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے) بعض اوقات اس درجہ کو پہونچ جاتی ہیں کہ انسان کو خود اپنا وجود گراں معلوم ہونے لگتا ہے، اور اس سے بھی غیرت آنے لگتی ہے۔

بردائے عقل نا محرم کہ امشب باخیال او
چناں خوش خلوتے بودم کہ من ہم نیستم محرم

یہ مکمل فنائیت کی منزل ہے، اس وقت اپنے چشم وگوش سے بھی حجاب آنے لگتا ہے۔ اور "رخ محبوب" کے علاوہ ہر چیز قلب پر بار اور روح کے لئے ناگوار ہوتی ہے، اور یہ حال ہوجاتا ہے کہ:۔

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن نہ دہم
گوش را نیز حدیث تو شنیدن نہ دہم
گر بیاید ملک الموت کہ جانم بہ برد
تانہ بینم رخ تو روح رمیدن نہ دہم

عشق رسولؐ

مولانا کی زندگی اسی ذوق وشوق اور حضور وسرور کا نمونہ تھی، ان کی سب سے بڑی آرزو اور تمنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت تھی، جیسا کہ انہوں نے اپنے ایک خط میں اظہار کیا ہے وہ بچپن میں گھڑیوں اس آرزو اور تمنا میں ڈوبے رہتے تھے اور رویا کرتے تھے۔

مولانا اپنے مریدین کو چند خاص اشعار پڑھنے کی بھی تلقین کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ جمعہ کی شب کو پڑھنا چاہیے۔

ماسٹر خدابخش مونگیریؒ (جو مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کے مرید اور مولانا مونگیری کے تربیت یافتہ تھے) بیان کرتے ہیں کہ:۔

"ایک دفعہ میں حسب معمول بھاگلپور (۱) سے واپس ہوا، اور حضرت مونگیریؒ کی خدمت میں حاضری دی، بھاگلپور والوں کو سلام و پیغام پہونچایا، آخر میں فرمانے لگے کہ کوئی اور بات، عرض کیا کہ: نہیں!۔ پھر فرمایا:۔ کوئی اور خاص بات تو پیش نہیں آئی؟ میرے ذہن میں کوئی بات نہ تھی، لیکن باربار کے سوال پر خیال آیا کہ واپسی میں سلطان گنج اسٹیشن پر ایک بات پیش آئی تھی۔ عرض کیا کہ جی ہاں جب گاڑی سلطان گنج اسٹیشن پر پہونچی، ایک فقیر بڑے مست طریقہ پر چند اشعار پڑھ رہا تھا جو مجھے بہت پسند آئے اور یاد ہوگئے۔ فرمایا پڑھو؟ میں نے حسب ذیل اشعار پڑھے:۔

نسیما جانب کو لیش گزر کن بگو آں نازنیں شمشاد مارا
بہ تشریف قدوم خود زمانے مشرف کن خراب آباد مارا
کہ بے دیدار تو اسباب شادی نمی شاید دل ناشاد مارا

جوش میں آکر فرمایا کہ: میاں! اس سے تو حضورؐ کی زیارت ہوتی ہے۔" (۲)

اسی نسبت سے مولانا عربوں کا بہت خیال کرتے تھے، اور اگر معلوم ہوتا کہ فلاں جگہ کوئی عرب آئے ہیں اور ان کو کوئی ضرورت ہے تو مدد کی پوری کوشش کرتے تھے، اور اپنی

(۱) بھاگلپور میں ماسٹر صاحب کی دو لڑکیاں رہتی تھیں، ہر سنیچر کو ماسٹر صاحب مولانا سے مل کر بھاگلپور جاتے تھے اور واپسی پر سب سے پہلے مولانا ہی کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ (۲) کمالات محمدیہ (اضافات)، ماسٹر صاحب کہتے ہیں کہ ان اشعار کی بدولت مجھے کئی مرتبہ دیدار نصیب ہوا۔

ضرورت پس پشت ڈال دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک قیمتی عبا ایک عرب کو دے دی۔ مضطر مظفر پوری نے اسی قسم کے ایک چشم دید واقعہ سے متاثر ہو کر بالکل صحیح کہا ہے ۔

کوئی آجاتا مدینہ کا جہاں
مال کیا اس پر فدا کرتے تھے جاں (۱)

قدرتی سماع

کسی وقت مولانا کو سماع کی طرف بھی رغبت ہوتی تھی اور وہ تنہائی میں کسی خوش الحان آدمی سے کچھ اشعار سنتے تھے:۔

بعض مرتبہ کسی خاص کیفیت اور جذبہ کے ماتحت کچھ سننے کا اشتیاق ہوا اور رغبت زیادہ ہوئی اور کوئی ایسا آدمی نہ ملا جو کچھ سنا سکے تو قدرت کی طرف سے اس کا انتظام ہو گیا، اور رات کو خواب میں عجیب وغریب گانا سنا جو دنیا میں حالت بیداری میں کسی طرح میسر نہیں ہو سکتا۔ بعض دفعہ یہ حالت پیش آئی کہ خواب سے بیدار ہو گئے اور آواز آنا بند ہو گئی، پھر جب آنکھ بند کی تو پھر آواز آنے لگی، یہ عجیب واقعہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے پیارے ہیں، وہ رحیم وکریم یوں ہی ان کی خواہش پوری کر دیتا ہے، اور اس خوبی سے کہ اس میں کسی ذرا بھی اختلاف نہیں۔ (۲)

بعض وقت ایسا بھی ہوتا کہ مولانا عبدالعزیز بہاریؒ یا حافظ رحمت اللہ مظفر پوریؒ تنہائی میں عشقیہ اشعار سناتے اور مولاناؒ کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں، بعض وقت مکمل استغراق کی کیفیت ہو جاتی (۳)، لیکن مولانا کو استغراق اور وجد وکیفیت کی حالت میں بھی نماز کا بڑا خیال رہتا تھا، اذان سنتے ہی ہوشیار ہو جاتے تھے اور نماز ادا کرتے تھے۔ پہلے سفر حج میں مولانا پر استغراقی کیفیت کا غلبہ ہوا، اور درمیان میں کئی نمازوں کا وقت آیا، لیکن ہر مرتبہ نماز ادا کی اور اس کے بعد وہی حالت عود کر آئی۔

نماز سے عشق

نماز سے مولانا کو اس درجہ عشق تھا اور جماعت اور پابندی وقت کا اس قدر اہتمام تھا

(۱) الجامعۃ (۲) کمالات محمدیہ: ۳۹و۴۰ (۳) ایضاً

کہ اس کو دیکھ کر "قرۃ عینی فی الصلوۃ" کے معنی سمجھ میں آتے ہیں، اور اس دور آخر میں اس کا عملی اور زندہ نمونہ نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ اس کا اندازہ ذیل کے ایک واقعہ سے کیا جاسکتا ہے۔

ایک مرتبہ مولانا کا لکھنؤ میں قیام تھا اور جمعہ کا دن تھا، مولانا کو وقت کا صحیح اندازہ نہ ہوسکا اور نماز کے لئے چلے، ماموں بھانجہ کی قبر والی مسجد میں پہونچے، تو معلوم ہوا نماز ہوگئی ہے، یہ سنتے ہی مولانا پر اتنا اثر پڑا کہ اسی وقت فرش پر گر پڑے۔ (۱)

وفات سے کچھ روز پیشتر ضعف وعلالت میں اس قدر اشتداد ہو چکا تھا کہ نشست وبرخاست کی بھی طاقت نہ رہ گئی تھی، نماز مغرب کے وقت تکبیر کی آواز کانوں میں آئی، بے ساختہ بستر سے اٹھ پڑے اور مسجد میں پہونچ کر فرش پر گر گئے اور اس کے بعد گھسٹ گھسٹ کر جماعت میں شریک ہوئے۔ (۲)

مولانا کی علالت اور ناسازی طبع کے دوران اس بات کا اہتمام رکھا جاتا تھا کہ اذان کی آواز مولانا کے کان میں نہ پڑے ورنہ بے چین ہوکر اپنے ضعف وعلالت کی پرواہ کئے بغیر نماز کے لئے باہر آجائیں گے، لیکن اس احتیاط وپیش بندی کے باوجود یہ واقعہ پیش آیا۔

ذوق ونفاست

مولانا کے مزاج میں ابتدا ہی سے نفاست تھی، اور وہ خوش پوشاکی اور خوش وضعی کو پسند کرتے تھے، لیکن طبیعت سادگی اور بے تکلفی کی طرف مائل تھی، فرماتے تھے کہ:۔

"دلی رغبت کمبل اوڑھنے اور موٹا کپڑا پہننے کی طرف ہے، مگر بغیر خواہش جو لباس اللہ تعالیٰ بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ کی نعمت اور اس کا عطیہ خیال کر کے اس کے رد کرنے کو دل نہیں چاہتا، مگر خاص لباس کا التزام اچھا نہیں معلوم ہوتا خواہ وہ عمدہ ہو یا غیر عمدہ، جس طرح عمدہ لباس میں نفس کا شائبہ ہوسکتا ہے اسی طرح موٹے لباس میں۔ خصوصاً درویش کو ریا کا خوف زیادہ ہوسکتا ہے۔" مکرر فرمایا:۔ بے تکلف اور سادہ وضع کے لوگ بہت ہی اچھے

---

(۱) یہ واقعہ عم مخدوم ومعظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے مولوی حکیم مظہر قدیم ندوی مرحوم کے حوالہ سے بیان کیا (۲) کمالات (باختصار): ٦٦

معلوم ہوتے ہیں، مگر اس کریم واہب العطایا کی عجب بندہ نوازی ہے کہ بغیر خواہش وہ ہر طرح کا سامان پہونچاتا ہے اور آرام سے رکھتا ہے، سچ ہے اور بلاشک ہے ؎

جان وتن پروردۂ احسان تست
بے عوض بندہ نوازی شان تست(۱)

حضرت خواجہ عبیداللہ احرار نقشبندیؒ بہت شان وشوکت کے ساتھ رہتے تھے اور ان کے یہاں دولت کی وہ فراوانی تھی کہ بڑے بڑے امراء وروساء کے ہاں بھی نہ ہوگی لیکن اس کا انکے زہد وفقر، اور ارشاد وسلوک پر مطلق اثر نہ تھا، مصنف کمالات نے ان کا ذکر کرتے ہوئے یہ دلچسپ واقعہ قلمبند کیا ہے کہ:۔ جب مولانا جامیؒ بیعت کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان مظاہر ثروت اور جاہ وحشم کو دیکھ کر یہ مصرعہ کہہ کر واپس ہوئے ؎

نہ مرد است آنکہ دنیا دوست دارد

واپس ہوکر ایک مسجد میں جاکر سو رہے، اسی حالت میں الہام ہوا، اپنی اس غلط اندیشی پر توبہ واستغفار کرکے پھر حاضر ہوئے، حضرت خواجہ عبیداللہ احرار نے دیکھتے ہی پوچھا جامی کل کیا مصرعہ کہا تھا، بہت اصرار کے بعد انہوں نے کہا، ''نہ مرد است آنکہ دنیا دوست دارد'' اس کے جواب میں خواجہ صاحبؒ نے دوسرا مصرعہ ارشاد فرمایا: ؎

بدارد از برائے دوست دارد

---

(۱) کمالات (باختصار)۵۶

باب ہفتم

آخری ایام زندگی، وفات، اخلاف

ندوہ کی یاد

ارشاد و صلاح اور تزکیہ و تربیت کی اس فضاء میں مولانا نے ندوہ کو کسی وقت فراموش نہیں کیا اور فقہاء ندوہ سے خط و کتابت کا تعلق بھی برابر قائم رہا۔ مولانا سید عبد الحیؒ، مولانا غلام محمد ہوشیار پوریؒ اور منشی احتشام علی صاحبؒ کے علاوہ دوسرے حضرات سے بھی ان کا رابطہ قائم تھا۔ مولانا سید عبد الحیؒ سے وہ اپنے دوسرے احباب کی خیریت اور حالات دریافت کرتے رہتے تھے، ندوہ ان کے نزدیک روحانی تزکیہ و تربیت سے علیحدہ کوئی چیز نہ تھی، اس لئے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لینے اور بالکل بے تعلق ہو جانے کا سوال ہی نہ تھا، اس زمانہ میں مولانا "الندوہ" بھی پابندی سے پڑھتے تھے اور اپنے دوستوں اور رفیقوں سے بھی ندوہ کے حالات معلوم کرتے رہتے تھے۔ ایک خط میں مولانا سید عبد الحیؒ کو لکھتے ہیں: "جلسہ کی مختصر کیفیت" الندوہ" سے معلوم ہوئی، آپ کے ذریعے سے معلوم کرنے کی خواہش ہے۔

مولانا نے اپنے دو صاحبزادوں (۱) کو بھی ندوہ میں تعلیم کی غرض سے بھیجا اور سارے اختلافات کے باوجود اسی درسگاہ کو ترجیح دی۔

---

(۱) مولانا منت اللہ رحمانیؒ (امیر شریعت بہار) و مولانا نور اللہ صاحب۔

مولانا سید عبدالحیؒ نے غالباً کسی موقع پر مولانا سے دوبارہ نظامت قبول کرنے کے متعلق اپنے خط میں لکھا تھا، اس کا جواب لکھتے ہوئے مولانا اپنے دیرینہ دوستوں سے اس طرح شکوہ سنج ہوتے ہیں:۔

''آپ نے رسم رسل ورسائل گویا بند کردی، افسوس ہے ہمیں مردہ سمجھ لیا، مگر یہ خیال صحیح ہے، میری حالت تو ایسی ہی ہوگئی ہے کہ مجھے مردہ خیال کیا جائے، خیر کسی وقت خاتمہ بخیر ہونے کی دعا کرلیا کیجئے اس خاکسار کے لئے، تعجب ہے کہ آپ نے نظامت قبول کرنے کے لئے دریافت کیا، غالباً میری حالت سے آپ واقف نہیں ہیں، یہ بتایئے کہ مولوی خلیل الرحمٰن صاحب کہاں ہیں؟ اس سے ضرور اطلاع دیجئے۔ (۱)

اسی کے ساتھ مولانا کے علمی ذوق دوست نظر میں کوئی فرق نہ آیا تھا بلکہ اس میں ایک گونہ اضافہ ہی ہوگیا تھا۔

رفقاء ندوہ سے علمی موضوعات پر برابر تبادلہ خیال ہوتا رہتا تھا، نئی مطبوعات اور کتابوں کے حصول اور خریداری سے مولانا ان کو برابر مطلع کرتے رہتے تھے۔

ایک خط میں مولانا سید عبدالحیؒ کو لکھتے ہیں:۔

''حیدرآباد سے کل مطبوعہ دائرۃ المعارف منگائی ہیں اور کتب مصریہ مولوی نور الدین سے، منشی محمد علی سے کئی کتابوں کی قیمت دریافت کی ہے، آپ سے یہ دریافت کرتا ہوں کہ ہدایہ مطبوعہ نول کشور مولوی جن کا تحشیہ کیا ہوا کیسا ہے اور ہدایہ محشی مطبع یوسفی سے اسے کیا نسبت ہے۔ دیوان حافظ مطبع نامی لکھنؤ میں طبع ہوا ہے، سنا ہے کہ وہ عمدہ ہے اور اس میں تین سو اشعار زائد ہیں، میں اسے منگانا ہے''۔ (۲)

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:۔

''طبقات ابن سعد کی شاید جلد ۴ میاں فضل الرحمٰن نے میرے پاس بھیجی ہے، مجھے خط لکھا تھا کہ ہم نے منگوائی ہے، سو روپیہ کی ضرورت ہے، پیشگی بھیج دیجئے، میں نے جواب دیا تھا کہ جو جلد ۴ تم نے روانہ کی ہے، اسے دیکھ کر روپیہ

(۱) خطوط بنام مولانا سید عبدالحی: ۳۲ (۲) مجموعہ خطوط قلمی بنام مولانا سید عبدالحی: ۱۲

بھیجوں گا، وہ جلد پہونچ گئی، بہت چھوٹی جلد ہے، اگر چہ عمدہ چھپی ہے، مگر قیمت بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے، لندن کی مطبوعہ کتابوں کی قیمت اس قدر گراں نہیں ہوتی، حیدرآباد سے ایک شخص نے تین سوال کئے تھے، ان کے جواب میں رسالہ ہوگیا، ایک صاحب نے اسے چھپوایا ہے، اسے بھیجتا ہوں، دیکھئے گا اگر کوئی سقم معلوم ہو تو ضرور اطلاع دیجیئے گا۔"(۱)

آخری ایام

ضعف اور علالت کا سلسلہ جو عرصہ سے جاری تھا، اب اس میں بہت تیزی کے ساتھ اضافہ ہونے لگا، حج سے دو ایک برس قبل ہی سے اس میں شدت پیدا ہو چلی تھی، اس زمانہ میں مولانا نے اہل تعلق کو جو خطوط لکھے ہیں، ان میں علالت کا ذکر موجود ہے اور اس انداز میں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علالت نے تشویشناک صورت اختیار کر لی تھی، ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"اب میں اکثر علیل رہا کرتا ہوں، ضعف اور ناتوانی روز بروز ترقی پر ہے، اللہ تعالیٰ خاتمہ بالخیر کرے"۔(۲)

دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:۔

"اب میں نہایت ضعیف ہو گیا ہوں اور اکثر علیل رہا کرتا ہوں اور ہمیشہ پیغام سرکاری کا منتظر رہتا ہوں"۔

منشی احتشام علی صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:۔

"بعض روز ایسی حالت ہو جاتی ہے کہ یقین ہو جاتا ہے کہ آج ہی خاتمہ ہے"۔(۳)

مولانا کو کبھی کبھی درد گردہ کی شکایت بھی ہو جاتی تھی، مرض وفات میں بھی ایک مرتبہ سخت دورہ اٹھا، لیکن ان کا اصل مرض ضعف ہی تھا جو بخار وغیرہ کی صورت میں بہت زیادہ

---

(۱) مجموعہ خطوط قلمی بنام مولانا سید عبدالحی (۲) خطوط بنام منشی سید محمد علی حسن صاحب گیاوی (کمالات:۲۵۹)
(۳) مقالہ متعلقہ سوانح از مولانا رحمانی (۴۹) باختصار۔

بڑھ جاتا تھا اور تشویش پیدا ہو جاتی تھی۔

عمر کے آخری سالوں میں استغراق بہت رہنے لگا تھا، اپنے صاحبزادوں کو بھی نہ پہچانتے تھے، لیکن عجیب بات ہے کہ فرائض وسنن کے لئے صحو ہو جاتا تھا اور اطمینان سے نماز ادا کرتے تھے، بعض دفعہ استغراقی کیفیت پر کئی کئی روز گزر گئے، غذا بھی متروک ہو گئی لیکن جب بھی اذان کی آواز کانوں میں پڑی، فوراً آنکھیں کھول دیں، وضو فرمایا، نماز سے فارغ ہوئے اور پھر وہی حالت طاری ہو گئی۔ (۱)

اسی زمانہ میں ایک مرتبہ کریم بخش صاحب مرحوم جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے مولانا کے پیر دبا رہے تھے، گفتگو میں مولانا نے کوئی ایسا اشارہ کیا جس سے محسوس ہوا کہ اب زمانہ اخیر ہو رہا ہے، کریم بخش مرحوم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور کہا کہ حضرت آپ کے بعد ہم لوگ کیا کریں گے، کریم بخش صاحب کا بیان ہے کہ یہ سن کر حضرت اٹھ کر بیٹھ گئے اور جوش میں آ کر فرمایا کہ ''میاں'' تین ہاتھ مٹی میں جانے سے کیا ہوتا ہے، اولیاء اللہ جب تک روزہ رہتے ہیں تو سمجھو تلوار میان میں ہے، اور جب انتقال کر جاتے ہیں تو تلوار میان سے نکل آتی ہے۔ (۲)

عمر کا چراغ کچھ اس طرح سے جلنے لگا تھا اور اس کی روشنی بار بار تیز ہو رہی تھی کہ دیکھنے والوں کو صاف معلوم ہوتا تھا کہ اب سفر آخرت کی تیاری ہے اور علم وعرفان کا یہ آفتاب غروب ہونے والا ہے، محفل میں وہی گرمی اور حرارت باقی تھی لیکن اس کی فضائیں کسی سانحہ کی خبر دینے لگی تھیں لیکن اس حالت میں بھی بادہ گساروں کے لئے کوئی امتیاز اور تخصیص روا نہ تھی اور ہر طبقہ اور ہر حلقہ کے اکابر اس بھڑکتی شمع سے روشنی اور حرارت حاصل کر رہے تھے۔

یہاں دردو محبت کی گرمی وچاشنی کے ساتھ علم وعرفان کی روشنی اور وسیع النظری اور مجتہدانہ بصیرت کی جلوہ افروزی اس طرح باہم وابستہ اور پیوست تھی کہ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا تھا، دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس محفل میں مولانا مرتضیٰ حسن دیوبندیؒ، مولانا نثار احمد کانپوریؒ، مولانا ابراہیم سیالکوٹیؒ (اہل حدیث) مولانا سید سلیمان

---

(۱) ازمقالہ متعلقہ سوانح ودیگر مصادر (۲) کمالات محمدیہ (اضافات): ۳۱۱

ندویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ جیسے مشاہیر علماء اور اکابر ایک ہی وقت میں نظر آتے تھے، بعض علماء بالخصوص مولانا عبدالشکور صاحب، مولانا ظہور الاسلام فتحپوری اور مولانا گیلانی وغیرہ مولانا کے یہاں بعض مرتبہ ہفتوں اور مہینوں قیام کرتے۔(۱)

وقت آخر

مولانا کے مرض وفات کی ابتدا سنیچر کو ہوئی اور گیارہ روز یہ سلسلہ جاری رہا، اس کا پہلا سبب یہ ہوا کہ دن کو غسل کیا اور رات کو گرمی کی وجہ سے سائبان میں آرام فرمایا، دو بجے رات کو یکایک بخار ہوا اور دیکھتے دیکھتے اتنا تیز ہوا کہ تشویش پیدا ہوگئی، حالت میں مزید ابتری کے آثار دیکھ کر مخصوص اہل تعلق کو خطوط اور تار کے ذریعہ اطلاع دی گئی اور مخلصین اور عقیدتمندوں کا ہجوم ہونا شروع ہوا لیکن اس کے بعد ہی حالت بہتر ہونا شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ بخار اتر گیا۔

تیسرے یا چوتھے روز پھر بخار آیا اور صاحب فراش ہوگئے، کراہنے اور اظہار تکلیف کی مولانا کو عادت نہ تھی، استفسار پر'الحمد للہ' کے علاوہ اور کوئی جواب نہ ہوتا۔

اس سے قبل ایک مرتبہ عصر کی نماز کے وقت مولانا کو درد گردہ کا اتنا شدید دورہ پڑا کہ جماعت میں تشریف نہ لاسکے۔ مولانا عبدالصمد رحمانی نماز کے بعد دوسرے لوگوں کے ساتھ عیادت کے لئے حاضر ہوئے تو فرمایا کہ آج درد گردہ میں اتنا مزہ آیا کہ اس سے پہلے کبھی نہ آیا تھا، اس کے بعد یہ شعر پڑھا۔

عاشقاں رادر دو غم حلوا بود   گرچہ بادیگر کساں بلوا بود

ان دنوں ملاواں سے صاحبزادہ صاحب تشریف لائے ہوئے تھے اور حاضر خدمت تھے عرض کیا کہ حضرت اسی مضمون کا ایک شعر داغ نے بھی خوب کہا ہے۔

وہ مزہ دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب
مرے دونوں پہلوؤں میں دل بے قرار ہوتا

۱۔ مقالہ متعلقہ سوانح، از مولانا منت اللہ رحمانی۔

یہ سن کر مولانا پر ایک خاص کیفیت طاری ہوئی، کئی بار اس شعر کو دہراتے رہے اور مکرر پڑھنے کی خواہش کی۔ گیارہ روز تک علالت کا سلسلہ قائم رہا، طہارت کا بہت زیادہ اہتمام تھا اور جب تک ہوش میں رہا اس کی برابر تاکید کرتے رہے، ان ہی ایام میں ایک مرتبہ فیرینی پیش کی گئی تو ذرا سا منہ میں لے کر منع فرمایا اور کہا کہ اب ہم کو یہ چیزیں اچھی نہیں معلوم ہوتی ہیں، آخر میں غذا بالکل ترک ہوگئی تھی اور دوا بمشکل حلق سے اتاری جاتی تھی، آخر کے پانچ روز مکمل استغراق میں گزرے، یہ وہ دن تھے جس میں مولانا جماعت میں شریک نہ ہو سکے، اس سے پہلے انتہائی کمزوری کی حالت میں بھی اگر کسی وقت ذرا سی بھی قوت محسوس کرتے تو مسجد میں آنے کے لئے بے قرار ہو جاتے اور بڑے اصرار کے بعد حجرہ میں نماز ادا کرنے پر آمادہ ہوتے۔

وفات

وصال کے ایک روز پہلے مولانا کے ایک خاص خادم اور مزاج داں حاجی لیاقت حسین صاحب نے متحرک لبوں میں کان لگایا تو اللہ اللہ کی آواز آرہی تھی۔

۶ ربیع الاول سہ شنبہ ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۳ ستمبر ۱۹۲۷ء کو زوال آفتاب کے قریب ایسا محسوس ہوا کہ یہ آفتاب رشد و ہدایت بھی عنقریب غروب ہونے والا ہے، اب وقت پورا ہو چکا تھا، ظہر کی نماز کے بعد ۲ بجے دن میں اللہ اللہ کرتے ہوئے جان جاں آفریں کے سپرد کی۔

وفات کی خبر بجلی کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی، اور ہر طرف سے عقیدتمندوں نے ہجوم کیا، بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اسی کمرہ میں غسل دیا گیا، جو مولانا کی مستقل قیام گاہ تھی، لوگوں کے ہجوم اور وارفتگی کی وجہ سے نماز جنازہ مغرب کے بعد ہوئی، چاندنی رات میں جنازہ چبوترہ پر لایا گیا اور نماز کے بعد وصیت کے مطابق حجرہ کے سامنے صحن کے آخری مشرقی حصہ میں لیچی کے درخت کے نیچے تدفین عمل میں آئی (۱)۔ اور نصف صدی سے زائد عرصہ تک اسلامی ہند کی فضاؤں کو اپنی ضیا پاشیوں سے منور کرنے کے بعد یہ آفتاب نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

ا۔ مولانا عبدالصمد رحمانی، الجامعہ (جلد ا۔ شمارہ ۳:) و مقالہ متعلقہ سوانح از مولانا منت اللہ رحمانیؒ

دردست نہ تیریست، نہ دردست کمان است
این سادگی اوست کہ بسمل دو جہان است
درمدرسہ از جنبش لعل تو حکایت
درمیکدہ از مستی چشم تو نشان است

اولاد

مولانا نے تین شادیاں کیں، پہلی شادی محی الدین پور (مظفر نگر) کے میر امان علی مرحوم کی صاحبزادی سے ہوئی، اس وقت مولانا کی عمر ۲۲ رسال تھی، ان سے دولڑکیاں اور تین لڑکے تولد ہوئے۔ سید احمد علی، سید محبوب علی اور سید معصوم علی مؤخر الذکر دونوں لڑکے کمسنی میں انتقال کر گئے، سید محبوب علی کے عجیب حالات دیکھنے میں آئے۔ صاحب ''کمالات محمدیہ'' نے لکھا ہے کہ:۔

> ''جب سے بولنا شروع کیا اللہ اللہ بکثرت کرتے رہتے۔ ایک شخص نے ان سے سوال کیا۔ اللہ اللہ تو بہت کرتے ہو، تم اللہ میاں کو دیکھتے ہو، اللہ میاں کہاں ہیں؟ فوراً جواب دیا کہ:۔ اللہ میاں میرے کمرے میں ہیں، میرے دالان میں ہیں، گھر میں ہیں''۔
>
> دس سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔

مولانا سید احمد علی ایک عالم باعمل تھے اور بہت عابد وزاہد، مولانا نور محمد پنجابیؒ، مولانا احمد حسن کانپوری اور مولانا محمد فاروق چریاکوٹیؒ سے درسیات کی تکمیل کی۔ مولانا محمد علیؒ کبر سنی کی وجہ سے خود ان کو تعلیم نہ دے سکے۔ ان کی شادی بھی قصبہ پھلت (مظفر نگر) میں ہوئی۔ ۱۳۲۸ھ میں رمضان کے مہینہ میں جمعہ کے روز نماز پڑھتے ہوئے انتقال فرمایا۔(۱) ان کے انتقال کے چند مہینے بعد دوسری صاحبزادی ام سلمہ کا درود شریف پڑھتے

---

(۱) مولانا محمد علیؒ کے پوتے مولانا فضل اللہ حیدرآبادی، عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات ومذہب وثقافت کے عرصہ تک صدر رہے۔ عالم باعمل اور بہت کریم النفس اور متواضع انسان ہیں، روزانہ نماز فجر کے بعد محلّہ کی مسجد میں درس قرآن کا معمول ہے۔ ''فضل اللہ الصمد لشرح الادب المفرد'' جو مصر میں طبع ہوئی ہے، مولانا ہی کی تصنیف ہے۔

ہوئے انتقال ہوا۔ بڑی صاحبزادی ام کلثوم ۱۳۲۷ھ میں طاعون میں مبتلا ہوئیں، اور اسی مرض میں انتقال ہوا۔

دوسری شادی کانپور میں ایک بیوہ سے مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کے اشارہ سے ہوئی، یہ خاتون مولانا فضل رحمٰن صاحبؒ سے بیعت تھیں اور تعلیم یافتہ بھی تھیں، ان سے کوئی اولاد نہ ہوئی، شادی کے دس سال بعد ۱۳۱۷ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

تیسری شادی سیکری (مظفرنگر) میں ہوئی، ان سے پانچ لڑکے اور ایک لڑکی ہوئی۔ سب سے پہلے صاحبزادہ کا نام عتیق اللہ تھا۔ ۱۳۱۸ھ میں جب مولانا پہلے حج کے لئے روانہ ہوئے اس وقت ان کی عمر ایک ماہ تھی بچپن میں کھیلنے کودنے سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی، اکثر خاموش رہتے تھے۔ والدہ صاحبہ نے ایک مرتبہ پوچھا کہ:۔ ''چپ کیوں رہتے ہو؟''

جواب دیا کہ:۔

''ہم اللہ کو یاد کرتے ہیں!''

نو برس کی عمر ہوئی تو بہت منع کرنے کے باوجود پورے رمضان کے روزے رکھے۔ صاحب ''کمالات محمدیہ'' نے ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

> ''ایک مرتبہ ان کی والدہ نے ان کو ایک مخمل کی ٹوپی جس پر کار چوبی کا کام تھا، پہننے کے لئے دی، لیکن انہوں نے اس کو نہ پہنا، ایک سفید اور سادی ٹوپی پہن لی اور کہا کہ ہم ایسی ٹوپی نہیں پہنتے''۔

ان کا انتقال بارہ سال کی عمر ہوا۔

دوسرے صاحبزادے مولانا لطف اللہ صاحبؒ ہیں۔ یہ بھی صلاح وتقویٰ اور فہم فراست دونوں میں ممتاز تھے۔ مولانا نے خلافت بھی عطا فرمائی۔ ۱۳۶۲ھ میں وفات پائی۔

تیسرے صاحبزادے مطیع اللہ آٹھ ماہ کی عمر میں انتقال کر گئے۔

چوتھے صاحبزادے مولانا نوراللہ ہیں۔

مولانا منت اللہ صاحب رحمانی اس وقت (امیر شریعت بہار) ہیں اور بہار میں ان کی ذات اور دینی کوششوں سے مسلمانوں کو بہت نفع پہنچ رہا ہے، مولانا لطف اللہ صاحبؒ

کے بعد مسند ارشاد مولانا ہی کے سپرد ہوئی۔ بہار کی مشہور دینی تنظیم ''امارت شرعیہ'' مولانا ہی کی نگرانی میں چل رہی ہے۔ مولانا نے چار سال ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی، بیعت اپنے والد ہی سے تھے، لیکن مولانا محمد علیؒ کے خلیفہ مولانا محمد عارف صاحب سے استفادہ کیا، ایک عرصہ تک حضرت مدنیؒ کی صحبت میں رہے، اس کے بعد مولانا حاجی محمد شفیع صاحب بجنوری (خلیفہ مولانا فضل رحمٰنؒ) کی خدمت میں پانچ سال گزارے۔ مولانا نے عملی سیاسیات میں بھی حصہ لیا اور جیل کی سختیاں بھی برداشت کیں۔ جامعہ رحمانی کی نشاۃ ثانیہ اور کتب خانہ رحمانیہ کی توسیع وترقی مولانا ہی کی رہین منت ہے۔

ایک صاحبزادی بی بی سعیدہ ہیں۔

مریدین وخلفاء

مولانا کے مریدین اور خلفاء میں سب سے ممتاز نام مولانا محمد عارف کا ہے۔ یہ موضع ہرسنگ پور ضلع دربھنگہ (بہار) کے رہنے والے تھے، بیعت تو مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ سے تھے، لیکن سلوک وتربیت مولانا سید محمد علی کے حصہ میں آئی، اور خلافت سے سرفراز ہوئے۔ مولانا کی ان پر خاص توجہ اور نظر عنایت تھی۔ تقریباً تین سال تک مولانا ہی کے فیض صحبت وتربیت سے استفادہ کیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک تدریسی خدمت انجام دی۔ مدرسۂ رحمانیہ سوپول (بھاگلپور) ان کی ہی کی یادگار ہے، بہت سادہ مزاج اور متواضع انسان تھے۔ بارہا دیکھا گیا کہ سخت گرمیوں کا موسم ہے، مولانا مونگیر تشریف لارہے ہیں اور ٹھیک دوپہر کے وقت اپنا سامان اپنے کاندھے پر لادے ہوئے اسٹیشن سے خانقاہ پہونچے، خانقاہ میں بھی کسی کمرے میں فروکش نہ ہوتے، بلکہ مسجد میں قیام فرماتے، اور ہر خاص وعام سے ہر وقت ملتے، بلکہ ان ہی میں بیٹھے رہتے۔ (۱)

بہار کے بعض علاقوں میں تعزیہ کا بہت رواج تھا، مولانا کی سعی سے آج ان جگہوں پر کوئی تعزیہ کا نام لینے والا بھی نہیں ہے۔

علاقہ ''ترہت'' میں نکاح بیوگان بہت معیوب خیال کیا جاتا تھا، مولانا کی کوشش

---

(۱) کلید معارف: ۱۷

سے اس کی اصلاح بھی ہوئی، ایک گاؤں ''شکری'' میں مولانا نے بہت کوشش کے بعد ایک بیوہ کو نکاح پر آمادہ کیا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ کے اندر بہت سی بیوائیں اس ظالمانہ اور جاہلانہ رسم و رواج کی قید سے آزاد ہوئیں، اور اب عام طور پر وہاں بیواؤں کے نکاح ہوتے ہیں۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا مولانا کو بڑا اہتمام تھا، قوت ہوتی تو زبردستی روک دیتے، ورنہ زبان سے کہتے، یا پھر وہاں سے ہٹ جاتے۔

مرض وفات میں عرض کیا گیا کہ:۔..........دعا فرمایئے! اللہ تعالیٰ محتاجی سے بچائے؟ فرمایا:۔تم کیا، میری کوئی اولاد بھی محتاج نہ ہوگی، اگر تم لوگوں نے تقویٰ اختیار کیا، پھر یہ آیت تلاوت فرمائی:۔'' ومن یتق اللہ یجعل له مخرجًا ویرزقه من حیث لا یحتسب''۔

مرض نے شدت اختیار کر لی اور تکلیف زیادہ بڑھی تو لوگوں نے محسوس کر کے حال دریافت کیا۔ فرمایا کہ:۔

''تکلیف کچھ بھی نہیں ہے، بے چینی ہے، اور اب تو مجھے اپنے پروردگار سے ملنے کی آرزو ہے''۔

اس کے بعد مولانا عبدالرحمٰن صاحب (مولانا کے صاحبزادے) تشریف لائے اور بلند آواز سے من أحب لقاء اللہ احب اللہ لقائه (۱) اس حدیث شریف نے مولانا کو بے خود کر دیا، اور بہ آواز بلند فرمایا:۔ بیشک! اس کے بعد کوئی گفتگو نہ کی۔ ۹ر صفر ۱۳۶۳ھ جمعہ کی نماز کے وقت انتقال فرمایا۔(۲)

مولانا کے ایک اور خلیفہ مولانا عبدالرحیم صاحب گوگری ہیں۔ ضلع مونگیر اور ضلع بھاگلپور کے دور دراز علاقوں میں مولانا کی ذات سے بڑا فائدہ پہونچا، ہزاروں اشخاص تائب ہوئے۔ ردقادیانیت میں بھی انہوں نے بڑی خدمت انجام دی۔

دوسرے خلفاء حسب ذیل ہیں:۔

مولانا حافظ شاہ رحمت اللہ مظفر پوری (۳)

---

(۱) جس نے اللہ سے ملنا پسند کیا، اللہ نے بھی اس سے ملنا پسند کیا۔ (۲) کلید معارف (۳) مولانا رحمت اللہ مظفر پوریؒ کے والد سید احمد شہیدؒ و مولانا سید اسماعیل شہیدؒ کے خلیفہ تھے اور دربھنگہ میں ان کے بہت مریدین تھے۔

مولانا حافظ شاہ حبیب اللہ

مولانا حافظ عبد المجید مظفر پوری

مولانا محبوب حسن رحمانی

مولانا عبد الرشید صاحب رانی ساگر (ضلع آرہ)

مولانا محمد اسحاق صاحب

مولانا سید محمد لطف اللہ صاحب (صاحبزادہ وسجادہ نشین اول)

شیخ ابوبکر حماد (مکی) اور

مولانا ابراہیم صاحب ممباسہ

مولانا ابراہیم صاحب کا ذکر کتاب میں گزر چکا ہے، افریقہ میں سیکڑوں غیر مسلموں نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔

افسوس ہے کہ دو کے علاوہ اب کوئی ہمارے درمیان موجود نہیں۔ مولانا محبوب حسن رحمانی بہت ضعیف ہو چکے ہیں اور اکثر استغراقی کیفیت رہتی ہے۔ مولانا عبد الرشید باوجود کبر سنی کے تبلیغ وارشاد میں مشغول ہیں۔

یہاں مولانا کے چند مریدین کا ذکر کرنا بھی مناسب ہے، مصنف ''کمالات محمدیہ'' نے ان علماء کی ایک مختصر فہرست دی ہے جو بیعت واستفادہ کا تعلق رکھتے تھے۔

ان میں مولانا نور الحق چشتیؒ، مولانا ظہیر حسن شوق نیمویؒ، مولانا مفتی عبد اللطیفؒ، مولانا حکیم عبد الباریؒ، مولانا عبد الوہاب صاحبؒ (مہتمم مدرسۂ امدادیہ دربھنگہ) مولانا محمد علی حسنؒ (مصنف ''کمالات محمدیہ'') مولانا سید شاہ سمیع احمد قابل ذکر ہیں، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کو مولانا کی عمر کے آخری ایک سال خدمت واستفادہ کا موقع ملا۔

اور مخلصین میں حاجی لیاقت حسین صاحب مولانا کے مزاج داں اور بے تکلف خادم تھے، منشی شرافت حسین صاحب، میر علی حسن صاحب وغیرہ سے مولانا کو خاص تعلق تھا۔

مولانا محمد علی حسن صاحب نے مولانا کی سیرت پر ۷۰۳ صفحات کی ایک کتاب ''کمالات محمدیہ'' لکھی ہے، جو مولانا کی زندگی کا سب سے بڑا ماخذ ہے۔ زیر نظر کتاب

میں اس سے بہت فائدہ اٹھایا گیا ہے اور بہت سی قیمتی معلومات اور اہم حالات اس سے معلوم ہوئے ہیں۔ مولانا محمد علی حسن صاحبؒ ٹھریہ ضلع مونگیر کے رہنے والے تھے، اور ''مدرسۂ امدادیہ'' دربھنگہ میں فارسی کے استاذ تھے۔ ان کو مولانا کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع اپنے معاصروں کی بہ نسبت زیادہ ملا اور بعض اہم سفروں میں مولانا کی ہمرکابی کا شرف بھی حاصل ہوا۔ مولاناؒ سے بے حد تعلق تھا، اور بہت شفقت سے پیش آتے تھے۔

درسی وغیر درسی مطبوعات مجلس صحافت ونشریات، ندوۃ العلماء لکھنؤ

قصص النبیین اول	شرح شذور الذهب
قصص النبیین دوم	الفقه المیسر
قصص النبیین سوم	العقیدة السنیه
قصص النبیین چہارم	قطر الندیٰ
قصص النبیین پنجم	مباحث فی علوم القرآن
القراءة الراشده اول	علم التصریف
القراءة الراشده دوم	تمرین النحو
القراءة الراشده سوم	تمرین الصرف
معلم الانشاء اول	دیوان الحماسه اول
معلم الانشاء دوم	دیوان الحماسه دوم
معلم الانشاء سوم	روداد چمن
مختارات اول	فتاویٰ ندوة العلماء اول
مختارات دوم	فتاویٰ ندوة العلماء دوم
منثورات	فتاویٰ ندوة العلماء سوم
الادب العربی	علم اصول الفقه

العقیدۃ السنیہ	تذکرہ مولانا فضلِ رحمٰن گنج مرادآبادی
رسالۃ التوحید	تاریخ الادب العربی (الاسلامی)
زعیمان لحرکۃ الاصلاح	تاریخ الادب العربی (الجاہلی)
مختار الشعر العربی اول	مقدمہ شیخ عبدالحق دہلویؒ
مختار الشعر العربی دوم	تفہیم المنطق
سوانح صدر یار جنگؒ	شرح العقیدۃ الطحاویہ
سوانح مولانا محمد یوسفؒ	مبادی علم اصول الفقہ
تہذیب الاخلاق	مختار من صفوۃ الصفوۃ
شذی العرف	

ملنے کے پتے

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوۃ العلماء، لکھنؤ رابطہ نمبر:9889378176

مکتبۂ اسلام، رؤف مارکیٹ، گوئن روڈ، لکھنؤ رابطہ نمبر:9415912042

الفرقان بکڈپو، 114/31 نظیرآباد، لکھنؤ رابطہ نمبر:9935309973

مکتبہ علمیہ، شباب مارکیٹ، ندوہ روڈ، لکھنؤ رابطہ نمبر:9198621671

مکتبہ طوبیٰ، ندوی منزل، ندوہ روڈ، لکھنؤ رابطہ نمبر:9005505629

ایک ضروری اعلان! بعض ناشرین کتب نے مجلس صحافت ونشریات کی کتابیں غیر قانونی طور پر طبع کرالی ہیں۔ اس لئے قارئین سے گذارش ہے کہ مجلس صحافت کی جملہ درسی وغیر درسی کتابیں مندرجہ بالا مکتبوں ہی سے خریدیں، اور بذریعۂ ڈاک بھی طلب کریں۔ مادر علمی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ساتھ آپ کا یہ نہایت مخلصانہ تعاون ہوگا۔

ناشر: مجلس صحافت ونشریات

ٹیگور مارگ، ندوۃ العلماء، لکھنؤ